فروغِ مرثیہ

سہ ماہی

کینیڈا

(انیسواں شمارہ)

پانچواں سال

مرزا دبیر کی ڈیڑھ سو سالہ برسی کے موقع پر

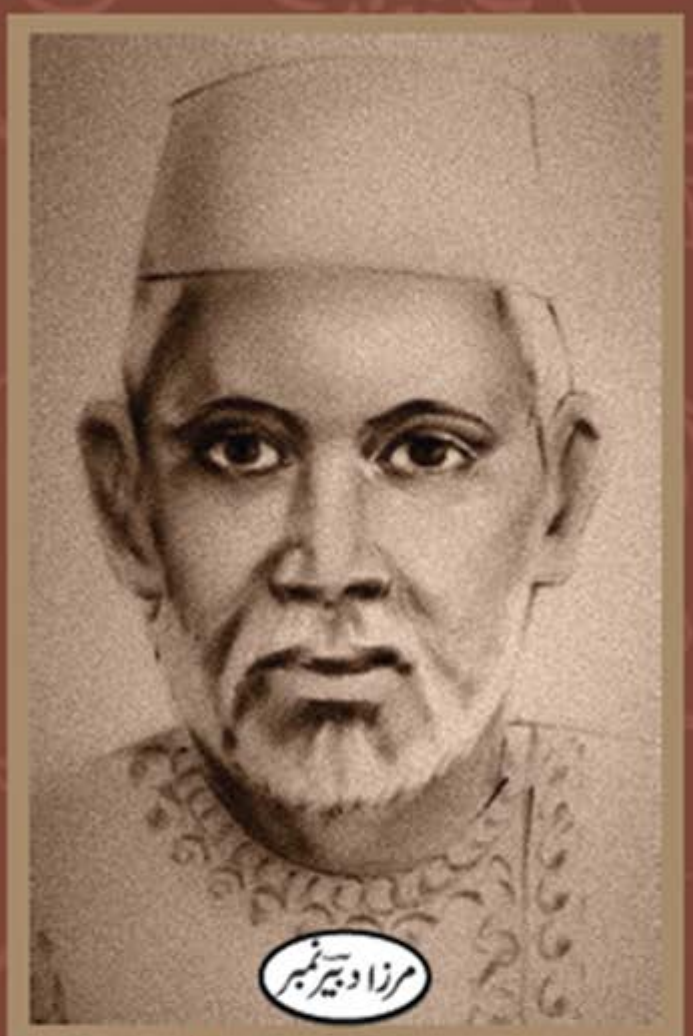

مارچ ۲۰۲۵ء بمطابق رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

فروغِ مرثیہ (سہ ماہی کینیڈا)

مرزا دبیر نمبر

(انیسواں شمارہ)

اِس شمارے میں شامل مضامین، تنقیدی رائے یا شعری وفکری خیال سے اِدارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ادارے کی سینتیسویں پیش کش

دبیر نمبر

سہ ماہی

کینیڈا

فروغِ مرثیہ

مارچ ۲۰۲۵ء بمطابق رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

جملہ حقوق بحقِ فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل محفوظ ہیں

عنوان	:	فروغِ مرثیہ (انیسواں شمارہ)، دبیرؔ نمبر
اشاعت	:	مارچ ۲۰۲۵ء
تعدادِ اشاعت	:	۵۰۰
ایڈیٹر	:	اصغر مہدی اشعر
ناشر	:	فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل، کینیڈا
طابع	:	RB پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی
قیمت فی شمارہ	:	۲۵/ڈالر، ۱۵/پونڈ (علاوہ ڈاک خرچ)
ای میل	:	faroghemarsiya@gmail.com
فون	:	+923288954685
پتہ	:	باب الحوائج بک ڈپو، جعفر طیار، کراچی

ملنے کا پتہ

محفوظ بک ایجنسی، مارٹن روڈ، کراچی
علمدار بک ڈپو، انچولی، کراچی
مذہبی دنیا-الہ آباد، انڈیا

احمد بک ڈپو، انچولی، کراچی
افتخار بک ڈپو، لاہور

باب الحوائج بک ڈپو، جعفر طیار، کراچی
RB پبلشرز، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی

فروغِ مرثیہ

سہ ماہی

کینیڈا

ترتیب

۱۔اداریہ ---------- اصغر مہدی اشعرؔ (کینیڈا) ---------- ۵

۲۔کراچی سے ایک خط ---------- ڈاکٹر ہلالؔ نقوی (پاکستان) ---------- ۷

۳۔نذرِ دبیرؔ ---------- ۹

اختر آصفؔ زیدی (کینیڈا)،تصویرؔ فاطمہ (پاکستان)،شہابؔ صفدر (پاکستان)،علی عرفانؔ (کینیڈا)

۴۔مرزا دبیرؔ کا غیر مطبوعہ نوحہ ---------- مکرم ارشاد (انڈیا) ---------- ۱۳

۵۔سلام بر زمینِ دبیرؔ ---------- ۱۴

ڈاکٹر عقیل عباس جعفری (پاکستان)،ڈاکٹر مظہر عباس رضوی (پاکستان)،ڈاکٹر وفاؔ نقوی (انڈیا)،علی عرفانؔ (کینیڈا)،احمر شہوارؔ (امریکہ)
میر یوسف میرؔ (کینیڈا)،شباہت عباس شبیہؔ (پاکستان) شگفتہ دلشاد (پاکستان)،حسن امام حسنؔ (انڈیا)،محکم عابدی (انڈیا)

۶۔مرزا سلامت علی دبیرؔ۔ادبی اور تاریخی مغالطے ---------- سیّد جاوید حسن (پاکستان) ---------- ۲۰

۷۔دشتِ دبیرؔ کی جادہ پیمائی ---------- پروفیسر زمان آزردہ (انڈیا) ---------- ۲۸

۸۔آسمان بے ماہِ تاباں ---------- ڈاکٹر اسد اریب (پاکستان) ---------- ۳۵

۹۔دبیرؔ کی میٹا فزیکل شاعری ---------- عادل مختار (پاکستان) ---------- ۴۱

۱۰۔کاظم علی خاں کی تلاشِ دبیرؔ ---------- پروفیسر عباس رضا نیرؔ (انڈیا) ---------- ۵۱

۱۱۔دبیرؔ کے مرثیوں میں میدانِ جنگ کی منظر نگاری ---------- پروفیسر شبیب نجمی (انڈیا) ---------- ۵۸

۱۲۔دبیرؔ کا منفرد اندازِ نوحہ نگاری ---------- ڈاکٹر ریحان حسن (انڈیا) ---------- ۶۶

۱۳۔دبیرؔ کے مرثیے ایک مہم جو سر ہونے کو ہے ---------- عادلؔ مختار (پاکستان) ---------- ۷۲

۱۴۔مرزا دبیرؔ کی غزلیہ شاعری کا تجزیاتی مطالعہ ---------- ڈاکٹر وفاؔ نقوی (انڈیا) ---------- ۷۵

۱۵۔پنجاب میں دبیرؔ سے عقیدت کی تاریخ اور مستقبل ---------- عادلؔ مختار (پاکستان) ---------- ۸۰

۱۶۔مراثی دبیرؔ میں ارسطوی عناصر ---------- فرحت نادر رضوی (انڈیا) ---------- ۸۹

۱۷۔دبیریؔ استفہام ---------- علی عرفانؔ (کینیڈا) ---------- ۱۰۵

۱۸۔رثائی ادب کا دبیرؔ نمبر ---------- شہابؔ صفدر (پاکستان) ---------- ۱۱۱

۱۹۔مرزا دبیرؔ اور عزائی شاعری ---------- ڈاکٹر مظہر عباس رضوی (پاکستان) ---------- ۱۱۶
۲۰۔مرزا دبیرؔ بحیثیت مثنوی نگار ---------- ڈاکٹر منتظر مہدی (انڈیا) ---------- ۱۲۲
۲۱۔صنف نوحہ نگاری اور مرزا دبیرؔ کے نوحے ---------- ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی ہلوری (انڈیا) ---------- ۱۳۴
۲۲۔دبیرؔ، مغز متفکّر ---------- عادل مختار (پاکستان) ---------- ۱۴۰
۲۳۔حضرت عباسؑ ابن علیؑ۔مرزا دبیرؔ کے کلام کی روشنی میں ---------- ذیشان زیدی (برطانیہ) ---------- ۱۴۲
۲۴۔مرزا دبیرؔ، شاعرِ خوش نوا ---------- کاظم عابدی (انڈیا) ---------- ۱۶۷
۲۵۔دبیرؔ کی جمالیاتی جدلیات ---------- محمد علی ظاہرؔ (پاکستان) ---------- ۱۷۰
۲۶۔اُردو مرثیے پر مرزا دبیرؔ کے احسانات ---------- پروفیسر سیّد علی عرفان نقوی (انڈیا) ---------- ۱۷۵
۲۷۔مطالعہ دبیرؔ اور علّامہ ضمیر اختر نقوی ---------- تنویر اختر نقوی (برطانیہ) ---------- ۱۷۹
۲۸۔مرزا دبیرؔ کے دو خاص مرثیے ---------- علی عرفان (کینیڈا) ---------- ۱۸۲
۲۹۔کلام دبیرؔ میں نعتیہ عناصر ---------- گوہر لکھنوی (انڈیا) ---------- ۱۸۴
۳۰۔مراثیِ دبیرؔ میں لب و لہجے کی وسعت ---------- شاہ زمان شمسی (پاکستان) ---------- ۱۸۹
۳۱۔مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے کی ادبی حیثیت ---------- صفدر ہمدانی (برطانیہ) ---------- ۱۹۹
۳۲۔سرخیلِ سخنورانِ مرزا سلامت علی دبیرؔ ---------- فدا محمد ناشاد (پاکستان) ---------- ۲۰۶
۳۳۔اُردو مرثیہ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری ---------- گوہر لکھنوی (انڈیا) ---------- ۲۱۶
۳۴۔مرزا سلامت علی دبیرؔ کی شخصیت اور ان کے مراثی ---------- محمد قمر خاں (انڈیا) ---------- ۲۱۹
۳۵۔بحرِ رثا کا انمول گوہر ---------- نصیر اعظمی (انڈیا) ---------- ۲۲۱
۳۶۔مرزا دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات ---------- سیّد شاہ زمان شمسی (پاکستان) ---------- ۲۲۵
۳۷۔تیرا جواب ہے نہ عرب میں نہ ہند میں ---------- سیّد حسن عباس (انڈیا) ---------- ۲۳۴
۳۸۔مجتہد نظم مرزا دبیرؔ اور علم الاعداد ---------- زین رضا (پاکستان) ---------- ۲۳۷
۳۹۔مرثیہ مرزا دبیرؔ اور امام محمد تقیؑ کے بچپن کا واقعہ ---------- زائر حسین ثالثی (انڈیا) ---------- ۲۳۹
۴۰۔مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں اجزائے ترکیبی ---------- الماس آفرین (انڈیا) ---------- ۲۴۴
۴۱۔مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں جنات کا تذکرہ ---------- ذیشان زیدی (برطانیہ) ---------- ۲۴۹
۴۲۔قوتِ احساس اور متخیلہ کا شاعر۔مرزا دبیرؔ ---------- محمد ارشد رضوی (انڈیا) ---------- ۲۵۹
۴۳۔دبیرؔ کے مرثیوں کے بعض نمایاں پہلو ---------- پروین زاہد (انڈیا) ---------- ۲۶۵
۴۴۔ایڈیٹر کے نام خط ---------- (پروفیسر شبیب نجمی (انڈیا)، علی عرفان (کینیڈا) ---------- ۲۷۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اداریہ

مرزا سلامت علی دبیرؔ کے انتقال کو ڈیڑھ صدی گذر چکی ہے مگر ان کی شاعری کی تاثیر، ان کا فن آج بھی زندہ ہے۔ آج جب ''فروغِ مرثیہ'' کا ''دبیرؔ نمبر''۔ پیش کیا جارہا ہے تو یہ نہ صرف ایک خراجِ عقیدت ہے بلکہ ایک تاریخی انصاف کی کوشش بھی!!

مرزا سلامت علی دبیرؔ جنھوں نے اُردو مرثیے کو وہ جلا بخشی جو اسے ایک مستقل اور بلند پایہ صنف بنانے کے لیے ضروری تھا۔ ان کی شاعری نے اُردو مرثیے کو ایک ایسی بلندی پر پہنچایا جس سے آج بھی فصاحت و بلاغت کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ وہ دبیرؔ جس کی شاعری میں سادگی اور پیچیدگی کا ایسا حسین امتزاج ہے جو کم ہی شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ دبیرؔ کا طرزِ بیان، ان کی منظر کشی، زبان پر عبور، فکری استدلال، مکالمہ آرائی، لسانی چابکدستی، وسعتِ فکر اور شدّتِ احساس دبیرؔ کو اس کے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہیں کہ اپنے دَور میں لکھنؤ میں مرثیے کا عروج دبیرؔ کے نصیب میں آیا اور ان کی کامیابی کے بعد انیسؔ کی فیض آباد سے لکھنؤ منتقلی ہوئی اور مرثیے کی دنیا دو آفتابوں سے جگمگا اُٹھی۔

دبیرؔ کی شاعری ایک ایسا کلاسیکی شاہ کار ہے جس میں بیانیے کی بدولت پڑھنے والا اپنے آپ کو تاریخ کے دھارے میں بہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ دبیرؔ کی کردار نگاری کی بدولت ہر کردار صفحۂ قرطاس سے اُبھر کر زندہ دکھائی دیتا ہے اور زبان ایسی کہ ہر مصرعہ فن پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا دبیرؔ محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک مکمل ادبی تحریک کا نام ہے۔ ان کا کلام کسی ایک دور کا نہیں بلکہ ہر دور کا کلام ہے، ہر نسل کے لیے پیغام ہے کہ مرثیہ دبیرؔ کی بدولت ہر دَور میں ادبِ عالیہ کی صرف نمائندگی نہیں بلکہ سرخیل کے درجے پر براجمان رہے گا۔ دبیرؔ کی شاعری اپنے اندر تاریخ کی صداقت، انسانی جذبات کی گہرائی، زبان کی معراج، صنائع و بدائع کی انتہا لیے ہوئے ہے، زبان کا وہ کمال جو ہر عہد میں تقلید کے قابل ہے، وہ اثر انگیزی جو پڑھنے والے کو اپنے دام میں جکڑ لے، وہ فلسفیانہ مزاج جو شاعری سے کہیں بڑھ کر معلوم ہوتا ہے، دبیرؔ کی شاعری صرف شاعری نہیں بلکہ ایسی داستان گوئی ہے، ایسی منظر نگاری ہے جو زمانے کی قید و بند سے آزاد کر کے اپنے سامع، اپنے قاری کو زمانے اور تاریخ کے اس پار لے جاتی ہے جس زمانے کا دبیرؔ ذکر کر رہے ہوتے ہیں، یہ شاعری اپنے اندر معنیٰ کی پرتیں رکھتی ہے اور دبیریتؔ سے آشنائی ان پرتوں کو کھولنے کا باعث ہے، یہ شاعری نہیں زبان کی جادوگری ہے، تخیل کی معراج ہے جو مرثیے کو ایک زندہ صنف اور ایک ہمہ گیر ورثے کا درجہ دیتی ہے۔

اگر شاعری محض جذبات نگاری ہے تو دبیرؔ اس کو معراج دلا چکے ہیں، اگر شاعری تاریخ سے آشنا ہونے کا وسیلہ ہے تو دبیرؔ ہمیں اپنے مرثیوں کی صورت ایک مکمل رزمیہ دے چکے ہیں اور اگر شاعری فلسفہ ہے تو کربلا کی روحانیت، اخلاقیت، سماجیت اور حقانیت دبیرؔ کے اشعار کے ذریعے حسینیتؑ کا وہ پیغام عام کر رہی ہے کہ ۱۵۰ سال بعدِ وفات محققین دبیریتؔ کو اپنا عنوان بنانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ دبیرؔ نے اپنے مرثیوں کے ذریعے نہ صرف تاریخ کو زندہ رکھا ہے بلکہ اپنے قاری اپنے سامع کو خود تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔ یہ دبیرؔ کا خاصہ نہیں بلکہ اس کے مرثیوں کا وقار ہے جس نے حقیقت اور خیال کے فرق کو مٹا کر ۱۴۰۰ سال قبل کے واقعات کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے۔

یہ سوال آج بھی زندہ ہے کہ مرثیے کو کیوں اس کا اصل مقام نہیں مل سکا۔ میں اس سوال کو ایک اور پیرائے میں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا، کیا مرثیے کے شاعروں میں تفریق کرنے سے مرثیے کو اس کا اصل مقام مل سکتا ہے؟ کیا دبیرؔ کے بغیر مرثیے کو اس کا اصل مقام حاصل ہو سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک انیسؔ و دبیرؔ کی مثال ایک آسمانِ مرثیہ پر دو ماہتاب کی موجودگی ہے، دونوں کا ماخذ ایک یعنی واقعۂ کربلا اور ذکرِ چہاردہ معصومینؑ، دونوں کی مداحی کی بنیاد یہ نور دنیا میں پھیلانا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ صرف ایک آفتاب کو منتخب کریں اور کہیں کہ جناب ہمیں ایک کی روشنی عزیز ہے، جبکہ دونوں آفتاب میں نور مختلف، رُخ مختلف، زاویہ مختلف اور اس کی روشنی کی آپ کی فکر و عقل پر تاثیر مختلف۔ انیسؔ و دبیرؔ پر تنقید بہت آسان ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے ان شعراء کے کلام کو مکمل پڑھ رکھا ہے؟ کیا ہم ان کے کلام کے حقیقی معنوں کو جان چکے ہیں؟

کیا مصرعے اپنے معنیٰ آپ پر کھول چکے ہیں؟ اگر نہیں تو ان کی عظمت کا اقرار کیجیے اور کلامِ انیسؔ و دبیرؔ پر علمیت کا سفر جاری رکھیے۔ فرہنگِ انیسؔ و دبیرؔ کی ترتیب و تدوین کے بعد یہ کہنا ضروری ہے کہ انیسؔ کے ۲۳۷ اور دبیرؔ کے ۴۵۶ مرثیے حرف بہ حرف پڑھنے کے بعد ان شعرا کی عظمت بیان کرنے سے قلم و قرطاس عاجز ہیں۔ مگر آج ۱۵۰ سال کے بعد فروغِ مرثیہ کے دبیرؔ نمبر کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ عہدِ دبیرؔ ابھی ختم نہیں ہوا، دبیرؔ آج بھی زندہ ہے، آج نوجوانوں میں دبیرؔ مرثیوں کی فراہمی کی بدولت مقبول ہو رہا ہے۔ دبیرؔ کا کلام ایک زندہ میراث ہے جو آنے والے وقتوں میں مواد کی فراہمی کی بدولت تابندہ ہوگی، درخشندہ ہوگی، یہ وہ چراغ ہے جسے کوئی بے جا تنقید کی ہوا بجھا نہ سکے گی، ڈیڑھ سو سال سے اس ناانصافی اور ناقدری کے تھپیڑے اپنی تمام قوت صرف کر چکے ہیں مگر یہ وہ چراغ ہے جو ابد تک اپنی بساط پر ہر زمانے کو اپنے نور سے منور کرتا رہے گا۔ اگر آپ مرثیے کو ادب میں اس کا صحیح مقام دلانا چاہتے ہیں تو دبیرؔ کو اس کا جائز مقام دیجیے، اس کے کلام کی دستیابی اور اس پر تحقیق میں اپنا کردار ادا کیجیے، یاد رکھیے! مرثیہ بغیرِ دبیرؔ وہ مقام نہیں پا سکے گا جو دبیرؔ کی بدولت اسے حاصل ہے۔

یہ فروغِ مرثیہ کا انیسواں شمارہ نہیں، یہ ۱۵۰ سال سے ہونے والی ناانصافی، تفریق، ناقدری اور عدم توجہی پر کی جانے والی فریاد کا جواب ہے۔ یہ دبیرؔ کے لیے مدح و عقیدت نہیں، انصاف کی پکار ہے، یہ ایک خاص مذہب کی شاعری نہیں، یہ ایک مخصوص مکتبِ فکر کا شاعر نہیں، یہ مرثیہ ہے جو ایک مکمل فکری اور ادبی تحریک ہے اور اس صنفِ سخن کو ادبِ عالیہ کی سرداری کو اختیار کرنے میں دبیرؔ کا وہی کردار ہے جو ایک عمارت کے مرکزی ستون کا ہوتا ہے۔ جب تک آپ دبیرؔ کے کردار، اس کی عظمت کو تسلیم نہیں کریں گے، مرثیے کی عظمت آپ کی سمجھ میں آنا عبث ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ آپ دبیرؔ کے مرثیوں پر تحقیق کیجیے، ''ادبی'' تنقید کیجیے، ان کے کلام کے ادبی اور فلسفیانہ پہلوؤں کو اُجاگر کیجیے، میں فراقؔ گورکھپوری سے متفق نہیں کہ دبیرؔ کے مرثیے بحرِ ذخّار کی طرح ہیں اور ان کی پیرا کی عام آدمی کے لیے ممکن نہیں۔ اس کی زندہ مثال خاکسار آپ کے سامنے ہے جو دبیرؔ کے ۴۵۶ مطبوعہ مرثیے حرف بہ حرف پڑھ چکا ہے اور کوئی ادبی پسِ منظر اور وصفِ اضافی کے پرچار کے بغیر، صرف اپنی صلاحیتوں اور جید اساتذہ کی رہبری کے باعث! آخر کب تک ہم ممکن کو ناممکن لکھتے رہیں گے اور علمیت میں اضافے کے بجائے لفظیات میں اضافے کو علمیت کا باعث سمجھیں گے۔ وقت آ گیا ہے کہ مرثیے کو ایک محدود دائرے میں قید ہونے سے روکا جا سکے مگر اس کی ایک ہی صورت ہے جب انیسیتؔ کے ساتھ ساتھ دبیریتؔ کو بھی وہی مقام و رتبہ حاصل ہو جو ان دونوں شعراء کا حق ہے۔

خاکسار نے ''دبیرؔ کے مرثیے'' کی ترتیب و تدوین اور ''فرہنگِ دبیرؔ'' کی تکمیل میں دبیرؔ کے ۴۵۶ مطبوعہ مرثیوں میں شامل تقریباً ۳۲۰۰۰ بند اور تقریباً ۱۹۰۰۰۰ مصرعے حرف بہ حرف پڑھے ہیں، دبیرؔ کے ماہرین بھی شاید ایک ایک مصرعہ نہیں پڑھ سکے ہوں جبکہ یہاں ایک ایک مصرع کو بار بار پڑھا گیا ہے، دبیرؔ کے فن کا کیا بیاں ہو، زبان گنگ، دماغ ماؤف اور قلم اس مظلوم شاعر کی عظمت بیان کرنے سے قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ثابتؔ لکھنوی صاحب، زمان آزردہ صاحب، نجم الحسن فوق صاحب نے سب دیکھا ہو، میں نے تو اس عہدِ جدید میں نئے زاویۂ نگاہ سے ان تمام باتوں کو مدِّ نظر رکھا ہے اور یہ نتیجہ نکالا کہ اُردو زبان، محققین اور عوام الناس پر دبیرؔ کا قرض ہے، آپ اور میں دبیرؔ کے مقروض ہیں کہ دبیرؔ پر جو کام ہونا چاہیے تھا وہ آج تک ہو نہ سکا، اب فرہنگِ دبیرؔ اور ''دبیرؔ کے مرثیے'' کی اشاعت کے بعد اُمید ہے کہ نئی نسل اس قرض کو اُتارنے میں اپنا کردار ادا کرے گی۔

یاد رکھیے، مرثیے کے فروغ کی راہ، کوچۂ دبیرؔ سے ہو کر گذرتی ہے، آپ لاکھ تساہلی دکھلائیں مگر مرثیہ صرف جب اپنی اصل منزل اور اپنے صحیح مقام پر پہنچے گا جب آپ بغیر منظّم ناانصافی کے دبیرؔ کو اس کا اصلی مقام دینے اور دلانے پر تیار ہوں گے۔

دعاؤں کا طالب

اصغر مہدی اشعر (ملٹن، کینیڈا)،

۴/مارچ ۲۰۲۵ء

کراچی سے ایک خط

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی

محترم اصغر مہدی اشعر صاحب!

ایڈیٹر۔فروغِ مرثیہ۔کینیڈا

یہ ۲۹ رسال پہلے کی بات ہے جب جنوری ۱۹۹۶ء میں کراچی سے میں نے ''رثائی ادب'' کے نام سے سہ ماہی ادبی جریدے کا آغاز کیا تھا۔آپ جانتے ہیں کہ پھر ہم نے بہت یادگار شمارے نکالے،جس میں بارہ بارہ سو صفحات پر مشتمل انیسؔ و دبیرؔ نمبر یادگار حیثیت رکھتے ہیں، یہ تذکرہ میں نے اِس دلیل اور گواہی کے طور پر چھیڑا ہے کہ آپ کی مشکلات، تگ و دو اور جاں فشانیوں کو جتنا میں سمجھتا ہوں آپ کے قارئین میں شاید ہی کوئی سمجھ سکے۔ پڑھنے والوں کے ہاتھ میں تو یہ رسالہ پہنچ جاتا ہے انھیں اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کتنے مراحل و مسائل سے گزر کر ایک ادبی اہتمام کے ساتھ اُن کی نظروں کے سامنے آ گیا۔اور پھر خصوصاً وہ مرحلہ جب آپ کسی شخصیت سے منسوب کر کے کوئی نمبر شائع کرتے ہیں۔

آپ کے لیے میں جس قدر داد و تحسین کے گلہائے تازہ نچھاور کروں بہت کم ہے۔اخراجات کا بار بھی کچھ کم بارِ گراں نہیں ہوتا۔اگر آپ صنفِ مرثیہ کے اعتبار و اقتدار کی خاطر اپنی جیب پر یہ بوجھ برداشت کر بھی لیں تو خود جریدے کی تیاری، مضامین کی دستیابی، نقّاد اور اہلِ تحقیق کا میسّر آ جانا ہر وقت آپ کے ذہن پر سوار رہتا ہوگا۔ میں اسی لیے مسلسل آپ کی محنتوں کا نہ صرف ذکر کرنا چاہتا ہوں بلکہ آپ کو گلے بھی لگانا چاہتا ہوں۔

انیسؔ نمبر بھی یقیناً مثالی تھا اور اس میں ایک مضمون بھی ایسا نہیں تھا جو مطبوعہ ہو۔اب یہی طرز آپ نے دبیرؔ نمبر کے لیے بھی اختیار کیا ہے۔ کام بہت مشکل تھا مگر اس دریا کو تلاطم کے باوجود آپ نے عبور کر ہی لیا۔شبلی کا موازنہ انیسؔ و دبیرؔ اپنی جگہ ہے لیکن آپ ماضی کی اُن روایتوں سے ہٹ کر دبیرؔ کو بھی ان کا حق دلانا چاہتے ہیں۔اس وسیع النظری میں آپ نے کمال کر دیا ہے۔

آپ سے جو فون پر بات ہوئی تھی اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ نے دبیرؔ نمبر کو بہت منفرد اور ممتاز بنانے کی ٹھان لی ہے۔ آپ کو اس لیے بھی کریڈٹ جاتا ہے کہ لکھنے والے رہے نہیں۔مرثیے کے بڑے ناقدین اس دنیا سے رخصت کر چکے ہیں، ہم جیسے کم علم اور کم فہم آخر کیا تیر مار لیں گے۔آپ کا حوصلہ لکھنے والوں کو ڈھارس دیتا ہے۔

یہاں پر بھی میں ضرور اپنے پڑھنے والوں سے کہوں گا کہ دبیرؔ نمبر تو بعد کی بات ہے، آپ کا کام فرہنگِ دبیرؔ منبرِ سخن کے بلند زینے پر اپنا قدم رکھتے ہوئے پھر دبیرؔ کے مرثیوں از سرِ نو اشاعت دبیرؔ شناسی کے ذیل میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے والے کام کہلائیں گے۔

فراقؔ گورکھپوری نے کہا تھا کہ ''دبیرؔ کے رثائی سرمائے دفترِ ماتم کی ۲۰ جلدوں کے بحرِ ذخّار سے نکل آنا آسان کام نہیں ہے''۔

میں چاہتا تو یہی تھا کہ دبیرؔ پر الگ سے مضمون لکھ دوں مگر صحت کی خستہ حالی آڑے آ گئی اور میں کچھ لکھنے سے قاصر ہی رہا۔ دبیرؔ بہت عظیم شاعر ہیں ان کی عظمت جن فنّی اور لسانی عوامل میں پوشیدہ ہے ان میں کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ آپ جوانی کی حدود سے ابھی نکلے نہیں ہیں، آپ میں توانائی ہے، کام کرنے کا حوصلہ بھی بہت ہے، ابھی تو سفر بہت باقی ہے۔ اس دبیرؔ نمبر کی مبارک باد قبول کیجیے اور آئندہ کے شماروں کی تابناکی آپ کی دیدہ وری کے آگے کشکول لیے کھڑی ہے۔ مجھ سے جو بھی ہو سکے گا، آپ کا ساتھ دینے کی بھرپور کوشش کرتا رہوں گا۔

والسلام

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی

کراچی

۲/مارچ ۲۰۲۵ء

بمطابق

یکم رمضان ۱۴۴۶ھ

نذرِ دبیرؔ

اختر آصفؔ زیدی

اے تاجدارِ مفاہیم ، اے دبیرؔ سخن
کہ تُو امیرِ سخن ، ہم تیرے اسیرِ سخن

مقامِ اصبغؔ و حسّانؔ پر رکھا تجھ کو
بس اک زبان کا ہے درمیاں حریرِ سخن

بلادِ ہند کے افلاک کا عُطارِد تُو
تُو ہی چراغِ سخن ہے ، تُو ہی مُنیرِ سخن

ترے کلام سے پایا ہے رزقِ فکر و نظر
ترے قلم سے مِلا ہے ہمیں شعیرِ سخن

ترے قریب کوئی نام آ نہیں سکتا
ہے اپنے دَور سے تُو آج تک کبیرِ سخن

نظر میں کوئی نہیں ، جو عبور کر پائے
کھِنچی ہے ایسی ترے کِلک سے لکیرِ سخن

وہ تیرے نقشِ کفِ پا کو دیکھتا جائے
دیارِ عِلم سے گزرے جو راہگیرِ سخن

تری حکومتِ دائم سے اب بھی آتے ہیں
پیامِ فکر و مضامین کے سفیرِ سخن

تمام خطۂ ارضی ، جہاں تک اردو ہے
مہک رہا ہے وہاں تک ترا عبیرِ سخن

ترے کلام سے حاصل کیا ہُوا مصرع
اُتر رہا ہے حسابات میں خطیرِ سخن

ترے کلام میں ایسی کشش ، کہ کھنچتا ہے
ترے خیال کے چقماق سے ضمیرِ سخن

سخن کے سارے خبردار ، اِس سے واقف ہیں
کہ تُو خبر ہے سخن کی ، تُو ہی خبیرِ سخن

حصول و شوق و تجسّس میں آ گیا آصفؔ
کہ تیرے در پہ طلب گار ہے فقیرِ سخن

❁❁❁❁

تصویرؔ فاطمہ

تصویرؔ آج ایسے سخنور کو دیکھیے
افکار میں ڈھلے ہوئے جوہر کو دیکھیے

جو اپنے طرزِ خاص میں جدّت طراز تھے
اُس شاعرِ عظیم کے تیور کو دیکھیے

فکرِ دبیرؔ ہے بہ خدا پُر ضیا چراغ
دیکھا کسی نے ایسا کہاں حق رسا چراغ

ضُو دے رہا ہے آج بھی اپنی وفا کے ساتھ
فکرِ حسینیتؑ کا وہ آیت نما چراغ

اُسلوبِ فن کا ماہرِ فکرِ رسا چراغ
رنگِ دبیریتؔ سے مچلتا ہوا چراغ

عمرِ تمام لکھتی رہی اُن کے مرثیے
دیکھے کسی نے ایسے کہاں با وفا چراغ

اُس عہدِ مرثیے پہ جب آنے لگا شباب
مضمون آفرینی کے کھلنے لگے گلاب

الفاظ ایسے لائے ہیں چن کے وہ عرش سے   ہے مطلعِ دبیرؔ خود اک عکسِ آفتاب
الفاظ مثلِ تاروں کے ایک انجمن کے ساتھ   اوراق پر کھلے ہیں یہ سرو و سمن کے ساتھ
غم کے فسانے ، چھیڑ گئے طرزِ بیاں لیے   تصویرِ درد کھنچ گئی روحِ سخن کے ساتھ
اب جابجا ہیں اُس کی فصاحت کے تذکرے   اور اِن فصاحتوں میں بلاغت کے تذکرے
اُس کو سخنوروں میں امامؑ سخن کہیں   زندہ رہیں گے اُس کی ہی عظمت کے تذکرے
اک تازگی سی مل گئی غم کی زبان کو   اک دلکشی میں ڈھال لیا ، داستان کو
نیزے سے کر لیا ہے بلند اس کی فکر نے   راہوں میں کربلا کی درود و اذان کو
دیکھا نگاہِ وقت نے اُن کا یہ اہتمام   عرفان و آگہی کا خزینہ ہے سب کلام
وہ منبرِ سخن پہ نمایاں ہے اس طرح   صدیوں کے بعد آج بھی زندہ ہے اُس کا نام
جلدیں وہ بیس دفترِ ماتم کی دیکھیے   طاقت تمام جلدوں میں اِس غم کی دیکھیے
مصرعوں میں ڈھال دی ہے وہ عظمت دبیرؔ نے   بوئے وفا سخن میں محرم کی دیکھیے
وردِ زباں جو آپ کے اشعار ہیں دبیرؔ   علم و ادب کے بولتے کردار ہیں دبیرؔ
سر پر سجا ہوا ہے جو تصویرؔ فن کا تاج   یہ نورِ پنجتن سے ضیا بار ہیں دبیرؔ

شہابؔ صفدر

اے شاعرِ حسینؑ سلامت علی دبیرؔ   بامِ بلندِ شعر کا تو ہے مہِ منیر
ضو سے تری غریقِ ضیا زہرۂ ضمیر   (۱)   فیضِ شعاع سے دلِ آئینہ عکس گیر
سیمیں فضائے گنبدِ شب چاندنی سے ہے
آراستہ یہ بزم تری شاعری سے ہے

ایوانِ مرثیہ میں تری آب و تاب ہے   تابندہ تیری لو سے رباعی کا باب ہے
تو مثنوی کے باغ کا نکھرا گلاب ہے   (۲)   تجھ سے بساطِ حیطۂ فن رنگ یاب ہے
جس لفظ کو بھی مَس ہے تری قوسِ طبع سے
پاتا ہے اپنا حصہ وہ الوانِ سبع سے

پیشِ نظر ترے تجلی صبح و شام ہے   مرکز تخیّلات کا طورِ کلام ہے
ابلاغ اگر صنائع بدائع کا نام ہے   (۳)   فن یہ بلا مبالغہ تجھ پر تمام ہے
نعم البدل ہیں لفظ نگین صبیح کے
جوہر کشادہ نطقِ بلیغ و فصیح کے

خوش فکرِ نظم ! آمدِ مضموں ہے وقت پر مثلِ ہلال مصرعِ موزوں ہے وقت پر
دورِ قلم بہ گردشِ گردوں ہے وقت پر (۴) تیرا سیاہِ شام پہ شب خوں ہے وقت پر
آورد گہ تجھ ایسے رجز خواں کے ہاتھ ہے
عشقِ امامؑ دیں کی مدد تیرے ساتھ ہے

اوجِ رثا پہ ثبت ہے اب تک علَم ترا قائم ہے ملکِ شعر و سخن میں بھرم ترا
بھرتے رہے ہیں غالبؔ و آزادؔ دم ترا (۵) لوہا ہیں مانتے زعَمائے قلم ترا
شیدا تھا لکھنؤ ہنرِ بے مثال کا
تھا معترف انیسؔ بھی تیرے کمال کا

تو مرثیے میں موجدِ طرزِ جدید تھا تیرا طلوع مرثیہ گوئی کی عید تھا
ہر غنچۂ ادب ترے لب کا شہید تھا (۶) شاہِ اوَدھ بھی والہ و مشتاقِ دید تھا
کیوں کر نہ وہ ''سراپا سخن'' بے نظیر ہو
جو ''کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیرؔ'' ہو

مرزا رجب سُرور کو ''مرغوب'' تُو دبیرؔ افسوں طرازِ نظم تھا کیا خوب تو دبیرؔ
شبّیرؑ کے محبّوں کو محبوب تو دبیرؔ (۷) تھا مجلس اور بین سے منسوب تو دبیرؔ
رونق عزا کدے کی کلیمِ یگانہ تھا
مقبولِ بارگاہِ امامؑ زمانہ تھا

چھوتا تھا آسماں کو ترا شاہبازِ فکر تارے قطار باندھ کے لیتے نیازِ فکر
دُر بانٹتا جو تیرا سحابِ فرازِ فکر (۸) دامن پسارتے ہمَہ دان و حجازِ فکر
ملکہ عجب تجھے عرَبی فارسی میں تھا
ہے آج بھی خلا جو گزشتہ صدی میں تھا

دیکھا نہ تیرے بعد کوئی تجھ سا نیک نام تو اپنے طرزِ فن کا ہے آغاز و اختتام
بے نقطہ بھی فراتِ رواں ہے ترا کلام (۹) تاریخ گوئی میں تجھے حاصل ہے مشقِ تام
ہوتی ہو جس سے تازہ تری یاد کون ہے
اب زیب و زینِ مسندِ ارشاد کون ہے

ہم وزن ہیں عروض کی رو سے دبیرؔ ، انیسؔ بے فصل ہیں ریاضی میں اُنّیس اور بیس
نوحہ نگار ، مرثیہ گو ، منقبت نویس (۱۰) گویا عزا کے فرش پہ دونوں ہیں ہم جلیس
ماتم میں کیا جنون جتانے ہرانے کا
اچھا نہیں موازنہ رونے رلانے کا

اُتنے دبیریؔ بھی ہیں جتنے انیسیؔ سب دل بہ کف ہیں خدمتِ ممدوح کے لیے
نکتہ وروں نے سینکڑوں صفحات بھر دیے (۱۱) ثابتؔ نے اور خبیرؔ نے کیا دستخط کیے

شہرہ دبیریاتؔ میں کاظم علی کا ہے
اک نام اس جہت میں تقی عابدی کا ہے

بعدِ ہلالؔ ، اصغرِ مہدی ہیں رو براہ یعنی چلن "رثائی ادب" کا ہے ان کی چاہ
دیکھو "فروغِ مرثیہ" کے دعوے کا نباہ (۱۲) نمبر دبیرؔ ، انیسؔ کے نکلے ہیں واہ واہ

کیا بے بصر ہوں روشن و باہر کے قدر داں
ہوتے ہیں جوہری ہی جواہر کے قدر داں

جب تک جہاں میں دھوم ہے اردو زبان کی توصیف ہو گی شاہؑ کے اس مدح خوان کی
جس کس نے بھی انیسؔ کی خوبی بیان کی (۱۳) بات آئے گی ضرور دبیریؔ اٹھان کی

مقبولِ خلق ذاکرِ مظلوم ایسے ہیں
تو اَم ہوں جیسے لازم و ملزوم ایسے ہیں

آتا ہے دھیان پڑھ کے مراثی دبیرؔ کے قدرت عجیب رکھتے ہیں بندے قدیر کے
دم خم وہ ذوالفقارِ جنابِ امیرؑ کے (۱۴) کشتوں کے پشتے لگ گئے فوجِ شریر کے

اک ہاتھ میں بروج شقاوت کے ڈھ گئے
"یہ آبرو بھی کہ بدن ساتھ بہہ گئے"

کیا خوب ہیں دبیرؔ یہ نوحے یہ مرثیے "تائیدِ غیب کے ہیں نمونے یہ مرثیے"
روتے ہیں اہلِ درد جو سن کے یہ مرثیے (۱۵) غم خوار ہوں گے حشر میں تیرے یہ مرثیے

جب ماتمی ، شہابؔ سے ، مجلس سجائیں گے
پڑھ پڑھ کے مرثیے ترے روئیں رلائیں گے

❁❁❁❁

علی عرفانؔ

اردو کا بخت بعد انیسؔ و دبیرؔ کے احسان مند ٹھہرا انیسؔ و دبیرؔ کا
سُرمہ برائے چشمِ ثنا گُستراں ہے یہ آنکھیں مَلو مزارِ انیسؔ و دبیرؔ سے
احساس اپنا رہتا ہے جس کربلا میں آج وہ صاف کربلائے انیسؔ و دبیرؔ ہے
کس منھ سے خود کو کہہ دے وہ سرورؑ کی خاکِ پا عرفانؔ تو خاکِ پائے انیسؔ و دبیرؔ ہے

مرزا دبیرؔ کا غیر مطبوعہ نوحہ

مکرّم ارشاد

مرزا جعفر علی خاں ''اثرؔ لکھنوی'' کا شمار اپنے دور کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک شاعر بلکہ ایک بلند پایہ نقاد، مترجم اور صاحبِ فرہنگ بھی تھے۔

اثرؔ صاحب کو مخطوطات جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، جس کی بنا پر انھوں نے اپنی حیات ہی میں ایک بڑا کتب خانہ بنا لیا تھا، جس میں چند نایاب قلمی نسخے موجود تھے، جن کا ذکر انھوں نے اپنے مضامین میں جا بجا کیا ہے۔

اثرؔ صاحب نے کافی نوحے اور سلام کہے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئے ہیں لیکن ایک ساتھ کسی کتاب کی شکل میں اب تک نہیں چھپ سکے ہیں۔ یہ سلام اور نوحے اور ماتم آج بھی اہلِ لکھنؤ کے گھروں میں ایامِ عزا کے دوران پڑھے جاتے ہیں اور بہت مقبول ہیں۔ ان کے کتب خانے میں ایک لائقِ ذکر قلمی نسخہ ایک نوحے کی بیاض ہے جس میں خاندانِ انیسؔ کے علاوہ دیگر حضرات کے نوحے ہیں۔ اسی ''بیاضِ اثرؔ'' میں موجود مرزا دبیرؔ کا ایک غیر مطبوعہ نوحہ پیشِ خدمت ہے۔ (مکرّم ارشاد)

الوداع اے اہلِ ماتم الوداع — لو ہوا آخر محرّم الوداع
آخری ماتم ہے شاہِؑ دیں کا آج — الوداع اے مجلسِ غم الوداع
ہے یہ وہ ساعت کہ عترت سے امامؑ — کہتے ہیں باچشمِ پُرنم الوداع
اب میرا سینہ ہے اور زانوئے شمر — حلق ہے اور تیغِ اظلم الوداع
اے امیرِ شام و کوفہ الفراق — ثانیٔ ایوبؑ و آدمؑ الوداع
تعزیے اُٹھتے ہیں رو رو کر کہو — اے ضریحِ شاہِؑ عالم الوداع
مومنو فرماتے ہیں تم سے حسینؑ — لو عزادارو چلے ہم الوداع
الوداع اے میری دُکھیاری بہن — الوداع اے فخرِ مریمؑ الوداع
حق کو سونپا شہربانوؑ اب تمھیں — اے میرے غمخوار و ہمدم الوداع
منھ کو بالوں سے چھپانا اپنے تم — دیکھنے پائیں نہ اظلم الوداع
لاش تک میری نہ گاڑیں گے لعیں — بے کفن رہ جائیں گے ہم الوداع
اے مریضِ لا دوا زینؑ العبا — اے میرے عترت کے محرم الوداع
اے سکینہؑ جان ہم سے مل لو تم — الفراق اے میرے ہمدم الوداع
بال کھولے کہہ رہے ہیں اہلِ بیتؑ — اے امامؑ ہر دو عالم الوداع
ہلتے تھے افلاک اس دم اے دبیرؔ — کہتے تھے شبیرؑ جس دم الوداع

سلام برزمینِ دبیرؔ

ڈاکٹر عقیل عباس جعفری

کس در کی بھلا ایسی توقیر نظر آئی
جو پہنچا ، اُسے بدلی تقدیر نظر آئی

آلِ ابو طالبؑ کا جو قول و عمل دیکھا
خون ابو طالبؑ کی تاثیر نظر آئی

اک شمع کے بجھنے سے وہ شمع ہوئی روشن
تاحد نظر جس کی تنویر نظر آئی

اک عمر کٹی تیری سجادؑ کے قدموں میں
ہم سے تو بھلی تو ہی زنجیر نظر آئی

اکبرؑ نے پڑھا خط کو یوں دل کی نگاہوں سے
ہر لفظ میں صغراؑ کی تصویر نظر آئی

یوں شاہؑ کے لشکر میں تھے سب ہی جری لیکن
اصغرؑ کی جدا سب سے شمشیر نظر آئی

کچھ ایسے شہیدوں کا خوں اس میں ہوا شامل
یہ خاک بلا سب کو اکسیر نظر آئی

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

کینہ دلِ مجرائیِ سرورؑ میں نہیں ہے
یہ آئینہ اقلیمِ سکندر میں نہیں ہے(مرزا دبیرؔ)

مصروفِ بکا جو غمِ سرورؑ میں نہیں ہے
نام اس کا لکھا خلد کے دفتر میں نہیں ہے

شامل نہ رضا پنجتنؑ پاک کی گر ہو
مقبول دعا داورِ محشر میں نہیں ہے

فطرس کو جو پر دیتا ہے میں اس کا گدا ہوں
مل جاتا ہے وہ کچھ جو مقدر میں نہیں ہے

ماتم ہے ، عزا خانہ ہے اور فرشِ عزا ہے
وہ کون سی نعمت ہے جو اس گھر میں نہیں ہے

بڑھ جاتی منافق کی ہے رفتارِ ہزیمت
کیوں کہتے ہو کچھ نعرہء حیدرؑ میں نہیں ہے

خاکی نہیں پر خاک سے نسبت ہے علیؑ کو
وہ نور ہے جو نور کے پیکر میں نہیں ہے

واضح نہیں اب بھی شرحِ سورۂ کوثر
کیا ماتمی شبیرؑ کا گھر گھر میں نہیں ہے

وہ عصر کا ہنگام وہ خوں بار فضائیں
ترتیب کوئی اب مہ و اختر میں نہیں ہے

اب اور نہ پامال کرو لعلِ نبیؐ کو
جاں تھوڑی بھی باقی تنِ اطہر میں نہیں ہے

نازک ہے بدن ، جسم بھی ہے خون سے گلگوں
کیا گُل کی شباہت علی اصغرؑ میں نہیں ہے

ہے خون میں غلطاں پڑا زہراؑ کا دلارا
پر ضرب کی ہمّت کسی خنجر میں نہیں ہے

آ آ کے یہی پوچھتے تھے قاسمؑ ذی جاہ
کیا نام چچا جاں مرا محضر میں نہیں ہے

دریوزہ گرِ پنجتنؑ پاک ہوں مظہرؔ صد شکر ہے کہ سودا کوئی سر میں نہیں ہے

❁❁❁❁

ڈاکٹر وفاؔ نقوی

(مرزا سلامت علی دبیرؔ کی زمین میں)

سبطِ نبیؐ جو تشنہ دہاں کربلا میں تھا مصروف دشتِ خشک بھی آہ و بکا میں تھا
پانی تھا بند آلِؑ رسولؐ انام پر خوفِ خدا ذرا نہ کہیں اشقیاء میں تھا
تم کیوں بھٹک رہے تھے زمانے کے ساتھ ساتھ ہر درد کا علاج تو خاکِ شفا میں تھا
عباسؑ آگئے تو کوئی بچ نہ پائے گا چرچہ تمام رات یہ اہلِ وغا میں تھا
اکبرؑ کو رن میں دیکھ کے کہتی تھی فوجِ شام یہ وصف یہ جمال تو بس مصطفیٰؐ میں تھا
محشر میں اضطراب سے وہ دور دور ہے جو شخص اضطراب میں ماہِ عزا میں تھا
جس دم علم اٹھا کے ہوئیں سینہ کوبیاں ماحول ایک رنج کا ساری فضا میں تھا
پروانے شمعِ شاہؑ شہادت کے کہہ گئے دیکھو بقا کا عکس ہماری فنا میں تھا
چھ ماہ کے صغیر کے ہنسنے میں دیکھ لو جو زور تیغِ حضرتِ شیرِ خدا میں تھا
یوں تو وفاؔ غزل بھی کہی تم نے خوب تر دل کا سکوں تو ذکرِ شہؑ کربلا میں تھا

❁❁❁❁

علی عرفانؔ

جھاڑتے ہیں پاک دامن جس طرح دامن کی خاک جھاڑ دی حُرؑ نے بھی اپنے دل کے پیراہن کی خاک
مِل نہ پائیں گے کبھی اصحابِ شہؑ جیسے گہر چھان لو صحراؤں کی یا چھان لو گلشن کی خاک
دینِ حق کو آنکھ دکھلانے کی کوشش جس نے کی کربلا نے جھونک دی آنکھوں میں ہر دشمن کی خاک
اللہ اللہ حسنِ قاسمؑ کی گہر افشانیاں ''پرتوِ عارض سے چمکی ذرّہ ذرّہ رن کی خاک''
گرنے والا تھا یہاں پر اُس کا بیٹا زین سے ایک ماں نے اپنے بالوں سے ہے جھاڑی رن کی خاک
روزِ محشر چہرۂ عرفانؔ منور کیوں نہ ہو اُس کی پیشانی پہ ہے شبّیرؑ کے مدفن کی خاک

دنیا و قبر و برزخ و محشر کہاں کہاں کام آئی حُبِّ ساقیٔ کوثر کہاں کہاں
بیتِ خدا ، مقامِ دنیٰ ، منبرِ غدیر یکجا ملے امامؑ و پیمبرؐ کہاں کہاں
ہیں نقشِ پا زمیں پہ ، ہواؤں پہ ، عرش پر ''ہے اختیارِ حیدرؑ صفدر کہاں کہاں''

مثلِ ابوترابؑ ملے کون دوستو ڈھونڈ آئے ہم تو مثلِ ابوذرؓ کہاں کہاں
در مرتضیٰؑ کا چھُٹ گیا جن سے وہ سارے لوگ کھاتے پھرے ہیں ٹھوکریں در در کہاں کہاں
کربل سے تا دمشق اسیرانِ شام کو یاد آیا شاہؑ دیں کا برادر کہاں کہاں
اصغرؑ نے تیر کھایا ، سکینہؑ کے دُر چھنے ہنگامِ صور آیا تھا سر پر کہاں کہاں
میزان و پُل صراط سے عرفاںؔ گزر گیا کام آئی مدحِ آلِؑ پیمبرؐ کہاں کہاں

❁❁❁❁

احمر شہوارؔ

سلام برزمینِ مرزا دبیرؔ

چہ مصرعِ دبیرؔ چہ احمر سلامِ تُو اقلیمِ آفتاب ہے جگنو کے روبرو
دشتِ بلا میں تابِ نظر لے کے آئے وہ رہتی ہو جس کو چہرۂ داور کی جستجو
معبود و عبد اور کوئی حد نہ انفصال ہوتی ہے وقتِ عصر جو دونوں میں گفتگو
حُرؑ آ رہا ہے ظلم کے لشکر کو توڑ کے رب کا حسینؑ کرتا ہے تفسیرِ ''تقنطو''
یہ فیصلہ تبسمِ اصغرؑ نے کر دیا ''کس کی زباں سے پیاس نے پائی ہے آبرو''
جاں لے کے پھر رہے ہیں ہتھیلی پہ سر فروش پاتے ہیں اس کی طینتِ فاضل سے جو نمو
جاری اذانِ گریہ و ماتم ہے ایک سمت اور دوسری طرف وہی صدیوں کی ہاو ہو
میں بھی کھڑا ہوں جادۂ کرب و بلا پہ چپ دل سے لگائے روضۂ سرورؑ کی آرزو
زخمِ دلِ فرات کا مرہم بنی ہوئی چشمِ عزا سے جاری یہ صدیوں سے آب جُو
اصغرؑ کے ساتھ کیوں نہ زمیں منقلب ہوئی نیزہ مثال تیر تھا ننھا سا وہ گلو
تیروں کی جا نماز پہ شبیرؑ کا قعود تسبیح بن رہا ہے ٹپکتا ہوا لہو
تنہا کھڑا تھا نرغۂ اعدا میں وہ حسینؑ لاکھوں ہیں جس کے ماتم و گریہ میں کو بکو
زہراؑ کہیں گی فخر سے محشر میں یا ابیؑ دیکھیں وہ آ رہا ہے میرا لعل سرخرو
شہوارؔ رشک کرتے ہیں تسنیم و سلسبیل میں نے کیا ہے اشکِ غمِ شاہؑ سے وضو

❁❁❁❁

میر یوسف میرؔ

طرح ''زہرا جسے لگنے نہیں دیتی تھی ہوا گرم'' مرزا دبیرؔ

خورشید جہانتاب نے مطلع جو کیا گرم پھر ہونے لگا معرکۂ کرب و بلا گرم

جس رے کا بنِ سعد کو تھا خواب دکھایا — اس رے کا اسے لقمۂ جو بھی نہ ملا گرم
عباسؑ کے آتے ہی تلاطم ہوا برپا — بھاگے ہیں عدو چھوڑ کے میدانِ وغا گرم
حملے کیے شیرِ اسد اللہ نے پیہم — تلوار کے چلتے ہی ہوا دستِ قضا گرم
کس درجہ شقاوت سے کیا قتل لعیں نے — شبیرؑ کا تن سرد ہوا خوں جو بہا گرم
صد حیف بدن اسکا رہا جلتی زمیں پر — ''زہراؑ جسے لگنے نہیں دیتی تھی ہوا گرم''
زینبؑ کی ردا چھن گئی ، نادان کے گوھر — اور مرقدِ زہراؑ میں ہوا شورِ بکا گرم
رونے نہ دیا ظالموں نے کنبے کو رن میں — آہوں سے مگر ہو گئی مقتل کی فضا گرم
جبریلؑ امیں کرنے لگے عرش پہ نوحہ — اور بزمِ ملائک میں ہوئی آہ و بکا گرم
سجادؑ کو پہنایا گیا طوقِ گلوگیر — بیمار کا تن جلتا رہا تھی جو ہوا گرم
کوفے سے علیؑ آگئے میدانِ بلا میں — دیکھا جو عدو کر گئے بازارِ جفا گرم
زینبؑ نے کہا باپ سے کی آپ نے تاخیر — بھیّا مرا بے سر ہوا ، خنجر جو چلا گرم
کچھ دیر کو آرام سے سو پائی سکینہؑ — پہلو جو اسے راہ میں دادیؑ کا ملا گرم
کیا فیض ہے شہزادیِ زینبؑ کا یہ ہم پر — آتے ہی محرّم کے ہوئی بزمِ عزا گرم
احساس میں شبیرؑ کا غم رچ گیا ایسے — مضطر ہے مری فکر ، مرا ذہنِ رسا گرم
مصرع ہے دبیرؔ سخن آرا کا یہ اے میرؔ — مجلس میں ہوئی جاتی ہے فکرِ شعراء گرم

❁❁❁❁

شباہت عباس شبیہؔ

سلام برزمینِ مرزا دبیرؔ

طالع جو مقدّر کا الم تک پہنچا — فی الفور میں غازیؑ کے علم تک پہنچا
فطرس یوں درِ جود و کرم تک پہنچا — گہوارۂ سردارِ ارم تک پہنچا
مقبول سبھی سجدے ہوئے ہیں اس کے — ''سر جس کا یداللہ کے قدم تک پہنچا''
پہنچی ہے وہیں خاک جہاں کا تھا خمیر — حرؑ وقتِ سحر شہؑ کے قدم تک پہنچا
کوثر کے ہوا آب میں وہ تر پہلے — پھر شعر مرا نوکِ قلم تک پہنچا
سر جسم پہ ہرگز وہ سلامت نہ رہا — حیدرؑ کی جو تلوار کے خم تک پہنچا
زرخیز ہوئی سرخیٔ ماتم کی زمیں — ساحل مری آنکھوں کا جو نم تک پہنچا

ابلیس سرِ عرش جوں پہنچا یونہی حیدرؑ کا عدو صحنِ حرم تک پہنچا
بس رکھ دیا لاشے پہ علی اکبرؑ کے صغریٰؑ کا جو خط شاہِؑ امم تک پہنچا
زینبؑ نے چکائی ہے ردا سے قیمت غم شاہؑ کا اس طرح سے ہم تک پہنچا
آیا تھا ابھی خوابِ عدم مجھ کو شبیہؔ اک قطرۂ کوثر مرے فم تک پہنچا

❁❁❁❁

شگفتہ دلشادؔ

مرزا دبیر علیہم الرحمہ کی زمین میں سلام

در پہ سرورؑ کے رہے خم یہ سدا سر میرا لال زہراؑ کا ہے اک مونس و یاور میرا
جب کبھی ہوگا میرا سامنا مشکل سے کہیں ہاتھ تھامے گا وہاں صاحبِ کوثر میرا
اَے خدا تُو نے بنایا ہے ثنا خوانِ حسینؑ کس قدر اَوج پہ پہنچا یہ مقدر میرا
مجھ سے غافل ہیں کہاں فاطمہ زہراؑ دیکھو دھیان رکھتی ہیں سدا آپ برابر میرا
شمر کہتا تھا یہ ہنس ہنس کے اَے زینبؑ تیرا آج لُوٹے گا چمن دیکھ یہ خنجر میرا
دے کے آغوش میں اصغرؑ کو یہ کہتی تھیں ربابؑ ہنس کے سر معرکہ کر لے گا یہ دلبر میرا
رو کے شبیرؑ نے زینبؑ سے کہا اَے خواہر خاک دنیا پہ ہے جو اب نہیں اکبرؑ میرا
عصرِ عاشور تھی ہائے یہ فغاں زہراؑ کی لُٹ گیا آج سرِ دشت بھرا گھر میرا
چھن گئی جبکہ ردا بنتِ علیؑ کے سر سے خون رو کر یہ کہا ہائے دلاور میرا
نہ رہے عونؑ و محمدؑ نہ رہا اِبنِ حسنؑ کیا کروں جی کے سِناں پر ہے برادر میرا
تری تربت میں اَے دلشادؔ حسینؑ آئے گا مرثیہ تُو نے لکھا ہے جو ثنا گر میرا

❁❁❁❁

حسن امام حسنؔ

سلام برزمینِ مرزا دبیرؔ

غم شاہِؑ ہدا ہے اور میں ہوں دعائے سیّدہ ہے اور میں ہوں
کہا شبیرؑ نے قبرِ نبیؐ پر غموں کی انتہا ہے اور میں ہوں
شہِؑ تنہا نے ناناؐ کو پکارا یہ فوجِ اشقیا ہے اور میں ہوں
کہا شبیرؑ نے لاشِ جواں پر شبیہِ مصطفیٰؐ ہے اور میں ہوں

ملا رومال زہراؑ حرؑ یہ بولے — یہ زہراؑ کی عطا ہے اور میں ہوں
ملے گی علم کی خیرات مجھ کو — درِ مُشکل کُشا ہے اور میں ہوں
مجھے باقی رکھے گی سوزخوانی — عطائے فاطمہؑ ہے اور میں ہوں
حسنؔ یہ خوبیِ قسمت تو دیکھو — فروغِ مرثیہ ہے اور میں ہوں

❁❁❁

محکمؔ عابدی علی پوری (انڈیا)

ایسے میں بُنوں زینبؑ مُضطر ، تری چادر — رکھ دوں میں ہر اِک حرف کے سر پر، تری چادر
بے پردہ کوئی لفظ یہاں آئے بھی کیسے؟ — ہے میرے خیالوں کو میسّر ، تری چادر
کچھ ایسی تجلّی ہے کہ اُٹھتی نہیں پلکیں — تنویرِ حیاء ، نور کا محور تری چادر
عظمت میں، بزرگی میں،فضیلت میں،شرف میں — کعبے کی رِدا کے ہے برابر ، تری چادر
مریمؑ بھی وضو کرتی ہیں،مَس کرنے سے پہلے — اللہ رے کِتنی ہے مطہّر تری چادر؟
اسلام! نہ گھبرا، کہ تجھے دوں گی میں سایہ — کہنے لگی ، بلوے میں یہ ، لُٹ کر تری چادر
ہر صاحبِ عصمت کی ہے رہبر، تری عصمت — ہے ساری رِداؤں کی پیمبر ، تری چادر
اصغرؑ کا تبسّم ، علی اکبرؑ کا کلیجہ — ہے بازوئے عبّاسِؑ دِلاور تری چادر
پرواز کرے سدرۂ عفّت پہ نہ کیوں کر — جبریلِ حیاء کی ہے جو شہپر تری چادر
ہر صبح ترے اشک گِریں صورتِ شبنم — ہر شام نے اُوڑھی ہے اُفق پر تری چادر
کرتا ہُوں ترا ذکر،تو کیوں تجھ سے بھی پہلے؟ — آتی ہے لبوں پر مرے اکثر تری چادر
وہ جس کے لگانے سے مِلی ہے اُسے زینت — عصمت کے محل کا ہے وہ جُھومر تری چادر
اے ثانیٔ زہراؑ! اِسے سینے سے لگا لے — روئی ہے بہت ، تجھ سے بچھڑ کر تری چادر
کیا خوف، اگر ہوگا سوا نیزے پہ سورج — محکمؔ پہ ہے سایہ سرِ محشر تری چادر

اشاریۂ انیسؔ (زیرِ طبع)

اشاریۂ دبیرؔ (زیرِ طبع)

مرزا سلامت علی دبیرؔ۔ ادبی اور تاریخی مغالطے

سیّد جاوید حسن

اس میں کوئی شک نہیں کہ دبیرؔ و انیسؔ آسمانِ سخن کے آفتاب و ماہتاب تھے، نہیں میں شاید غلط کہہ گیا، آسمان سخن وہ آسمان ہے جس پر ایک وقت میں دو آفتاب جگمگا رہے تھے، بقول خبیرؔ لکھنوی ؎

ایک آسمان مدح کے دو آفتاب تھے اِن کا جواب وہ تو یہ ان کا جواب تھے

ظاہر ہے کہ آفتاب و ماہتاب کہیں گے تو ایک کا دوسرے سے کسب ضیاء لازم آئے گا اور ایسا ہرگز نہیں تھا۔

لیکن ایک بات ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ جہاں بھی ان دو کا تذکرہ ہوتا ہے، انیسؔ و دبیرؔ کہہ کر یعنی انیسؔ کے نام کو فوقیت حاصل ہے، خال ہی خال ایسے مضامین ہوں جہاں ''دبیرؔ و انیسؔ'' آیا، بہت سوچا ایسا کیوں؟

کیا اس لیے کہ یہ ترکیب ''انیسؔ و دبیرؔ'' بولنے میں رواں ہے؟ نہیں ایسا نہیں ''دبیرؔ و انیسؔ'' بھی ایسا ہی رواں ہے جیسا ''انیسؔ و دبیرؔ''، کوئی لکنت یا ضغطہ نہیں ہوتا کیا حروف تہجی میں 'ا' پہلے اور 'د' بعد میں اس لیے؟ نہیں بچکانہ استدلال، کیا اس لیے کہ میر انیسؔ حضرتِ دبیرؔ سے سال بھر بڑے تھے؟ نہیں یہ کوئی قابلِ فہم وجہ نہیں دوسری قابلِ توجہ بات یہ تھی کہ دبیرؔ کو وہ مقام و مرتبہ و قبولیتِ عوام کیوں نہیں ملی جو انیسؔ کو میسّر آئی ہر چند مرزا صاحب کا کلام دقیق، تراکیب مشکل ہیں مگر رواں و سادہ مصرعوں کی بھی کچھ کمی نہیں صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی اور وہ شبلیؔ، آزاد، حالیؔ، مولفینِ ''حیاتِ انیسؔ و واقعاتِ انیسؔ'' اور پھر عہدِ حاضر کے شمس الرحمٰن فاروقی کی وہ تحریریں جو دبیرؔ کے نام کو گھٹانے اور ان کی عظمت کم کرنے کے واسطے منفی پروپیگنڈے کی صورت میں آئیں۔

تقی عابدی صاحب نے بہت بجا فرمایا کہ ''دبیرؔ اردو کا مظلوم ترین شاعر ہے'' گویا مظلوم امامؑ کا مظلوم شاعر۔

آگے فرماتے ہیں کہ ''دبیرؔ وہ تنہا شاعر ہے جس کے حسب نسب، کسب، مذہب، حیات فن و شخصیت پر حملے کیے گئے۔'' افسوس کے یہ سب وشتم اب بھی جاری ہے۔

دیکھیے اس عہد کے نامور ادیب و ماہر غالبیات گیان چند کیا فرماتے ہیں ''دبیرؔ کی نامقبولیت کی اصل وجہ ان کا کلام نہیں ایک علّامہ کا جانبدارانہ فیصلہ ہے جسے سہل انگاری کے سبب قبول کر لیا گیا، اس دبیرؔ جس کے کلام میں بقول علّامہ شبلیؔ فصاحت چھو نہیں گئی اور بلاغت نام کو نہیں، میں غیر مسلم ہونے کے باوجود ان کے بند کو پڑھتا ہوں تو ایک خاموش رقّت طاری ہوتی ہے۔ آخر صاحبِ اولاد ہوں۔ قدر دانِ دبیرؔ کو چاہیے کہ صحیح انتخاب کے ذریعہ اُن کو اُن کا جائز مقام دلائیں۔''

قبل اس کے ہم حضرتِ شبلیؔ، آزاد، حالیؔ، مولفینِ ''حیاتِ انیس و واقعاتِ انیسؔ'' اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحبان کی تحریروں سے کوئی نتیجہ اخذ کریں، حضرتِ سلامت علی دبیرؔ کے سلسلے میں چند گزارشات:-

جدّ و آباء کے حوالے سے اگر انیسؔ اپنی پُشت پر ضاحکؔ، میر حسنؔ، میر خلیقؔ کا نام رکھتے تھے تو دبیرؔ بھی اہلیؔ شیرازی کی نسل سے تھے، وہی

اہلیؔ شیرازی جن کی مثنوی ''سحرِ حلال'' مشہورِ زمانہ ہے، جو علم العروض ومعانی وبیان کے کمالات کا نمونہ ہے۔ اس مثنوی کی صنعت گری یہ ہے کہ دو بحروں میں پڑھی جاسکتی ہے اور ہر شعر میں دو قافیے ہیں یعنی ذو بحرین وقافیتین ہے۔

مرزا دبیرؔ کے جد مرزا غلام محمد ایک بہت جیّد عالم اور صاحبِ باطن بزرگ تھے جنھیں بادشاہِ دلّی شاہ عالم نے اپنے ایک فرمان میں ''فضیلت وشریعت مآب، تقویٰ وصلاح دستگاہ'' لکھا ہے۔

چنانچہ مرزا صاحب کے روشن باطن کا اندازہ آپ اس رباعی سے لگائیں جو انھوں نے اپنے انتقال سے چند روز قبل کہی، ایک پیش گوئی جو درست ثابت ہوئی، ایک دعا جو مستجاب ہوئی۔

جب مصحفِ ہستی مرا برہم کرنا سی پارۂ ایّام محرّم کرنا
برباد نہ جائے مری خاک اے گردوں تیّار چراغِ بزمِ ماتم کرنا

(جی ہاں ان کا انتقال ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ ہجری میں ہوا)

مرزا صاحب پانچ سات برس کے تھے جب اپنے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ دلّی سے لکھنؤ آ بسے حضرت انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ، تذکروں کے مطابق ۱۸۴۶ء میں آئے جب ان کی عمر ۴۵ یا ۴۶ سال تھی، گونوا جوانی وجوانی میں وہ اپنے والد میر خلیقؔ کے ساتھ لکھنؤ آتے رہے اور مجالس بھی پڑھیں مگر مستقل سکونت ۱۸۴۶ء میں اختیار کی، اور اس عہد میں وہ اتنے معروف بھی نہ تھے۔

دبیرؔ جس زمانے میں لکھنؤ آئے وہ خوش حالی کا دور تھا، نفاستوں کا شہر اور نزاکتوں کا مرکز، شاعری عام تھی، ناخواندہ بھی اشعار پڑھتے اور داد دیتے، سخن فہمی عام تھی۔ سات سال کی عمر سے دبیرؔ نے شعر کہنا شروع کیا، گیارہ بارہ سال کی عمر میں میر ضمیرؔ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشہورِ زمانہ قطعہ پڑھا۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے

داد وصول کی، شاگردی اختیار کی اور استاد سے دبیرؔ تخلّص پایا، مرزا صاحب انیسؔ کے مقابلے میں بہت پہلے شہرت کے بامِ عروج پر پہنچ گئے تھے۔

پندرہ بیس سال کی عمر میں منبر پر آنے لگے اور پیش خوانی میں اپنا کلام سنا کر داد پانے لگے۔ اتنی شہرت پا چکے تھے کہ رجب علی بیگ سرورؔ نے ''فسانۂ عجائب'' (۱۹۴۴ء) میں دبیرؔ مرغوب، کا ذکر خلیقؔ، ضمیرؔ، احسانؔ وافسردہؔ کے ساتھ کیا۔

پچیس سال کی عمر میں مرزا سلامت علی دبیرؔ دربارِ شاہی تک پہنچ گئے تھے۔ آج سے تقریباً دو صدی قبل یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ بادشاہانِ اودھ نصیر الدین شاہ سے واجد علی شاہ تک ان کے قدردانوں میں تھے۔ انھیں پلکوں پہ بٹھایا بقول واجد علی شاہ۔

بچپن سے اِن کے دامِ سخن کا اسیر ہوں میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیرؔ ہوں

مرزا صاحب کو ایک بڑا توسّل سرکار ملکہ زمانی (زوجہ نصیر الدین شاہ) اور سلطانِ عالیہ (دختر ملکہ زمانی) سے بھی تھا، سلطانِ عالیہ مرزا صاحب کی شاگرد تھیں۔ سالانہ اس دربار سے لاکھوں روپے کے سلوک ہوتے تھے۔

دبیرؔ فقط لکھنؤ میں نامور نہ تھے، حیدر آباد دکن، عظیم آباد، سندھ، پنجاب بلکہ تمام ہندوستان حتّیٰ کہ کربلا تک مشہور تھے۔ (یہ آج کا زمانہ نہیں تھا کہ ہر شخص ایک دو ممالک کی زیارت وسیر کر کے ''بین الاقوامی شہرت یافتہ'' کا بلّا لگا لیتا ہے۔)

پھر اگر سلامت علی صاحب کے کلام کو دیکھیں تو صنائع، بدائع سے آراستہ گل دستہ، علمی روایات کا حسین آئینہ خانہ، فنِ معنی و بیان کا نفیس نمونہ۔ استعارے اور تشبیہات جن سے زبان میں جان آجاتی کا بہترین صرف۔ کنائے اور مجاز جس سے شعر میں معنویت اور لطف وزور پیدا ہوتا ہے موجود ہے۔ جنابِ مرتضیٰ حسین فاضل صاحب نے لفظوں میں صنعت اور شگوفہ کاری کی قسمیں اور ان کی دبیرؔ کے کلام میں موجودگی کا تفصیلی ذکر اپنی ''جواہرِ دبیرؔ'' کے دیباچے میں کیا ہے۔ شاعر کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب ایک عالمِ باعمل، سخت مشترع (اصرار کے باوجود اپنی تصویر نہیں بنوائی اس وقت تک فوٹو گرامی کا فن ہندوستان پہنچ گیا تھا اور شاہِ اودھ کے فوٹو گرافر دبیرؔ کے شاگرد تھے) حسنِ اخلاق، رواداری اور خدا ترسی کا نمونہ تھے۔ ثابتؔ صاحب نے لکھا ''وہ سخی ابنِ سخی تھے، لاکھوں روپیے سالانہ ملتے تھے لیکن کبھی پس انداز نہیں کیا۔ عزیز، اقربا، مسکینوں ومحتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔''

کچھ ایسا ہی ذکر حضرت شادؔ عظیم آبادی نے بھی مرزا صاحب کے سلسلے میں کیا ہے۔ تقی عابدی صاحب فرماتے ہیں ''دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے ابواب المصائب'' کے علاوہ ہر ہیئت وصنفِ سخن میں طبع آزمائی کی، نظم، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس، مسدّس، رباعی، تاریخ گوئی، سلام، شہر آشوب، تضمین ہر صنف میں شاہکار چھوڑ گئے۔ صنعتِ غیر منقوط (مہملہ) اور منقوط میں کلام کہے۔ صنعتِ غیر منقوط میں ان کا مرثیہ معروف ہے ؎

مہرِ علم سرورِؑ اکرم ہوا طالع

منقوط کلام کی مثال میں یہ رباعی دیکھیں۔

جب بخت بنِ قین نے زینت بخشی زینبؑ نے تشفی تب بہ شفقت بخشی
تیغیں جزو تن جبیں شق جی بے چین جنّت بخشی نبیؐ نے جنّت بخشی

مرزا صاحب کے مرثیوں کی تعداد کا حتمی تعین ممکن نہیں مگر ہر گذرے ہوئے دن کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

تقی عابدی صاحب کی تحقیق کے مطابق مطبوعہ مرثیوں کی تعداد ۳۹۰ پہنچ گئی ہے۔ غیر مطبوعہ قلمی نسخے ۲۸۵ کے قریب ہیں اس طرح کل ۶۷۵ مرثیے ہوئے۔ ہمارے دور کے نوجوان محقق، تحت اللفظ خواں اور عاشقِ مرثیہ اصغر مہدی اشعرؔ نے اب تک دبیرؔ کی پانچ جلدیں شائع کی ہیں اور ان کے مطابق دبیرؔ کے مطبوعہ مرثیوں کی کل تعداد ۴۵۶ ہے رباعیات کا تخمینہ بقول تقی عابدی صاحب ۱۳۳۳ ہے۔

اپنے وقت کے جیّد شعراء اور علماء نے حضرت دبیرؔ کے بارے میں کیا کہا۔ چند کے بیانات ملاحظہ فرمائیں ورنہ فہرست بہت طویل ہے۔

شیخ ناسخؔ نے مرزا صاحب کی ایک بیت کو سن کر کہا سلامت علی سا طبیعت دار خلّاقِ مضامین نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ وہ بیت یہ تھی ؎

یاں پنجۂ مریمؑ کہوں پنجے کو پلک کے گہوارے میں عیسیٰؑ کو سلاتی ہیں تھپک کے

خواجہ آتشؔ نے مرزا صاحب کے غیر منقوط مرثیے کو سن کر کہا کبھی فیضیؔ کی غیر منقوط تفسیر سنی تھی۔ اور اب یہ سلامت علی کا غیر منقوط مرثیہ۔

یا ایک مرثیے ''کوہِ رقیم پر جو علیؑ کا گزر ہوا'' سن کر کہا ''میاں ایسے مضامین کہو گے تو مر جاؤ گے یا خون تھوکو گے۔''

مرزا غالبؔ نے کہا ''مرثیہ گوئی دبیرؔ کا حق ہے، دوسرا اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ مفتی عباس صاحب نے فرمایا کہ ''میر انیسؔ کا کلام فصیح و شیریں ہے، مرزا صاحب کا کلام دقیق اور نمکین ہے''۔ پس جب ایک سے دوسرے کا ذائقہ مختلف ہے تو ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی، امیرؔ مینائی کہتے ہیں ''میں تمام شعرائے عجم پر دو ایرانی شاعروں کو ترجیح دیتا ہوں فردوسیؔ و جامیؔ مگر دبیرؔ و انیسؔ کو فردوسیؔ اور جامیؔ پر بھی ترجیح و تفضّل دیتا ہوں''۔

آیئے اب ان وجوہات کو دیکھیں جو دبیرؔ کی عظمت کو گھٹانے اور ان کا رتبہ میر انیسؔ کے مقابلے میں کم کرنے کا باعث ہوئیں۔ اور حضرت شبلیؔ نعمانی، مولانا محمد حسین آزاد، حالیؔ پانی پتی، مولفینِ ''حیات انیسؔ'' و ''واقعاتِ انیسؔ'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کی من گھڑت باتیں اور مغالطے جو ذہنوں میں بس گئے۔

اس سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ خدانخواستہ ہم انیسؔ کے رتبے کو کم کر رہے ہیں، نہیں حاشا نہیں، ہم کو خود بچپن سے انیسؔ کو سنتے اور پڑھتے آرہے ہیں، دبیرؔ کی طرف توجہ کم تھی گویا واجد علی شاہ کے مصرعے میں تصرف کرتے ہوئے کہوں ؎

میں شائقِ کلام وحیدؔ و نفیسؔ ہوں اور کم سنی سے عاشقِ نظمِ انیسؔ ہوں

میں کیا زیادہ تر تحت اللفظ خواں میر صاحب کا ہی کلام پڑھتے تھے مگر آفرین ہے تحت اللفظ خوانوں کی نئی نسل پر جس کے سرخیل ہمارے فرحان رضا ہیں کہ انہوں نے اور ان کے ساتھ دیگر نوجوانوں نے دبیرؔ کے کلام کو بکثرت منبر سے پڑھنا شروع کیا ہے۔

مگر میر انشاء دبیرؔ پر اس مضمون کا انگریزی کی وہ مشہور کہاوت ہے۔ Give the credit where the credit is due.

چنانچہ دبیرؔ کے سلسلے میں جو مغالطے اور غلط باتیں ہمارے بزرگوں کی طرف سے کہی گئیں ان کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کے لیے ہم نے مدد لی ہے جناب ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کے ایک تحقیقی مقالے سے جو پہلی بار ۱۹۷۷ء میں ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی کے دبیرؔ نمبر میں چھپا اور بارِ دگر ڈاکٹر ہلالؔ نقوی صاحب نے رثائی ادب کے دبیرؔ نمبر (اشاعت ۲۰۱۳ء) میں شائع کیا۔

علامہ شبلیؔ نعمانی:

شبلیؔ صاحب کے ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' سے رثائی ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات خوب واقف ہیں، اس ''موازنے'' کے جواب میں ''ردِّ موازنہ'' کے رسالے اور فوقؔ صاحب کی ''المیزان'' سے بھی سب ہی آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ شبلیؔ صاحب نے انیسؔ کی وکالت کی ہے، حضرتِ دبیرؔ کے بعض کم تر، پست، مبتذل، اور الحاقی اشعار ان کی طرف منسوب کر کے ''موازنے'' کا تاج محل تعمیر کیا، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دفترِ ماتم کی بیس جلدوں کے علاوہ مرزا دبیرؔ کے مراثی کی دو جلدیں ابتداء میں مطبع اودھ لکھنؤ سے چھپیں یہ دونوں جلدیں نہ صرف غلط سلط چھپیں بلکہ ان میں الحاقی کلام سب کا ہی شامل تھا۔

جناب اکبر حیدری کے بیان کے مطابق دبیرؔ کی فضیلتِ شاعری کو گھٹانے کے لیے زیادہ تر انہیں دو جلدوں سے مثالیں پیش کی گئیں ہیں۔

مغالطہ نمبر ۱:

زیرِ قدم والدہ فردوسِ بریں ہے

اس مصرعے کو تحریر کرنے کے بعد شبلیؔ فرماتے ہیں کہ اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیرِ قدم، والدہ، فردوس، بریں یہ سب بجائے خود فصیح ہیں لیکن ان کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرع پیدا ہوا ہے وہ اس قدر بھدّا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمّل نہیں کر سکتی ڈاکٹر اکبر حیدری نے بہ تحقیق ثابت کیا کہ یہ مصرع دبیرؔ کا ہے ہی نہیں بلکہ ان کے شاگرد حکیم قدیر الدولہ قدیرؔ کا ہے اور اس مرثیہ کا مطلع ہے ؎

ارشاد مجھے آج یہ ہے لوح و قلم کا

مغالطہ نمبر ۲:

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

اس مصرعے کی بابت شبلیؔ کہتے ہیں کہ کیا گراں مصرع ہے اور اس کے مقابل انیسؔ کا معروف مصرعہ رقم کرتے ہیں۔

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

اس سلسلے میں ڈاکٹر اکبر حیدری فرماتے ہیں کہ ''اس بات پر افسوس ہے کہ علّامہ نے یہ مصرع دبیرؔ کی طرف منسوب کر کے ان کے بارے میں غلط روایت قائم کر لی۔ راقم الحروف نے مرزا صاحب کا سارا مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام چھان ڈالا مگر یہ مصرعہ کہیں نہیں ملا یہ مصرعہ دراصل دبیرؔ کا ہے ہی نہیں، دیکھیں دبیرؔ نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے:۔

مجروحِ تیر و خنجر و تیغ و سنین ہیں اے عاشقِ حسینؑ ہم ہی تو حسینؑ ہیں

یا۔

تم کون ہو؟ فرمایا غریبِ اَزَلی ہوں بطحہ کا نبیؐ زادہ حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں

مغالطہ نمبر ۳:

نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا

اس شعر کو بھی علّامہ نے موازنے میں شامل کر کے ثقالت کا الزام لگایا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کی تحقیق نے بتایا کہ یہ شعر بھی دبیرؔ کی بیس جلدوں میں کہیں نہیں ملا۔

مولانا محمد حسین آزاد:

ناسخؔ کے حوالے سے محمد حسین آزاد دبیرؔ کے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ ''دبیرؔ کو ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر استاد کی اصلاح پسند نہیں آئی وہ شیخ ناسخؔ کے پاس گئے جو بوڑھے ہو چکے تھے، کہنے لگے حضرت میں نے اس شعر میں یوں کہا ہے اور استاد نے یہ اصلاح دی ہے شیخ نے فرمایا ٹھیک اصلاح دی ہے، جب دبیرؔ نے اپنے لفظ پر اصرار کیا تو ناسخؔ کو غصّہ آ گیا اور وہ ڈنڈا لے کر ان پر دروازے تک دوڑے۔''

اکبر حیدری صاحب کہتے ہیں کہ اس واقعے میں کوئی صداقت نہیں کیوں کہ مرزا دبیرؔ بارہ سال کی عمر میں ضمیرؔ کے شاگرد ہوئے، آزاد کے بیان کی تصدیق کسی حوالے سے نہیں ہوئی، حقیقت تو یہ ہے کہ ناسخؔ مرزا دبیرؔ کے ایک شاگرد حسین علی اخترؔ کے گھر جایا کرتے تھے جہاں دبیرؔ اپنا نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ میر محمد رضا ظہیرؔ (شاگردِ دبیرؔ) کہتے ہیں کہ یہ واقعہ تو بہتانِ عظیم ہے۔ ابھی مثل میرے اس زمانے کے لوگ زندہ ہیں اور وہ سب شاہد ہیں، مرزا مرحوم اس محلّے میں جہاں شیخ ناسخؔ رہتے تھے کبھی نہیں گئے بلکہ تمام عمر ناسخؔ کا یہ قول رہا کہ ہائے مرزا سا ذہن و ہونہار طبیعت دار شاگرد میر ضمیرؔ کا نہیں ہو سکتا۔ ان کو مصحفی اور ضمیرؔ سے کمال عناد تھا۔

ناسخؔ کے سلسلے میں دبیرؔ کے شاگرد میر محمد رضا ظہیرؔ کہتے ہیں کہ ایک روز میں محلّہ ٹکسال میں ایک مجلس پڑھنے گیا جو شیخ صاحب کے پڑوس میں تھی۔ مجلس میں تاخیر تھی میں وقت سے پہلے پہنچ گیا شیخ صاحب پہلے سے موجود تھے۔ مجھ سے کہا آج تم اپنے استاد کا کہا ہوا مرثیہ پڑھو گے میں نے کہا جی، فرمانے لگے میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا چند بند ابھی سنا دو میں نے پیش و پس کیا۔ آخر لوگوں کے اصرار پر میں نے یہ بند پڑھا۔

کیوں مدِّ نظر چشم کو گردش ہے ہر ایک بار پہلو کو بدلتے ہیں مگر مردمِ بیمار

ابرو کے قرینے سے کھلا چشم کا اسرار ہیں نور کے گہوارے میں ہیں عیسیٰؑ خوش اطوار

یاں پنجۂ مریمؑ کہوں پنجے کو پلک کے
گہوارے میں عیسیٰؑ کو سلاتی ہیں تھپک کے

یہ سن کر شیخ ناسخؔ اچھل پڑے اور سیدھے اپنے کتب خانے میں گئے، تین چار منٹ بعد ایک کتاب لے کر آئے فرمایا یہ ظہیرؔ فاریابی کا دیوان ہے۔ ظہیرؔ نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا اور پتلی کو عیسیٰؑ سے تشبیہ دی مگر وہ ثابت نہ کر سکے، مرزاؔ نے کمال کر دیا پنجے کو پنجۂ مریم کہہ کر ثابت کیا۔

گہوارے میں عیسیٰؑ کو سلاتی ہیں تھپک کے

پھر فرمایا کہ سلامت علی سا طبیعت دار خلّاقِ مضامین نہ ہوا ہے نہ ہوگا، بلا کی طبیعت پائی، لطیف تخیل یہی ہے کہ شاعر جو دعویٰ کرے اس کو ثابت کرے، واہ کیا ثابت کیا ہے۔

آتش کے حوالے سے (آتشی لطیفہ):

آزاد صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مجلس قرار پائی جس میں معمول کے سامعین کے علاوہ سخن فہم اور باکمال اشخاص کو خاص طور پر دعوت دی گئی ہجومِ خاص و عام ہوا، خواجہ آتشؔ باوجود پیری اور آزاری تشریف لائے، خوب داد کا شور و غوغا ہوا، خواجہ صاحب خاموش سر جھکائے دوزانو بیٹھے جھومتے رہے دبیرؔ صاحب مرثیہ پڑھ کر منبر سے اترے خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کہا حضرت میں نے جو کچھ عرض کیا آپ نے سنا، کہنے لگے ہاں بھئی سنا، دبیرؔ کے مزید استفسار پر فرمایا بھئی سنا تو مگر میں سوچتا ہوں یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان تھی۔

اکبر حیدری صاحب کہتے ہیں کہ آزاد کا آتشؔ کی زبان سے مرزا صاحب کے مرثیے کو لندھور بن سعدان کہلانا غلط اور بے بنیاد دراصل انہوں نے یہ آتشی لطیفہ خود سے گڑھ لیا، آتش مرزا دبیرؔ کی مجلسیں توجہ سے سنتے تھے اور ان کے کلام کی داد دیتے تھے۔

میر محمد رضا ظہیرؔ جنھوں نے آتشؔ و ناسخؔ کو دیکھا تھا ایک مجلس کا چشم دید واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ جب دبیرؔ نے اپنا بے نقطہ مرثیہ ''مہر علم سرورِ اکرم ہوا طالع'' پڑھا آتشؔ موجود تھے مجلس کے بعد پکار کر کہا ''مرزا صاحب یہ صنعت اس بے تکلّفی کے ساتھ آپ کا حصّہ ہے۔ یا تفسیر فیضیؔ کی سنی تھی یا آج یہ بے نقطہ مرثیہ سنا'' فرما کر رخصت ہوئے۔

اسی طرح سید افضل حسین ثابتؔ مرزا کے شاگرد مرزا احمد ظہورؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جس مجلس میں مرزا صاحب نے یہ مرثیہ پڑھا تھا جس کا مطلع ہے۔

سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل

اس میں خواجہ صاحب تشریف فرما تھے، کئی بند و پر پکار کر کہا بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے۔ کون کہتا ہے کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو تم سے بہتر کوئی دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا۔

خواجہ الطاف حسین حالی، بہ حوالہ مرزا غالب:

حالیؔ جو کہ آزاد کے ہم عصر تھے عجیب بات کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مرزا غالبؔ نے لکھنؤ کے مجتہد سید محمد صاحب قبلہ مرحوم کی رہائش پر تین بند لکھ کر ان کے پاس لکھنؤ بھیجا اور کہا کہ یہی تین بند صرف امتثالِ امر کے لیے لکھے ورنہ اس میدان کا مرد نہیں ہوں، یہی ان لوگوں کا

حصّہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمر بسر کی۔ اس کے بعد حالیؔ اپنی طرف سے لکھتے ہیں کہ ان کا قول تھا کہ ''ہندوستان میں انیسؔ و دبیرؔ جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔

حالیؔ کی اس عبارت سے صاحبِ ''واقعاتِ انیسؔ'' نے کچھ اور ہی نتیجہ نکالا فرماتے ہیں ''جب مرزا غالبؔ کی انیسؔ سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو انیسؔ مرحوم نے صنعتِ غزل گوئی کا ابتذال کر کے اکثر سلاموں کے مطلعے اور شعر سنائے، مرزا غالبؔ سے دل لگی میں مرثیہ کہنے کی فرمائش کی چنانچہ مرزا صاحب نے دلّی واپس آ کر تین بند مرثیے کے لکھے اور ساتھ خط روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

''امتثالِ امر سے مجبور تھا، صرف تین بند لکھ کر جو غور کیا تو مرثیہ کا ہے کو واسوخت معلوم ہوتا ہے، یہ صرف آپ ہی کا کام ہے۔''

اکبر حیدری اپنے تحقیقی مقالے میں فرماتے ہیں کہ راقم الحروف، حالیؔ اور واقعاتِ انیسؔ کے مصنف کے بیان کی تردید کرتا ہوں کہ غالبؔ نے مرثیے کے تین بند لکھنؤ کے مجتہد سید محمد قبلہ صاحب کو بھیجے تھے یا انھوں نے کبھی کہا تھا کہ مرثیہ لکھنا انیسؔ کا کام ہے۔ یہ بھی کہنا بے اصل ہے کہ مرزا غالبؔ انیسؔ سے لکھنؤ میں ملے تھے۔ مرزا غالبؔ نے پنشن کے سلسلے میں ۱۸۲۷ء میں کلکتے کا سفر کیا تھا اس اثناء میں انھوں نے لکھنؤ میں قیام کیا تھا مگر اس وقت انیسؔ فیض آباد میں تھے اور لکھنؤ میں دبیرؔ کا طوطی بولتا تھا اور یہ بھی بے اصل بات کہ انھوں نے تین بند انیسؔ کو بہ نظرِ اصلاح بھیجے۔

اکبر حیدری آگے کہتے ہیں کہ دراصل غالبؔ کے مرثیے کی شانِ نزول یہ ہے کہ سندیلہ کے ایک شخص محمد ریاض الدین امجد ریاضؔ اپنے سفر کے سلسلے میں ۶ محرم ۱۲۷۷ھ کو دلّی میں مرزا غالبؔ سے ملنے گئے، ایّامِ عزا تھے۔ غالبؔ نے اپنے گھر پر مجلسِ عزا برپا کی، تین بند پڑھے، لوگ روئے پیٹے پھر مرثیے کے تین بند اپنے دستِ خاص سے لکھ کر انھیں دیے اور یہ کہا یہ کام مرزا دبیرؔ کا ہے، وہی اس فن کے ماہر ہیں۔

ریاض سندیلوی کا سفر نامہ ''سرورِ ریاض'' ۱۸۶۰ میں شائع ہوا جس میں یہ تحریر ہے، اس وقت غالبؔ، انیسؔ و دبیرؔ تینوں زندہ تھے۔ لہٰذا کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ صغیرؔ بلگرامی شاگردِ غالبؔ فرماتے ہیں کہ غالبؔ نے کہا واقعی یہ حق مرزا دبیرؔ کا ہے، دوسرا اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

شمس الرحمٰن فاروقی جو ہمارے عہد کے معروف ادبی شخصیت تھے، ان کا ۲۰۰۵ء میں دہلی کے ماہنامہ ''حدیثِ دل'' کے مرزا دبیرؔ نمبر میں ایک مضمون ''دبیرؔ کے مرثیے میں بیانیہ'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے ''اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا دبیرؔ بڑے شاعر نہ تھے۔'' گویا بغضِ دبیرؔ کا جو بیج شبلیؔ صاحب نے بویا اس کی آبیاری کر رہے ہیں۔''

اس مضمون اور خصوصاً اس ابتدائی جملے کا جواب نہایت عمدہ اور استدلال کے ساتھ ہمارے عہد کے نامور شاعر و ادیب جناب ساحرؔ لکھنوی نے دیا ہے۔ بہت پر مغز مضمون ہے اسے معروف تحت اللفظ خواں، مولف فرحان رضا سلمہ اور ان کے صاحب زادے مصطفیٰ رضا سلمہ نے اپنی تدوین کردہ ''دبیریات'' میں شائع کیا ہے۔

مولفینِ ''حیاتِ انیسؔ و واقعات انیسؔ'':

ان دوصاحبان نے بھی دبیرؔ کی شخصیت اورفن کومجروح کرنے میں کوی کسرنہیں اٹھارکھی تھی۔ چنانچہ دونوں بزرگوں نے یہ قول کہ واجدعلی شاہ بادشاہ کی والدۂ محترمہ ملکہ کشورصاحبہ نے ایک مجلسِ عزا کا اہتمام کیااس میں دونوں باکمالوں یعنی دبیرؔوانیسؔ یکے بادیگرے پڑھوایا۔مرزا دبیرؔقبائے درباری پرعمامہ باندھے منبر پر بیٹھے اور بادشاہ کی تعریف میں انھوں نے نظم پڑھی ان کے بعدانیسؔ معمول کے لباس میں منبر پر آئے اور یہ سلام شروع کیا۔

غیر کی مدح کروں شہؑ کا ثنا خواں ہوکر مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیمان ہو کر

اکبرحیدری صاحب کہتے ہیں کہ عہدِواجدعلی شاہ میں کوئی ایسی مجلس برپانہیں کی گئی جس میں دبیرؔوانیسؔ دونوں نے یکے بعددیگرے پڑھا ہو۔سلام کا جوشعرپیش کیا گیاہےانیسؔ کانہیں جومونسؔ کا ہےاوران کے مطبوعہ تصانیف اور پرانے قلمی نسخوں میں موجود ہے۔

مطلع: مجرئی بہتے ہیں آنسو درِ غلطاں ہوکر آبرو پائی ہے کیا چشم نے گریاں ہو کر

مقطع: رہبری کی جومقدر نے تو ہم اے مونسؔ روضۂ شاہؑ پہ جائیں گے خراماں ہوکر

اس طرح یہ بھی بہتان ہے کہ دبیرؔدرباری لباس میں تھے۔دبیرؔنے کبھی درباری لباس زیب تن نہیں کیا۔

آخرمضمون میں ہم ایک غیر جانبدارمورخ اورشاعرشیخ عظمت علی جودونوں باکمالوں کے ہم عصر تھے کا ایک بیان ان کی کتاب ''مرقعِ خسروی'' سے نقل کرتے ہیں۔

''فی زمانہ میرانیسؔ صاحب ببرعلی اورمرزا دبیرؔصاحب سلامت علی نام ایسے ہوئے کہ نہ دیکھے نہ سنے، جنھوں نے شہرستانِ سخن میں جھنڈے گاڑدیےاور بلندتلاشی کی اوج حد سے سوابڑھی،مرثیے کی زمین کوآسمان بنادیا۔ چراغِ آفتاب وماہتاب اپنی روشن فکر سے گل کردیا، بندشیں اچھے اچھے پرنہ کھلیں، بلندیاں آسمان کے تارے توڑلائیں، درحقیقت اس فن کے یکتا،آفتاب وماہتاب سے ہمتا،سواان دواب کسی کی ہستی نہیں، واقعی ایسی کسی کوسوجھتی نہیں۔''

❁❁❁❁

www.emarsiya.com

دنیا کی سب سے بڑی ڈیجیٹل مرثیہ لائبریری جہاں آپ انیسؔ ودبیرؔ کے مکمل مطبوعہ مراثی کے علاوہ ۳۲۰ مرثیہ نگاروں کے ۴۰۰۰ سے زائد مراثی حاصل کرسکتے ہیں۔ سوزخواں خواتین وحضرات کے لیے بستۂ سوزخوانی کا بھی انتظام ہے۔ اگرآپ مزید مراثی اس ویب سائٹ پرشامل کرنا چاہیں تواس ای میل پررابطہ کریں۔

faroghemarsiya@gmail.com

دشتِ دبیرؔ کی جادہ پیمائی

محمد زماں آزردہ

بڑی مسرت کی بات ہے کہ ''فروغ مرثیہ'' کا دبیرؔ نمبر شائع ہو رہا ہے۔ میں نے جب اس نمبر کے لیے مضمون لکھنا چاہا تو خیال آیا کہ سب لوگ دبیرؔ کے کلام کے حوالے سے اپنے تاثرات اس میں شائع کرنا پسند کریں گے۔ ایسا کیا ہوسکتا ہے، جو کچھ الگ بھی ہو اور دبیرؔ سے متعلق بھی۔ مڑ کے دیکھنے کی کوشش کی تو ۱۹۷۱ء سے لے کر آج تک کا ذہنی سفر سیر الارض، سامنے آیا کہ دبیرؔ یات کی شناخت، بازیافت اور دریافت کے سلسلے میں نصف صدی کا یہ عرصہ پکار پکار کے کہنے لگا کہ ہم بھی تو آپ کے ساتھ رہے۔ اس لیے فیصلہ کرلیا کہ اپنے اس سفر کے گزارے ہوئے بعض پڑاؤ، شخصیات سے ملاقاتیں اپنے شفیق اور مہربان رہنمایان کے ساتھ چند لمحات کی باتیں آپ کے ساتھ بیٹھ کے دہراؤں۔ بہت ممکن ہے کہ بعض باتیں آپ کی طبیعت کے لیے گراں ثابت ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ ان باتوں کو دہرا کے میرا کتھارس Catharis ہو اور میں کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کروں۔ لیجیے سماعت فرمائیے۔

میرے بیشتر پڑھنے والوں اور جاننے والوں کو یہ خیال ہوگا کہ میں نے سلسلۂ دبیرؔ کا سفر لکھنؤ سے شروع کیا ہوگا۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ میرا یہ سفر اصل میں کشمیر سے ہی شروع ہوا۔ جب میں نے پی ایچ ڈی کے لیے اپنے موضوع کا انتخاب کرنا چاہا۔

لوگ اپنے موضوع کے انتخاب کے لیے ادھر ادھر خوب دوڑ رہے تھے اور میرا معاملہ یہ تھا کہ میرے پاس نوکری پہلے سے تھی۔ وقت کی کمی نہیں تھی البتہ وسائل محدود تھے پھر بھی اس خیال سے کہ موضوع ایسا رہے جو بجائے خود کم توجہی کا شکار رہا ہو۔ مرثیے سے کسی حد تک میں واقف تو تھا مگر یہ واقفیت نصابی تعلقات سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود چونکہ دورانِ تعلیم انیسؔ و دبیرؔ کو پڑھا تھا اور یہ پڑھائی بھی علامہ شبلیؔ کے موازنے کی وجہ سے غیر متوازن سی تھی ان کا موازنہ پڑھ کے ذہن بیشتر صورت میں گومگو کے درمیان اٹک جاتا تھا۔ دبیرؔ کے بارے میں شبلیؔ کے تاثرات پڑھتے ہوئے ہم غالبؔ کے اس مصرعے کی تصویر ہوجاتے تھے ؎

''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے''

بہرکیف میرا موضوع کچھ تو میری وجہ سے اور کچھ مرحوم پروفیسر محمد حسن کی وجہ سے جو میرے پہلے نگران تھے، ''مرزا سلامت علی دبیرؔ، حیات اور کارنامے'' مقرر ہوا بیشتر لوگ اس سے واقف نہیں کہ کشمیر میں اردو مرثیے کا چلن نہ ہونے کے باوجود وہاں کے کتب خانے مراثی کے ذخیرے سے معمور تو نہیں کہنا چاہیے ہاں مزّین ضرور تھے جامعہ باب العلم بڈگام کے کتب خانے میں خلافِ توقع حیاتِ دبیرؔ بھی تھی اور المیزان بھی، جن کو میں دبیرؔ یات کے حوالے سے نسخۂ کیمیا سمجھتا ہوں۔ اسی سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کشمیر اردو ادب کے معاملے میں اپنے خالی پن کے باوجود اپنے اندر بہت کچھ رکھتا تھا۔

دبیرؔیات کے حوالے سے آج میں پہلی بار اپنے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں جبکہ میرے کتنے ہی کرم فرما، دوست احباب اور قارئین مجھ سے فرمائش کرتے رہے ہیں کہ میں اپنی سوانح، خودنوشت کی صورت میں رقم کردوں اور میں اس کے جواب میں جو کہتا رہا ہوں وہ آپ بھی سنیے ''خودنوشت لکھنے میں مجھ جیسے آدمی کو جو جھوٹ نہیں بولتا بڑی الجھن ہوگی اس میں جو نام بار بار آنے چاہئیں وہ آئیں گے نہیں اور جن کے آنے کی کوئی تُک نہیں وہ بار بار آئیں گے۔ اس لیے میں یہ جوکھم اٹھانے سے قاصر ہوں''، البتہ ان کی فرمائشوں سے متاثر ہو کے میں نے خودنوشت کے عنوان سے ایک انشائیہ لکھا ہے جو نشر بھی ہوا ہے اور رسائل میں شائع بھی ہوا ہے۔ یہاں اس سے غرض نہیں البتہ میرے بعض احباب جن میں محترم شین کاف نظام، محترمہ بناٹھاکر، مادھو کرشنک، انجینئر جاوید شبیر، مرحوم محمود الحسن رضوی خاص طور سے شامل ہیں، اس بات پر راضی ہوئے کہ میں اپنی یادداشتیں سپردِ قلم کروں۔ مگر زندگی گزارنا بجائے خود ایک ایسی مصروفیت ہے کہ من پسند کاموں کے لیے فرصت بہت کم نصیب ہوتی ہے اور ہمارا معاملہ تو یہ رہا کہ زندگی کر لی، گذاری نہیں۔ زندگی کرنے اور گزارنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اللہ بھلا کرے ان کرم فرماؤں کا جنھوں نے فروغِ مرثیہ کا انیسؔ نمبر شائع کرنے کے بعد دبیرؔ نمبر شائع کرنے کی ٹھان لی۔ مجھ سے مضمون کا تقاضا بہ اسرار کرتے رہے اور میری خواہش برابر تساہل کا شکار ہوتی رہی لیکن اب ایک ایسی منزل آ گئی ہے جب محض اس پرچے میں شرکت کے لیے میں اپنے سلسلۂ دبیرؔیات کے حوالے سے بعض یادداشتیں رقم کر کے اپنے آپ کو آئینہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ زندگی میں ایک موقعے پر مڑ کے دیکھنے کی، اگر دیکھا جائے تو کئی جہتیں ہیں اور نگاہ واقعی ہر عمر میں ایک الگ معنی اور مفہوم رکھتی ہے۔ میرا زندگی کی اس منزل پہ مڑ کے دیکھنا خود میرے لیے کس قدر مسّرت آمیز یا عبرت ناک ہوسکتا ہے ہر ایک میں یہ جاننے کی سکت نہیں۔

خیر میرا یہ سفر خلافِ توقّع کلکتہ سے شروع ہوتا ہے یہ سفر میں نے پہلی بار ۱۹۷۴ء میں کیا تھا غالباً جنوری کا مہینہ تھا، ایکسپریس سے میں نے کلکتہ کا سفر کیا جب کہ بظاہر دبیرؔ کے حوالے سے کلکتہ سے شروعات کرنا عجیب سا لگتا ہے چاہیے تو یہ تھا کہ یہ سفر یا تو لکھنؤ سے شروع کیا جاتا یا زیادہ سے زیادہ عظیم آباد (پٹنہ) سے مگر کلکتے میں ایک تو نیشنل لائبریری تھی (علی پور میں) دوسرے علّامہ جمیلؔ مظہری اس زمانے میں اپنے بھائی رضا مظہری (عرف ماسٹر صاحب) کے ہاں کلکتہ میں رہائش پذیر تھے۔ جمیلؔ صاحب پہ پیری کا عالم تھا مگر ذہن جوان تھا۔ ایک خصوصیت ان کی آپ کو بھی بتاتا چلوں کہ وہ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں لیے رہتے تھے۔ اگر چائے بھی سامنے ہوئی اور کئی طرح کے بسکٹ بھی یا پھر کھانا رکھا ہو اور کئی طرح کے سالن بھی تو یہ ایک ایک چیز کو نوش کرنے کے لیے تسبیح ہاتھ میں لے کے استخارہ دیکھتے تھے کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں۔ تصوّر کیجیے جو شخص کھانے پینے میں اس قدر احتیاط سے کام لے، وہ شخص معاملاتِ عالم اور گفتگو میں کس قدر محتاط رہتا ہوگا۔ میری تو سنجیدگی کے ساتھ دبیرؔیات کے حوالے سے پہلی گفتگو اور مشاورت ان سے ہوئی۔ علامہ کا تعلق چونکہ پٹنہ سے تھا اور مرزا دبیرؔ ایک زمانے تک امام باندی بیگم صاحبہ کے امام باڑے گلزار باغ (پٹنہ سٹی) میں عشرہ پڑھتے رہے اور علّامہ جمیلؔ مظہری کے ذہن میں بزرگوں سے سنے ہوئے واقعات خاص طور سے امداد امام اثرؔ کی ان سے ملاقات ازبر تھی۔ اس لیے وہ ایک طرح کی رغبتِ خاص کے ساتھ گویا ہوئے اور بہت سے نکات کی وضاحتیں فرما کر میرے ذہن کی تشفّی کی اور اس سے بعض ایسی گرہیں کھل گئیں جن کو شاید کشمیر میں رہ کے کھولنا اس زمانے میں ممکن نہ تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ میں شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ظفر نوگانوی تھے جو شعر بھی کہتے تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے۔ علقمہ شبلی، جاوید

نہال، سالک لکھنوی وغیرہ کی ملاقاتوں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ شاید میں نے بہت مشکل موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ ادھر نیشنل لائبریری میں کچھ زیادہ ذخیرہ نہیں تھا مگر مرحوم عبدالغفور نساخؔ کا نام انتخاب نقص کے حوالے سے عموماً چرچے میں لیتا تھا۔ انھوں نے انیسؔ ہی کو کیا پورے لکھنؤ کو اپنی تحریروں میں ایسا لپیٹا تھا کہ اگر آدمی اپنے ذہن سے کام نہ لے تو گمراہ بھی ہوسکتا ہے۔ واجد علی شاہ کے قیامِ مٹیا برج کے زمانے میں مرزا دبیرؔ علاج چشم کے لیے وہاں بلا لیے گئے تھے۔ غالبؔ نے کلکتے کی تعریف کی ہے، داغؔ نے کلکتے کو چھوا بھی اور جیا بھی، اس لیے دبیرؔ کے حوالے سے کلکتے کا ذکر آنا کوئی اچھنبے کی بات نہیں، اِدھر میری خواہش یہ بھی تھی کہ میں سراج الدولہ پبلس لائبریری مرشد آباد کے ذخیرے کو بھی دیکھ لوں مگر شومئ قسمت کہ اس کتب خانے کا محکمہ کسٹوڈین کے تحت میں تھا اور کسی کو بغیر اجازت کے ذخیرۂ کتب تک رسائی نہیں ہوسکتی تھی مگر اللہ بھلا کرے خاندانِ واجد علی شاہ کا جس کے بیشتر افراد مرزا دبیرؔ کے شیدائی تھے۔ واجد علی شاہ نے تو کہا تھا کہ

بچپن سے ان کے دامِ سخن کا اسیر ہوں میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیرؔ ہوں

پرنس انجم قدر اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے برادر کی وساطت سے مجھے کسی طرح اس ذخیرے تک پہنچنے کی صورت نصیب ہوئی اور میں نے وہاں مراثی کے مخطوطات پورے ایک دن تک دیکھے اور بعض قلمی نمونے میں نے نقل بھی کیے یہ بھی یاد رکھیے کہ مرشد آباد شہر کلکتہ کا کوئی محلّہ نہیں بلکہ ایک پوری رات کا سفر کر کے آدمی مرشد آباد پہنچ سکتا تھا۔ کلکتے سے واپسی پر میں پٹنہ اترا اور سیدھے خدا بخش خان لائبریری کا رخ کیا اسی زمانے میں عابد رضا بیدار صاحب نے اس کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ عابد رضا بیدار کا تقرر خدا بخش خان لائبریری کے لیے ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ عابد رضا بیدار کے جوائن کرنے سے پہلے یہ ادارہ ایسے لوگوں کی تحویل میں تھا جو ذاتی کاموں میں اتنا مصروف رہتے تھے کہ اپنا اصلی کام جس کی وہ تنخواہ لیتے تھے نہیں کر پاتے تھے واللہ اعلم کام یہ کیا کرتے تھے اور تنخواہ کس کی لیتے تھے یہی وجہ ہوئی کہ انہوں نے بیدار صاحب کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا اور مخالفت کرنے میں یعنی ان کے کام میں روڑے اٹکانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر یہی زمانہ ہے جب خدا بخش خان لائبریری محققین، شائقینِ ادب، مورخّین اور علمائے تہذیب وتمدّن کی آماجگاہ بنی، لوگ دور دور سے آ کے یہاں کے ذخیرۂ مخطوطات سے فیض حاصل کرنے لگے۔ اس دور میں میں نے خاص بات جو دیکھی وہ یہ کہ لائبریری کے احاطے کے اندر جاتے ہی بائیں جانب کرسی پر ایک صاحب درخت یا چھاتے کے سائے میں بیٹھے نظر آتے۔ یہ علّامہ عسکری تھے جو شائقینِ علم وادب کی رہنمائی کو اپنا فرضِ علمی سمجھ کے وہاں بیٹھ کے ادا کرتے تھے یقین ہے اس دور کے لوگ اس مضمون کو پڑھیں گے تو انھیں وہ لمحے یاد آئیں گے جن میں عسکری صاحب اپنی گفتگو سے نہ صرف علمی مسائل حل کرنے میں مدد کرتے تھے بلکہ بنیادی ذرائع (Primary sources) کی نشاندہی کر کے لوگوں کو علمی اعتبار سے آراستہ کرتے تھے۔ لائبریری کے اندر ریڈنگ روم میں جو شخص بلاناغہ ہر روز چند گھنٹوں کے لیے یہی کارِ خیرِ علمی انجام دیتے تھے وہ تھے قاضی عبدالودود مرحوم اس دور میں یہ بات مشہور تھی جس پر مجھے آج بھی یقین ہے کہ اُردو میں آسمانِ تحقیق کے چار ستون ہیں ایک قاضی عبدالودود، دوسرے مسعود حسین رضوی ادیب تیسرے امتیاز علی خان عرشی اور چوتھے مالک رام، اس ریڈنگ روم میں میری ملاقات جب قاضی عبدالودود سے ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی میری تحقیق کا موضوع دریافت کیا اور میرا منّن کے محاورے میں گو اُنھیں کے مصداق منھ بنا کے بولے میاں کیا ملے گا مرزا دبیرؔ میں کوئی اور موضوع تلاش کریں

آپ کے بس کا یہ روگ نہیں۔'' ان کا اس طرح ٹوکنا کئی بار یاسمجھانا کچھ ایسا تھا کہ میں اندر ہی اندر پہلے تو لرزا ٹھا مگر اس کے بعد میرے اپنے فیصلے کی وکالت میں کچھ جملے کہہ دیئے جس میں شبلیؔ ،انیسؔ ،دبیرؔ اور کچھ اور نام آ گئے اور آخر میں جب میں نے یہ کہا کہ '' قاضی صاحب میں پی ایچ ڈی نوکری کے لیے نہیں کر رہا ہوں نوکری میرے پاس پہلے سے ہے۔'' یہ سن کر کچھ توقف کیا اور پوچھا '' کیا نوکری کرتے ہو'' میں نے یہ سن کر جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا جو شاید اس زمانے کے اعتبار سے ایک عجوبہ ہی تھا اس پر جب انھوں نے پڑھا لیکچرر پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو، کشمیر یونیورسٹی تو ان کا رویہ ہی بدل گیا اور بڑی محبت سے کہنے لگے کہ آپ کے پاس وہ چیز پہلے ہی سے ہے جس کے لیے لوگ جوکھم اٹھاتے ہیں آپ ضرور کامیاب ہوں گے اس کے بعد مجھے گھر لے گئے۔ ان کا گھر قریب ہی سبزی باغ میں تھا مجھے ناشتہ کرایا جو بڑی بات تھی اور '' معاصر'' کا ایک شمارہ مجھے عنایت کیا جس میں ان کا مضمون '' مرگِ دبیرؔ'' شائع ہوا تھا میں نے اپنا انشائیوں کا مجموعہ '' غبارِ خیال'' ان کی خدمت میں پیش کیا اتفاق سے انھوں نے کتاب کو کھول کر انشائیہ '' خطوطِ خطوط'' پر نظر ڈالی۔ ایک جملہ پڑھ کر دہرایا یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں تھا اور اس کی خوب داد دی پتہ نہیں یہ داد مجھے دی جا رہی تھی یا مولانا ابوالکلام آزاد کو مگر میرا حوصلہ بڑھا۔ مجھے دعائیں دیں اور میں وہاں سے رخصت ہوا۔ پٹنہ کے اس قیام کے دوران میں نواب علن صاحب کا مہمان رہا اور انہی کے یہاں پٹنہ سٹی کے امام باڑے باندی بیگم صاحبہ میں قیام رہا۔ اس سفر میں میری ملاقات کئی لوگوں سے رہی۔ ڈاکٹر اسلم آزاد (مرحوم) سے تو میری جان پہچان پہلے سے تھی کیونکہ میرے ساتھ ۱۹۷۳ء میں وہ بھی کشمیر یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کے لیے انٹرویو دینے کشمیر آئے تھے اسی دوران میری ملاقات ہندی کے جانے مانے شاعر آرَن کمل سے ہوئی بڑے لوگوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر زکی الحق ،عطاالرحمان کاکوی ،کلیم صاحب کے ایک عزیز ڈاکٹر امتیاز وغیرہ سے خوب ملاقاتیں رہیں ادھر خدا بخش خان لائبریری میں امداد امام اثرؔ کے عزیزوں میں ایک صاحب احمد بدر جو آج کل جمشید پور میں ہیں، انھوں نے بھی میری خاص طور سے لائبریریوں میں صحیح مخطوطات تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔

دبیرؔیات کے سلسلے کا جو اصل مقام تھا یعنی لکھنؤ یہ میں نے پٹنہ کے بعد دیکھا۔ بعض لوگوں سے میری مراسلت ضرور تھی مگر بالمشافہ ملاقات میرے یہاں پہنچنے پر ہی ہوئی میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اس وقت علمائے ادب کی جو کہکشاں لکھنؤ میں درخشندہ تھی اب لوگ ان کے سائے کی روشنی میں راستے کی تلاش کرتے ہیں۔ لکھنؤ اور اردو مرثیہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں جتنے مرثیہ گو بیک وقت لکھنؤ میں رہے اتنے شاید کہیں اور ایک ساتھ نہیں رہے۔ اور جہاں تک صنفِ مرثیہ کے بڑے بڑے شعرا کا تعلق ہے وہ لکھنؤ یا زیادہ سے زیادہ اس کے نواح میں پلے بڑھے مرزا دبیرؔ کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی پیدائش دہلی کی ہے لیکن عمر لکھنؤ میں گذری ان کی حیات کے حوالے سے میں نے ایک جگہ لکھا تھا '' مرزا دبیرؔ نے آنکھ اگرچہ دہلی میں کھولی تھی لیکن نگاہ ان کو لکھنؤ میں نصیب ہوئی'' ایک محقق نے جو لکھنؤ میں اس مکان میں کبھی کبھی آتے تھے جس میں مَیں رہتا تھا جب یہ جملہ پڑھا تو فوراً کہہ اٹھے کہ تحقیق میں ایسی زبان نہیں چلتی، یہ سن کے میں حیران رہ گیا کہ تحقیق میں کون سی زبان چلتی ہے جب مرحوم پروفیسر رشید احسن صاحب سے میں نے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ فوراً بولے ان کی زبان اور ان کے بیان پر کبھی بھروسہ نہ کیجیے یہ بہت ہی بلیغ جملہ ہے جو اپنے اندر ایک داستاں کو سموئے ہوئے ہے بہرکیف لکھنؤ میں جس ہستی سے میری پہلی ملاقات ہوئی وہ اردو میں آسمانِ تحقیق کے دوسرے ستون کہلاتے ہیں یعنی مسعود حسن رضوی ادیب، یہ دین دیال روڈ پر رہتے تھے

جو کبھی محلّہ (اشرف آباد) کہلاتا تھا ان کی قیام گاہ کا نام ''ادبستان'' تھا جو غالباً اب بھی محفوظ ہے یہ خود کہتے تھے کہ وظیفہ حسنِ خدمت پانے کے بعد دو ہی کاموں سے گھر سے نکلتا ہوں یا تو بادشاہ واجد علی شاہ سے متعلق کچھ ہو یا پھر میر انیسؔ سے متعلق۔ مسعود صاحب کٹّر انیسیے مگر واہ رے امانت داریِ علم کبھی مجھ سے مرزا دبیرؔ کے حوالے سے گفتگو کرتے، مواد فراہم کرنے یا نکات کی نشاندہی اور توضیح میں کبھی بخل نہیں کیا اس زمانے میں مسعود صاحب کو ایک تکلیف تھی کہ وہ اگر بیٹھتے تھے تو پھر کھڑا ہونا دشوار ہوتا تھا اور اگر کھڑے ہوتے تو پھر بیٹھنے میں مشکل ہوتی تھی اس لیے بیشتر جب تک میں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا جس میں الماریوں میں کتابیں بھی رکھی رہتی تھیں، وہ کھڑے رہتے تھے۔ مجھے کتابیں لا لا کے دیتے تھے میرے سوالوں کا جواب بھی دیتے تھے مجھ سے بحث بھی ہوتی تھی کبھی کبھار کوئی اور آتا تو وہ بھی شریکِ گفتگو ہوتا البتہ ان کے برادر اصغر ڈاکٹر اکثر ملتے تھے کبھی کبھی وہ باہر ہی اپنے کمرے میں لے جا کر مجھے پرانے واقعات، مراثی کے بند کے بند سناتے رہتے تھے جبکہ یہ پیشے سے ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے ادب کے بارے میں اور لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں ان کی معلومات بھی خاصی تھی مسعود صاحب بڑی محبت سے ہر بات کو سمجھاتے تھے لیکن ان کا معاملہ یہ تھا کہ دو چار باتوں کے بعد ان کی گفتگو کا رخ واجد علی شاہ کی طرف مڑ جاتا یا پھر میر انیسؔ کی طرف خانوادۂ انیسؔ کے وہ ایک طرح سے مشیر بھی تھے اور جب میر انیسؔ کے مقبرے کی تعمیرِ نو ہوئی تو ان کی لوحِ قبر پر انھوں نے وہی شعر کندہ کروایا جو مرزا دبیرؔ نے ان کی وفات پر ایک قطعے کی صورت میں رقم کیا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زبان کے استعمال، دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں کے فرق، محاورات کے استعمال، اور دیگر مسائل پر اکثر گفتگو رہتی تھی۔ ایک بات مجھے خاص طور سے یاد ہے کہ کبھی کبھی انیسؔ و دبیرؔ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوتے بقول ان کے کسی اور کا جملہ دہراتے تھے ''یہ دبیرؔ تو انیسؔ کا تابعِ مہمل ہو گیا۔ سبھی انیسؔ و دبیرؔ کہتے ہیں'' پتہ نہیں کیوں مجھے اب بھی کبھی خیال آتا ہے شاید ان کا اپنا ہی جملہ تھا مگر کسی اور پر رکھ کر دہراتے تھے مگر اس بات میں مجھے کوئی شک نہیں ہے وہ طالبعلموں کے دوست تھے اور ان کا رویہ محققین کے ساتھ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اس وقت حیات ہوتے جب میں نے اپنا مقالہ جمع کیا تھا تو وہ ضرور ممتحنین میں ہوتے پھر بھی مجھے تسلی ہے کہ علامہ جمیلؔ مظہری پی ایچ ڈی میں میرے ممتحن رہے۔

یہ موقع نہیں کہ میں مسعود صاحب کے بارے میں زیادہ گفتگو کروں البتہ وہ منظر میری آنکھوں میں ہے کہ جب میں لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت ان سے رخصت لینے کے لیے حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے جانے کی اجازت دیتے ہوئے دعائیں دیں اور فرمایا کہ یہ ڈرائنگ روم اس وقت تک سونا سونا لگے گا جب تک کہ آپ کے ایسا طالب علم اس کو آ کے آباد نہ کرے۔ میں یہ سب سر جھکائے سنتا رہا اور جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھیں نم تھیں۔

یہ دور اگرچہ لکھنؤ کی تہذیب کا رونا رونے والا زمانہ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ رونے رلانے کے باوجود ابھی لکھنؤ کی تہذیب کے محافظ، مجاور اور پرستار اسی فضا میں سانس لینے کی کوشش کر رہے تھے جو ماحول سے زیادہ ان کے ذہنوں میں رچی بسی تھی گفتگو کا مسئلہ ہو، جامہ زیبی کا معاملہ ہو علم اور عقل کا سلسلہ ہو، وہ لوگ ایک خاص تہذیب کے نمائندے تھے۔ لکھنوی تہذیب سے متعلق اس وقت کچھ زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں مگر علم کی ترسیل، ترویج اور اس کے تحفظ کا جہاں تک ذکر کیا جانا چاہیے اس اعتبار سے بیشتر لوگ ایک دوسرے پر سبقت لینے پر آمادہ رہتے تھے یہاں میں صرف چند ایک کا ذکر کروں گا جن کے ساتھ مطالعۂ دبیرؔ اور دبیریات کے حوالے سے میرے تعلقات رہے اوّل تو

میں مسعود صاحب کے بعد پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کا ذکر کروں گا جو اردو، فارسی، عربی کے جیّد عالم تھے۔ علمِ دین اور زبان و ادب کے حوالے سے نہایت اعلیٰ مقام پر فائز تھے ان کے درجۂ علمی کے لیے یہ محض ایک اضافی کیفیت تھی کہ وہ لکھنؤ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر بھی تھے اس کا اندازہ آپ یوں لگا سکتے ہیں کہ پرنسٹن انسائیکلو پیڈیا آف پوئیٹری اینڈ پوئیٹکس (princeton encyclopedia of poetry and poetics) ان کو ازبر تھا کام ان کا ناسخ پر تھا لیکن اردو شعر و ادب کے حوالے سے کوئی موضوع ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ کٹرہ بوتراب خان میں رہتے تھے ان کا دیوان خانہ جسے آج کی زبان میں بیٹھک کہنا چاہیے ہمیشہ ہی شائقینِ علم سے بھرا رہتا تھا میں نام گنواؤں تو اکثر چھوٹ جائیں گے اس لیے نام لیے بغیر کہوں گا کہ علمی مسائل پر اس بیٹھک میں ہمیشہ ہی گفتگو رہتی تھی اور میں خاص طور سے مطالعہ دبیرؔ کے حوالے سے ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتا تھا ان کی ذاتی لائبریری سے مجھے بعض ایسی کتابیں مطالعہ کے لیے دستیاب رہیں جو دور دور تک کہیں اور نہیں تھیں جن میں خاص طور سے مرزا فصیحؔ کی ''نخلِ ماتم'' کا میں نے انہی کی مہربانی سے مطالعہ کیا۔ دوسرے میرے محسن مرزا صادقؔ (جو مرزا دبیرؔ کے پر پوتے تھے) سے میری ملاقات رہی ہے ضعیف العمر تھے تحت میں مرثیہ خوانی کرتے تھے اور اس بات کا ثبوت ان کی گفتگو میں ضرور فراہم ہوتا تھا کہ باپ کو پُوت پتا پت گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا ان کے ایک صاحب زادے گوہر آغا شعر کہتے تھے، مجالس میں سلام، مشاعروں میں غزل اور محافل میں مرثیے پڑھتے تھے۔ اپنے آبائی مقام کوچۂ مرزا دبیرؔ میں رہتے تھے وہیں پر مرزا دبیرؔ کی تربت بھی ہے اور اپنی حیات میں ان کا قیام بھی وہی رہتا تھا ان کی وجہ سے مجھے بعض غیر مطبوعہ مراثی تک رسائی حاصل ہوئی اور بعض الحاقی تصانیف کا بھی علم ہوا ان کے بعد جن شخصیت کا مجھے ذکر کرنا چاہیے وہ ہیں مرحوم سید محمد رشید جو نہ شاعر تھے نہ ادیب مگر کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا، اسمبلی میں ملازمت کرتے تھے اور امین آباد میں ''جعفر منزل'' میں رہائش تھی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا مراثی کا خاصہ ذخیرہ تھا۔ راجہ صاحب پیر پور کے خانوادے سے تھے اور جب راجہ صاحب سید احمد مہدی لکھنؤ تشریف لاتے تو انکا قیام بھی اکثر جعفر منزل میں رہتا۔ سید محمد رشید علم و ادب بالخصوص لکھنوی تہذیب اور مرثیے کے حوالے سے شائقینِ علم کا نہ صرف حوصلہ بڑھاتے بلکہ اپنے کتب خانے کو استعمال کرنے کی وسیع القلبی کے ساتھ اجازت دیتے۔

اس کے بعد مجھے (M.A.Khan) محمد عسکری خان یاد آتے ہیں جو نشاط گنج میں رہتے تھے اور علم و ادب کی دنیا سے الگ رہتے ہوئے بھی اس کی خدمت میں ہر وقت پیش پیش رہتے تھے۔ وہ پیشے سے اکشنر تھے (Auctioner) تھے مگر کتابیں جمع کرنے کا اور فرصت میں کتب بینی کا شوق ضرور تھا ان سے بھی مجھے بعض ایسی کتابیں مطالعے کے لیے دستیاب رہیں جو شاید آسانی سے ملنا مشکل تھیں۔

اسی طرح سے بیشتر لوگ جن میں خالص کاروباری لوگ بھی تھے اور کچھ خالص علمی اور ادبی خدمت کو مقصدِ زندگی سمجھتے تھے، میرے رابطے میں آئے، ان میں دانش محل والے نسیم صاحب بھی تھے۔ نسیم بک ڈپو والے نسیم بھی۔ قدآور صحافی اور افسانہ نگار اور نصرت پبلشرز کے مالک عابد سہیل بھی سیاسی رہنما، صحافی ہندی کی تشہیر کرنے والے اور اردو کی خدمت کرنے والے جیّد عالم چودھری سبط محمد تقوی بھی تھے یہ اگرچہ اکبر پور فیض آباد کے زمیندار تھے مگر اکثر لکھنؤ کے علماء اور ادباء کی صحبت میں وقت گذارتے تھے۔ اور آخری ایّام میں امام باڑہ غفران مآب میں رہ کر علم و ادب کی ترسیل کا کام کرتے تھے۔ ہندی میں رسالہ ''توحید'' کی اشاعت ان کا ایک خاص کارنامہ ہے۔ عہدِ امجد علی شاہ پہ

تحقیقی مقالہ لکھ کر لکھنؤ سے اپنے تعلق کا حق ادا کیا تھا۔ نادر آغا کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہیے جو بڑھاپے میں اپنے سرپہ یادگارِ زمانہ کتب رکھے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ علم کے خزانے پہنچاتے رہتے تھے بظاہر پرانی کتابیں حاصل کرنا اور انھیں فروخت کرنا ان کا کاروبار تھا مگر گدڑی سے لعل اور سیپی سے موتی برآمد کرنا کوئی آسان کام نہیں اور پھر یہ کام انجام دے کے اس سرمائے کو صحیح پارکھ تک پہنچانا بجائے خود ایک اجتہاد ہے، فراموش کردہ کتابوں کو حاصل کر کے ضرورت مندوں اور شائقین تک پہچانا ایک معرکے کا کام ہے اگر میں یہاں پہ مسعود صاحب، سالار جنگ میوزیم اور اپنی ذات کے حوالے سے نادر آغا کے بارے میں پھر بیان کروں تو باعثِ طوالت ہوگا۔ اس موقع پر مجھے میرؔ کا یہ شعر بہت یاد آتا ہے۔

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

جانتا ہوں میرے دوست کہیں گے کہ اس مضمون میں مرحوم نیّر مسعود، انیس اشفاق، احمد عباس، شیما رضوی، شہنشاہ مرزا، محمد عسکری (ابنِ احتشام حسین) اکبر حیدری، سلیمان عباس، علی جواد زیدی، تصور حسن زیدی، خورشید حسن وکیل، کاظم علی خان، (جس کو ہم کاظم علی جواں کہتے تھے) اور بھی کتنے لوگوں کا ذکر نہیں آیا اس میں میں اپنی فرصت، قاری کی آزمائش کا بہانہ کروں یا کچھ اور مگر یہ شعر میری وکالت کرے گا۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

یہ موقع نہیں کہ میں ایک ہی نشست میں بنارس، آلہ آباد، حیدر آباد اور امروہہ کو بھی اپنے اس سفر کے ذکر میں شامل کروں اور خانوادۂ دبیرؔ کے ہندوستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے افراد اور شائقین کی بات کروالبتہ اس وقت میں اپنی ہر سانس ان کے اظہارِ تشکر کے ساتھ لے رہا ہوں جن کی وجہ سے میرے مقالے کی عزت نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے باوجود قائم ہے۔

❁❁❁❁

انیسِ مرثیہ
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

دبیرِ مرثیہ
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

آسماں بے ماہِ تاباں۔۔۔

ڈاکٹر اسد اریب

آسماں بے ماہِ تاباں ، سدرہ بے روح الامینؑ
طُور بے موسیٰؑ ، ادب بے شمع ، منبر بے دبیرؔ

مرزا سلامت علی دبیرؔ، مُلّا شیرازی کے خانوادے کے چشم و چراغ کہلاتے ہیں، مرزا غلام حسینؑ کے فرزند ہیں، دہلی مُحلّہ بلّی ماراں میں پیدا ہوئے بہ اعتبار عام، ولادت کا سال ۱۸۰۳ء ہے۔ لکھنے والوں نے لکّھا ہے، ابھی سات آٹھ برس کے تھے کہ اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ جا بسے، باپ نگینوں کے تاجر تھے، بعض نے کہا ہے گھوڑوں کی تجارت تھی۔ بہرحال یہ طے ہے کہ خوشحالی، فَراخ دستی، کردار کی خوبی اور دین داری کے حوالے سے اِن کا گھرانہ، ایک شہرت عام ضرور رکھتا تھا۔ ''شمس الضحیٰ'' کے ملفوظات میر مولانا دلدار علی غفران مآب کا ایک رُقعہ بطور رسید یوں درج ہے۔

کرم فرمائے دوستاں، مستجمعِ الطاف و احسان عالی مراتب و عمدہ مناقب، مرزا غلام حسین صاحب دام مجدہٗ، ۔۔۔۔ مبلغ پانچصد روپے منجملہ زکاۃ و خمس، بدستِ مسمّٰی غلام حیدر فرستادہ رسید۔۔۔۔ (ص ۵۱) (تاریخ مرقومہ ۱۳۱۶ھ رمضان)

''اُن دِنوں پان سَے کی رقم، کوئی معمولی رقم نہ تھی، مرزا دبیرؔ کے گھر گھرانے کی یہ شان و شوکت اُس وقت اور اُوپر اپہنچی، جب واجد علی شاہ نے دبیرؔ کو اپنا اُستادِ سخن بنا لیا، الطاف و اکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑی، حالت اسیری میں بھی کلکتے آ بُلایا، انگریز ڈاکٹروں سے آنکھوں سے علاج کروایا واجد علی شاہ فرماتے ہیں:-

بچپن سے ان کے دامِ سخن کا اسیر ہوں
میں کم سِنی سے عاشقِ نظمِ دبیرؔ ہوں

ادبی تنقید و تاریخ کے طالبِ علم جانتے ہیں، مرزا رفیع سوداؔ کے بعد اُردو مرثیے نے جو نیا قالب بدلا تھا، اُس کی عام شہرت، ایک نظمِ طویل کی پہچان سے تھی، حتّٰی کہ آتشؔ جیسا اُستاد بھی، ایسے منظّم خیالات کی طوالت کو مرثیے سے جُڑا ہونا، ناپسند کرتا تھا بقول مولانا محمد حسین آزاد، لوگ آتشؔ کو ایک نو تصنیف مرثیے کی مجلس میں لے گئے، یہ زمانہ، آتش کے بڑھاپے کا تھا، مرثیہ سُن کر کہنے لگے، ''یہ مرثیہ تھا کہ سعد بن لندھور کی داستان'' گویا یہ وہ زمانہ تھا، جب دبیرؔ مرثیہ، نظم کی ہیئت کے نئے تجربوں سے گذر کر، اُس مُستحکم اور مُعیّن ساخت و صنعت کو اپنی پہچان بنا رہا تھا۔ احوال و آثار لکھنؤ کے جاننے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انیسؔ کے مقابلے میں، دبیرؔ نے بطور مرثیہ نگار پہلے اپنی پہچان بنائی، رجب علی بیگ سُرُورؔ نے ''فسانۂ عجائب'' میں غدر سے پہلے، کے لکھنؤ (۱۲۴۰ھ) کے جن نام ور دس بارہ مرثیہ نگاروں کا، وہاں کی مجلسی تہذیب میں، نام واری کا ذکر کیا ہے، اس بیان سے اندازہ کیجیے۔

مرثیہ گو، بےنظیر میاں دلگیرؔ، صاف باطن و نیک ضمیر، خلیقؔ، فصیحؔ، مردِ مسکینؔ بصورتِ گداؔ، بہ طالع سکندر مکر وہاتِ زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا، ناظم خوب دبیرؔ مرغوب کہ جس نے اہل دُوَل کا بارِ احسان کبھی نہ اُٹھایا۔

اندازہ فرمایئے، کیسے کیسے عمدہ خلائق، سن وسال کے اکابرین خلیقؔ، ضمیرؔ اور دلگیرؔ جیسوں کے شانہ بہ شانہ بائیس تیئس سالہ اس نوخیز شاعر کو بامِ شہرت پر کھڑا دِکھانا، اس کی قبولیتِ عامہ کی سند کے سِوا اور کیا ہوگا۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ لکھنؤ میں بطور مرثیہ نگار دبیرؔ نے انیسؔ سے پہلے نام کمایا۔ دبیریوں کے مقابل انیسویؔ کے وجود کا خمیر اُٹھا ہے۔ مرزا صاحب کے جب ان تین مرثیوں نے شہرت پائی انیسیوںؔ نے با قاعدہ غوغہ آرائی کی ایک نئی مہم کا آغاز کر دیا۔ جس کے شور شغب سے لکھنؤ کی مجلسی زندگی جاگ اُٹھی، مضامینِ نو کا نیا بازار لگ گیا، دبیرؔ و انیسؔ اور زیادہ چمک اُٹھے وہ تین مرثیے یہ ہیں۔

ع قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے
ع جب حرم قلعۂ شیریں کے مقابل آئے
ع کِس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

بالخصوص یہ مرثیے آواز کے گویّوں نے گا گا کے غمگساروں کے دل لُوٹ لیے۔

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے — دخترِ فاطمہؑ غیرت سے مُوئی جاتی ہے
روح قالب میں یہ زندان میں گھبراتی ہے — بے حواسی سے ہر اک بار یہ چلّاتی ہے
آسماں دُور زمیں سخت کدھر جاؤں میں
بیبیو مِل کے دعا مانگو کہ مرجاؤں میں

جگہ جگہ اُمراء کے درباری لے کاروں نے اُن کے درباروں میں یہ مرثیہ گا کر، عام عوام تک اس کی بھی دھوم مچادی

جب حرم قلعۂ شیریں کے مقابل آئے — غُل ہوا کعبے سے مولا مع لشکر آئے
بولی شیریں مرے ارمان دلی بر آئے — میرے آقا میرے مولا میرے سرورؑ آئے
جاؤ لوگو میرے مولا کی سواری دیکھو
فضلِ حق ، نورِ خُدا ، قدرتِ باری دیکھو

جن سے روشن ہے مدینہ وہ قمر آتے ہیں — جن کا معدن ہے نجف میں وہ گہر آتے ہیں
جن کا گھر عرش پہ ہے وہ مرے گھر آتے ہیں — یہ خبر اُس کو نہ تھی نیزوں پہ سر آتے ہیں
کہہ رہی تھی کہ چراغِ حرمین آتا ہے
اے مسلمانو! مبارک ہو حسینؑ آتا ہے

اور پھر تحت اللفظ خوانوں نے مرزا صاحب کے اس مرثیے کو بھی بامِ شہرت پر چڑھایا:-

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رن ایک طرف ، چرخِ کہن کانپ رہا ہے

رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے ، حیدرؑ کے پسر کو
جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

بلا شک اِن مرثیوں کا چہرہ الفاظ کی ہنر کاری تصور اور تصویر کی منظر کشی، خیالات کی عمدہ بُنت ، لہجے اور لفظ کے موثر آہنگ کا ایک دل پذیر مرقّع ہے، مگر یہ بھی ایک سچ ہے اِن مرثیوں کے بیان کا یہ پُر وقار حُسین وجمیل چہرہ آگے چل کر اپنے حُسنِ کلام کے خدوخال کی ایسی چمک برقرار نہیں رکھ سکا۔ مرزا دبیرؔ کے ہاں تشکیلِ خیالات کی ایسی تضعیف اور بھی کئی مرثیوں میں نظر آتی ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں دبیرؔ، عربی، فارسی کے منتہی تھے۔ اِن زبانوں کی طرف اُن کی دسترس کا، ایک کامل ثبوت وہ مرثیہ ہے جو ہزار ہا الفاظ پر مشتمل ہے اور غیر منقوط ہے، جہاں انھوں نے اس ہنر کے اظہار میں حائل ہونے والے اپنے منقوطہ تخلّص کو بڑی معنوی خوبی کی صورت، عَطارُدؔ میں تبدیل کیا۔ لفظِ دبیرؔ کی معنوی جہت کے اعتبار سے جس کا کوئی اور بدل ناممکن تھا۔ خیال رہے کہ یہ تخلّص آگے چل کر انھوں نے اپنے فرزند مرزا ہادی کو عطا کر دیا۔ مرزا ہادی حسین عطارؔد کا انتقال عین عالمِ شباب میں ہوا۔

زبان دانی کے اس معجزۂ ہنر میں بیان، منطق، حکمت، ہیئت، نجوم، فقہ، تاریخ وتفسیر کی بہت سی لفظیات ایسی بھی ہیں جن کے دیکھنے کے لیے حلّ غوامض کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ مگر چھپّیتر (۷۶) بند کا یہ مرثیہ ایک کارِ ہُنر ضرور ہے۔ جو اُس دورِ لغت افروز میں، مسابقت کا ایک طریقہ بھی تھا۔ ہر چند کہ ایسی کارفرمائیوں کے ذریعے، کارِ ہُنر کرنے والے کی لفظ آشنائی مہارت ومشقِ سخن کے سِوا، اہلِ نظر کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

جیسا کہ یہاں اِس بند میں نظر آرہا ہے۔

عالم ہوا مدّاح علمدار و علم کا وہ گل اسداللہ کا وہ سرو ارم کا
محرم وہ حرم کا وہ گواہ اہلِ حرم کا رہ رو وہ عدم کا وہ عصا راہِ عدم کا
مہ صدر وہ علم دار کرم اور عطا کا
مطلع وہ علم طالعِ مسعود ہُما کا

(یہ تمام ۷۶ بند دفترِ ماتم میں ملاحظہ کیجئے)

مرزا صاحب نے، کئی اور رباعیاں، قطعات اور اشعار بھی اس صنعتِ لفظی میں کہے ہیں، ایک اور مرثیہ بھی غیر منقوط۔

''ہم طالعِ ہُما مرا وہم رَسا ہوا''

اِن کے نام سے منسوب لکھا چلا آتا ہے، حتیٰ کہ شمس العلما آزاد نے بھی یہی لکھ دیا ہے حالانکہ بعد کی تحقیقات کہتی ہیں، یہ مرثیہ (ہم طالعِ ہُما) اُسی دور کے ایک اَمیر، آغا تقی محمد اخترؔ کا ہے۔

پاکستان، پنجاب یونیورسٹی کے کُلّیہ تحقیق کی نگرانی میں ڈاکٹر مظفّر ملک کا تحقیقی مقالہ، مرزا سلامت علی دبیرؔ کے رثائی سخن پر ایسے کئی نئے

مباحث کے دروازے کھولتا ہے، اُسے بھی دیکھا چاہئے۔ ڈاکٹر مظفّر نے پاکستان کے نَو زائدہ زمانے میں مرزا دبیرؔ پر اپنا پہلا تحقیقی مقالہ (PhD) لکھا۔ اُس میں ایسے کئی نئے حقائق کھل کر پہلی دفعہ ہمارے سامنے آئے۔

مطبع شاہی لکھنؤ نے باہتمام عابد علی خاں، دفترِ ماتم کے عنوان سے مرزا دبیرؔ کا تمام کلام شائع کیا، دو بار والی اشاعت کی جلدیں ہمارے اکثر کتب خانوں میں موجود مل جاتی ہیں۔

مرزا کو ان کے سوانح نگاروں نے بہ ایں اعتبار دبستانِ لکھنؤ کا حقیقی نمائندہ شاعر قرار دیا ہے کہ انھوں نے سات آٹھ برس کی عمر سے لے کر اپنی عمر کے چوہتّر ویں (۷۴) برس تک، اِسی دیار میں گذارے۔

۱۹۷۴ء میں جب تقریباتِ انیسؔ و دبیرؔ اسلام آباد میں منعقد ہوئیں، پہلے دنوں انیسؔ کی، اگلے دنوں دبیرؔ کو یاد کیا گیا ڈاکٹر صفدر حسین نے، ان تقریبات کے حوالے سے اپنے یادگاری مضامین نادراتِ دبیرؔ بھی مُرتب کیے۔ مقالہ نگاروں کی فہرست میں میرا نام بھی تھا۔ تحقیق کے نئے نئے باب پڑھنے کو ملے۔

مجھے یقین آیا کہ میر انیسؔ نے فیض آباد (ایودھیا موجودہ) سے مراجعت لکھنؤ کی طرف اس لیے بھی کی کہ انھوں نے فیض آباد کے ایک امیر زادے نادر مرزا کے ہاں مرزا دبیرؔ کا مرثیہ پہلی بار جب سُنا، اور یہ جانا کہ عمدہ ماحول، مرثیے کی پڑھت کے لیے لکھنؤ ہوگا، جہاں ایسے طرزِ سخن کی پرداخت ہو رہی ہو جس کا مظہر اُنھیں مرزا دبیرؔ کے ہاں نظر آیا۔ تب میر انیسؔ لکھنؤ آ پہنچے۔ مرزا صاحب پہلے ہی سے اس میدان میں ڈنڈ پیل رہے تھے زبان و بیان کے مگدر اُٹھائے، یہ دونوں نیر و تن علی مد کے داؤں کی بھرپور قوت کے ساتھ، ایک دوسرے پر اُچھل اُچھل کر وار کرنے لگے۔

اِدھر سے کہا جاتا۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نَو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خِرمن کے خوشہ چینوں کو
(انیسؔ)

اُدھر سے جواب آتا۔

خلّاقِ مضامیں تو سبھی ہیں لیکن — کُھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں
(دبیرؔ)

وہ فرماتے ہیں:

عالم ہے مُکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے — اس عہد میں سب کچھ ہے پہ انصاف نہیں ہے
(انیسؔ)

یہ جواب دیتے ہیں:-

انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے — دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے
(دبیرؔ)

لیکن باہمی احترامات کا یہ عالم تھا کہ کہیں راہ میں پالکی یا فٹن (میانہ) میں سوار ایک دوسرے کو نظر آجاتے تو سرِ راہ اُتر آتے، علیک سلیک کرتے اور آگے بڑھ جاتے، یہ عمل بالخصوص مرزا صاحب کا، میر انیسؔ کے لیے ایک عام وتیرہ تھا۔ فضل حسین ثابتؔ نے حیاتِ دبیرؔ میں ان دونوں صاحبوں کی باہم محبتوں، احترامات وتکریمات کے بہت سے اور واقعات بھی لکھ دیے ہیں۔ خصوصاً یہ واقعہ کہ جب مرزا دبیرؔ کو رحلتِ انیسؔ کی خبر ملی تو وہ حضرتِ عباسؑ علمدار کے حال کا مرثیہ لکھ رہے تھے، بے چین اُٹھ کھڑے ہوئے، اور فرمایا کہ، یہ مرثیہ شاید میری آخری کاوش ہو۔ اللہ کا کرنا، ایسا ہی ہوا۔ میر انیسؔ کی وفات کا یہ دن تھا، ۲۹ رشوال المکرم ۱۲۹۱ھ۔ ٹھیک تین ماہ گذرے کہ ۲۹ محرم ۱۲۹۶ھ کو مرزا صاحب نے بھی انتقال فرمایا۔

یہ جو سرنامہ شعر اس مضمون کا ہے، دبیرؔ کے فرزند مرزا جعفر اوجؔ کے شاگرد، افضل حسین ثابتؔ کا ہے انھوں نے حیاتِ دبیرؔ لکھی، اس شعر سے انھوں نے سالِ وفات کا استخراج ۱۲۹۲ھ کیا۔ البتہ آسماں کے ایک الفِ ممدودہ کی بجائے دو الف کو قابلِ شمار جانا۔

مرزا صاحب کے شاعرانہ اوصاف کے علاوہ اُن کا ایک بڑا نثری کارنامہ ''ابواب المصائب'' کی تالیف بھی ہے۔ روضہ خوانی ومجلسوں کی ذاکری) کی غرض سے اسے لکھا گیا، عہدِ نصیر الدین حیدر کی تالیف ہے۔ نثر کی عبارتوں میں حسبِ ضرورت اشعار واقوال بھی لکھے گئے ہیں۔ گھریلو مجلسوں میں خواتین اس کو پڑھا کرتیں، بہت مقبول کتاب تھی۔ فضلیؔ کی کربل کتھا، اور حیدری کی گُلِ مغفرت کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

موازنہ انیسؔ ودبیرؔ کرتے ہوئے اس کارنامے کے سبب، میر صاحب کے مقابلے میں مرزا صاحب کا پلّہ اور زیادہ گراں ہوجاتا ہے۔

موزانے سے یاد آیا، مولانا شبلیؔ نے دبیرؔ کے ان امتیازات کا ذکر کرنا بھی، نہ معلوم کیوں مناسب نہ جانا۔

دبیرؔ کا انتقال، میر انیسؔ کی وفات کے تین ماہ ایک دن بعد ہوا۔ لکھنؤ مسلم تہذیب وتمدن کی اُن دِنوں، ایک اُجڑی ہوئی راج دھانی تھی، غزل بطور متحرک صنفِ سخن کے نمایاں نہ تھی۔ مرثیے کو اہلِ ثروت عام عوام نے سینے سے لگا رکھا تھا، مولانا شبلیؔ کو خیال آیا ادب کی دنیا میں نام کمانے اور زیادہ آگے آنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہوگا۔ اُنھوں نے مرثیے کو موضوع بنا کے ''موازنہ انیسؔ ودبیرؔ'' لکھ دیا۔ دبیرؔ کے ساتھ ناانصافی کر بیٹھے کہ اُن دِنوں میر انیسؔ کا شورِ شہرہ زیادہ تھا۔ المیزان کے مصنّف نظیر الحسن فوقؔ لکھنوی نے، اِس موازنے کے جواب میں شبلیؔ کو اُن کی بعض کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی تو وہ بولے مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ اُن دِنوں، جب موازنہ لکھ رہا تھا، دبیرؔ کا سارا کلام میری دسترس میں نہ تھا۔

بلاشبہ میر انیسؔ صناعیِ سخن کے اعتبار سے مرزا صاحب کے مقابلے میں بہت آگے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں جیسا کہ انیسؔ کے مقابل مولانا شبلیؔ نے انہیں دکھایا ہے۔ بہ نظرِ انصاف دیکھئے۔

کلام دبیرؔ اپنی اَن گنت خوبیوں کی ایسی ایسی عبارتوں سے مالا مال ہے کہ اُس دور کے اکابر مرثیہ گویوں کے ہاں بھی وہ ڈھونڈھے سے مل نہ پائیں گی: یہ کہ انھوں نے مرثیے کو مسدس نظم ہونے سے بچایا۔

دبیرؔ نے اپنے رثائی سخن میں رومانیت، رنگ کاری، حُسن وجمال اور خیال کی پیکر نویسی سے کہیں زیادہ الم، درد افروزی اور غم کی تمکنتِ احساس کو فوقیت دی۔ انہی معنوں میں وہ منظرِ فطرت کی نگارشات سے کہیں زیادہ کربلا کے جاں گداز المیے کے مُصوّر کہلائے۔ میر انیسؔ نے بیان زور آوری اور ہنروری کو اپنے مرثیوں میں زیادہ جگہ دی، مرزا دبیرؔ نے حزنیے کو اہلِ نظر سچ ہی کہتے ہیں کہ میر انیسؔ کے ہاں طربیہ سخن کا

زیادہ زورزورہ ہے جبکہ مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں حُزن وملال کی کیفیات زیادہ رچی بسی نظر آتی ہیں رباعیات میں بھی کائناتِ حاضر سے گریز پائی، حیاتِ دائمی کی خیرافروزی کی طلب عبرت آموز کی اور بے ثباتیِ دنیا کے مضامین کی خوش نمائی، حُسنِ بیان کی بھرپور رعنائی کے ساتھ چھلکتی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

جیسا کہ اس رباعی کا مضمون ہے، اِسی مضمون خیال سے آراستہ بیسیوں رباعیاں، دفترِ دبیرؔ میں آپ دیکھ پائیں گے۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر کسی کا کُوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہی وہ رباعی ہے جس کے مصرع میں اُستاد نے جس کی بجائے اِس تجویز کیا تھا، اس تبدیلی کو شاگرد نے کسی طور بھی بطور حُسنِ کلام قبول نہ فرمایا۔ مرزا دبیرؔ فصاحت کے اس ہنر سے بخوبی آشنا تھے، وہ جانتے تھے کونسا لفظ کہاں اور کس طرح رکھا جاتا ہے۔ ''جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے'' والے مرثیے میں مرزا صاحب نے بند کے چوتھے مصرع میں کیا کمال کر دکھایا ہے۔

شیریں اپنے محل میں امام حسینؑ اور انصار واعزا کے انتظار میں تھی مگر اُسے کیا معلوم وہ جسے لشکرِ حسینؑ کے علَم سمجھ رہی ہے، وہ تو انصارِ حسینؑ اور حسینؑ کے سر ہیں جو نیزوں پر چڑھے چلے آتے ہیں۔ وہاں حسینؑ کے درماندہ قافلے کا وہ عالم تھا اور یہاں یہ کیفیت حال تھی۔

شوکتِ آمدِ سادات کا سُن سُن کے بیاں مرد عورت ہوئے قریے سے زیارت کو رواں
اور مدارات کا شیریں نے کیا ، یاں ساماں فرش آنکھوں کا کیا جھاڑ کے پلکوں سے مکاں
ظرف دھو دھو کے رکھے آب و غذا کی خاطر
کھانے تیار کیے آلِؑ عبا کی خاطر

خیال اور الفاظ کی بُنت لہجے اور لفظ کی رشتہ کاری، بیان کا یہ کیا خوب مرقّع ہے۔ محبوبِ تقدس مآب کی آمد آمد کا شور سُن کے پلکوں سے فرش صاف کیا اور آنکھیں بچھا دیں۔

❁❁❁

www.emarsiya.com
دنیا کی سب سے بڑی ڈیجیٹل مرثیہ لائبریری جہاں آپ انیسؔ و دبیرؔ کے مکمل مطبوعہ مراثی کے علاوہ ۳۲۰ مرثیہ نگاروں کے ۴۰۰۰ سے زائد مراثی حاصل کر سکتے ہیں۔ سوزخواں خواتین وحضرات کے لیے بستۂ سوزخوانی کا بھی انتظام ہے۔ اگر آپ مزید مراثی اس ویب سائٹ پر شامل کرنا چاہیں تو اس ای میل پر رابطہ کریں۔
faroghemarsiya@gmail.com

دبیرؔ کی میٹافیزیکل شاعری

عادلؔ مختار

دنیا میں اس وقت ذاتی اور انفرادی تعقّل کی بجائے اشتراکی تعقّل کی بنیاد قائم ہو چکی ہے اور یہ کئی لحاظ سے انسانی تاریخ میں ایک مثبت پیش رفت ہے۔ اس اشتراکی تعقل کے سبب ہم اپنے علاوہ دیگر اقوام وملل سے تعلق رکھنے والے صاحبانِ تخلیق اور صاحبانِ فکر کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے پہلے سے کہیں زیادہ وسیع النظری سے اپنے ادبی سرمائے میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ازسرِ نو جائزہ بھی لے سکتے ہیں کہ جس سے فکر ونظر کے نئے ابواب وا ہو سکتے ہیں۔ اسی خیال کے حامل ہوتے ہوئے جب ہم سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے انگریزی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں چند مخصوص شاعروں میں ایک خاص فکری و ادبی رجحان نظر آتا ہے کہ جس کے سبب ان کی شاعری کو میٹافیزیکل شاعری کا نام دیا گیا۔ یہ نام بنیادی طور پر اس شاعری کی مذمّت کے لیے رکھا گیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس شاعری پر اعتراضات کے نقوش سے ہی اس کی خصوصیات واضح ہوتی گئیں اور پھر اسے ایک قابلِ ذکر مکتب کی حیثیت حاصل ہوئی۔

''دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۱-۴ کے مطالعے کے دوران بہت سے مقامات پر محسوس ہوا کہ دبیرؔ علیہ الرحمہ بھی میٹافیزیکل رویّہ رکھنے والے شاعر ہیں لہٰذا ہمیں میٹافیزیکل شاعری کی خصوصیات اور مرزا دبیرؔ کے مرثیوں سے ان خصوصیات سے معمور مثالوں کو بہت دقّت سے دیکھنا ہوگا، اس سے دبیرؔ کے کلام کی تفہیم اور مثبت تنقید کے لیے نئے راستے متعین ہو سکیں گے اور دبیرؔ پر بعض ایسے اعتراضات کہ جو اس پہلو سے ناواقفیت کی بنا پر وارد ہوئے ہیں ان کے علمی بنیادوں پر جوابات مل سکتے ہیں۔

میٹافیزیکل شاعری سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے کچھ انگریز شاعروں کے ایک خاص رجحان سے وجود میں آنے والا مکتب ہے کہ جسے شاعری کی پہلے سے قائم ٹھوس اور فکری ساخت کی نقل کے طور پر قائم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ جان ڈَن جیسے شاعروں کا تخلیقی اور تجزیاتی سطح کا کام تھا۔ یہ شاعری اپنی کچھ خصوصیات سے شاعری کی عام روش سے ممتاز ہے۔ ان خصوصیات میں سب سے پہلے اس کا مشکل ہونا ہے۔ یہ شاعری، عام طور پر، ایک عام آدمی کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کو بھی بطورِ نظم عموماً مشکل سمجھا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مرزا دبیرؔ ایک مشکل پسند شاعر تھے۔ خلاّقیت، فکرِ ایجاد، قوّتِ متخیّلہ، زبان پر قدرت اور علمِ معقولات ومنقولات کا اظہار مرزا دبیرؔ کے میٹافیزکل رویے کو پروان چڑھاتا ہے اور یہی رویہ انھیں دقّت پسندی میں مصروف رکھتا ہے۔ اور مرزا صاحب کی یہی دقّت پسندی ہے کہ جو ان کے قاری سے ان کے مرثیوں کو دقّت کے ساتھ مطالعہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

نصیرؔ ترابی اعلی اللہ مقامہ اپنے مضمون ''جدید موازنۂ انیسؔ دبیرؔ'' میں مرزا دبیرؔ کے کلام کے حوالے سے جب اپنا مطالعاتی تأثر بیان کرتے ہیں تو مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کے حوالے سے وہ اکتیس خصوصیات میں تفاوت کا ذکر کرتے ہیں اور ان میں دبیرؔ کی مندرجہ ذیل اٹھارہ

خصوصیات خالصتاً میٹافیزیکل شاعر کی خصوصیات ہیں:

عالمانہ تبحر، قصیدہ قبیلہ، غرابتِ لفظی، گراں گوئی، ندرتِ اظہار، جلالیات، فلکیات، تشبیہ شوکت، شدّتاً مبالغہ، تخیلاتی احساس، اشکال و تصنع، وفور، تفصیل، تصور آفرینی، افراط وتفریط، جذباتی پیوندکاری، آیات واحادیث، بیشتر تصرّف، تخلیقاً۔ ذاتی وانفرادی مشقت۔

پہلی ہی خصوصیت کی بات کی جائے تو عالمانہ تبحر کا جو اظہار مرزا دبیرؔ کے ہاں ملتا ہے اردو کے شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ملے۔ ایک معمولی مثال پیشِ خدمت ہے۔

علمِ کلام اور فلسفہ میں وجود وعدم، حدوث وقدم، اور واجب الوجود اور ممکن الوجود کی انتہائی گاڑھی گاڑھی بحثیں موجود ہیں۔ جب تک ان بحثوں سے مکمّل واقفیت نہ ہو انہیں شعر میں ڈھالنا ممکن ہی نہیں اور اس سہولت سے ڈھالنا کہ جس بے تکلفی کے ساتھ مرزا دبیرؔ اپنے مرثیوں میں ان موضوعات کو شامل کرتے ہیں وہ حیران کن ہے۔ یہ مواد ایک طرف دبیر کی اپنی ریاضت پر دال ہے تو دوسری طرف یہ مرثیے کے سامع کے لیے رزقِ فکر کے طور پر بھی باقی رہتا ہے۔ امیر المؤمنینؑ کی مدح میں مرثیہ ''قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا'' کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے۔

قرآن مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا اور عرشِ بریں منبرِ نُہ پایہ ہے کس کا
خورشید جو بے سایہ ہے، یہ سایہ ہے کس کا فیضانِ ازل بحرِ گراں مایہ ہے کس کا
وہ کون سا بندہ ہے جو ہمنامِ خدا ہے ممکن ہے مگر عالمِ امکاں سے جدا ہے

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتّبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۲، ص ۸۱)

ایک عام قاری کے لیے دبیرؔ کا کلام ایک بہت بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ جب تک قاری پر مرزا صاحب کے استعمال کیے گئے صنائع بدائع اور علمِ بیان وبدیع کی دیگر مہارتوں کا انکشاف نہیں ہوگا وہ مرزا صاحب کے فن کی تفہیم کا حق ادا نہیں کر سکے گا جبکہ دبیرؔ کا کلام جو ایک اندازے کے مطابق سوا لاکھ اشعار پر مبنی ہے (بحوالہ دبیرؔ نمبر، مرتبہ ڈاکٹر ہلالؔ نقوی)، اس میں جا بجا صنائع بکھرے ہوئے ہیں وہ چاہے اشتقاق، براعۃ استہلال، جملہ اقسامِ تجنیس، تکریر، ردّالعجز، ترصیع، سیاق الاعداد، تنسیق الصّفات، لزومُ مالا یلزم، منقوط وغیرِ منقوط، سجع، ذوقافیتین اور تضمین ایسے صنائع لفظی ہوں یا ایہام، مراعات النظیر، عکس، رجوع، لف ونشر، جمع، تفریق، تقسیم حسن تعلیل، تاکید المدح بما یشبہ الذّم، استتباع، مبالغہ اور تجرید ایسے صنائع معنوی ہوں۔ (ان تمام مذکورہ صنائع کا ذکر اور مرزا صاحب کے مرثیوں سے مثالیں ''جواہرِ دبیر'' از سید مرتضیٰ حُسین فاضل لکھنوی کے مقدمے میں درج ہیں)

ایک میٹافیزیکل شاعر دو مختلف تصوّرات یا چیزوں کے درمیان موازنہ دکھاتا ہے (جو شاید ایک عام آدمی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا)۔ مدحِ اہلبیتؑ اور ذکرِ مصائب عقیدت کا باب ہے مگر اس میں سیکولر علوم وفنون سے بھی استفادہ کرتے ہوئے مضامین کے انبار لگانا یہ دبیرؔ کی میٹافیزیکل اپروچ پر اک اور دلیل ہے۔

مثال کے طور پر مرثیہ ''اے صبح کیا ہوا کہ ترا جیب چاک ہے'' میں یزید کے سامنے امام مظلومؑ کا سر طشت میں رکھا ہے اور وہ اس سر کے

ساتھ گستاخی میں مصروف ہے۔اب یہ مصائب کے حوالے سے قیامت کا مضمون ہے مگر مرزا دبیرؔ طشت میں رکھے ہوئے سر پر اپنی فنکارانہ اور تجزیاتی نگاہیں جمائے ہوئے خال وخدِ مظلوم کی مدح میں میٹافیزیکل اپروچ کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

ہر چند بند چشمِ خلائق نواز ہے — پر یہ بھی اک کھلا ہوا قدرت کا راز ہے
یعنی کہ دیکھنے سے خدا بے نیاز ہے — اے غافلو مسیح کا یہ خواب ناز ہے
چشم و پلک میں ربط کے عالم کو دیکھنا — عیسیٰؑ کے سر پہ پنجۂ مریمؑ کو دیکھنا

بینی کا قرب دیدۂ حق میں ظہور ہے — یا دوربینِ قدرتِ ربِّ غفور ہے
ہاں راز حق دہانِ امامؑ غیور ہے — اسرارِ کبریا کا تجسّس ضرور ہے
رخسار ہاتھ پر ہیں چراغِ یقیں لیے — مردم دہن کو ڈھونڈتے ہیں دوربیں لیے

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۳، ص۱۰۶)

مرثیہ ''دستِ خدا کا قوّتِ بازو حُسینؑ ہے'' میں مرزا دبیرؔ کربلا میں قافلۂ حُسینیؑ کی آمد پر خیمۂ امامؑ کے نصب کیے جانے کو نظم کرتے ہیں۔اس مقام پر امام حُسین علیہ السلام کے خیمے کو میدانِ کربلا میں تنہائی اور غربت کے استعارے کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا مگر مرزا دبیرؔ نے خیمۂ حُسین علیہ السلام کی مداحی میں استعاروں کا ایک عجب نظام نظم کیا ہے مذکورہ مرثیے کے بند ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸ پیش کیے جا رہے ہیں:

خیمہ تھا یا کہ تاجِ سرِ کربلا تھا وہ — نکہت میں خلد ، اوج میں عرشِ علا تھا وہ
وسعت میں مثلِ دامنِ عفوِ خدا تھا وہ — خاکِ شفا زمیں تھی تو دارالشفا تھا وہ
خیمہ نہ کہیے ، آئے تھے شہؑ قتل ہونے کو — پلّہ زمیں نے منھ پہ لیا تھا وہ رونے کو

مہمان کس زمیں پہ ہوئے تھے شہِؑ زماں — خیمہ تھا اپنی چوب سے انگشت در دہاں
گویا زبانِ چوب سے کرتا تھا وہ بیاں — ظلمِ مزید سے تہ و بالا ہیں دو جہاں
سو بیچ میں زمین و فلک کے پڑا ہوں میں — دیکھو برائے صُلحِ دو عالم کھڑا ہوں میں

اونچا ہوا فلک سے بھی اوجِ خیامِ شاہؑ — خیمے کے دو کلس نظر آتے تھے مہر و ماہ
خیمہ تھا یا قضا و قدر کی تھی بارگاہ — فرش اس کا عرش حاجب و درباں جلال جاہ
زیبِ زمیں جو خیمۂ شبیرؑ ہو گئے — آپس میں فرش و عرش بغل گیر ہو گئے

وہ دیدۂ زمیں تھا و یا خیمۂ حُسینؑ — پلکوں کی طرح گِرد طنابیں بہ زیب و زین
اس چشم کو خدا نے دیا نورِ مشرقین — پتلی تھی اس کی فاطمہؑ زہرا کا نورِ عین

بنیادِ کفر میں خلل اس وقت پڑ گئے ہر جا ستون دین کے میخوں سے گڑ گئے

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ا، ص ۶۴۴)

یہ بند اور خاص طور پر ان کی بیتیں ایک خاص قسم کی تجزیاتی اور فکری مشق کا حاصل بھی ہیں اور اس قسم کی مشق کا اپنے قاری سے تقاضا بھی رکھتی ہے اور میٹافیزیکل شاعری کی ایک اور خصوصیت یہی مشقِ فکری کا تقاضا ہے جو اس شاعری کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہے۔ شاعری کی مذکورہ قسم اپنی نوعیت میں بالعموم فکری ہوتی ہے کیونکہ یہ شاعر کے اپنے تجربات اور جذبات کے تجزیے کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایسا ممکن نظر نہیں آتا کہ کوئی شاعر کسی مکتب یا دبستان کی بنیاد رکھنے والا ہو اور اس نے شاعری میں اپنے ذاتی مطالعہ اور تجربات کے عناصر کا اضافہ نہ کیا ہو۔ مکتبِ دبیر اگر حقیقی مکتب ہے تو یقیناً اس کے لیے دبیرؔ کا ذاتی مشاہدہ، تجربہ، تعقل، عقیدت، اور فہم ہی عمل میں آیا ہے۔ لہٰذا میٹافیزیکل شاعری یا دبیرؔ کی میٹافیزکل عناصر پر مبنی شاعری قاری کو دقّت کی دعوت دیتی ہے اسے بے فکری کی سہولت کا عادی ہرگز نہیں رہنے دیتی۔

مرثیہ ''پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی''، میں علم کے اجزائے ترکیبی کا ذکر کرتے ہوئے جو بند دبیرؔ نے نظم کیے وہ اسی قسم کی مشقِ فکری کا بھرپور اظہار معلوم ہوتے ہیں:

طوبیٰ کی شاخ تیشۂ قدرت نے کی قلم اور نور نخلِ طور بھرا اس میں یک قلم
کی صادقوں کی راستیٔ قول اس میں ضم بے پردہ ہو کے عفو بنی پوششِ علم
جب باندھ کر پھریرے کو سیدھا علم کیا صانع نے پردے میں یدِ طوبیٰ علم کیا

دامن ہے کبریا کا سرا پردۂ جلال ماہی مراتب اس سے ہے شاہوں کا پائمال
بپھرا ہوا ہے شیر پھریرے کا بے جدال شیر فلک کو دیکھ کے ہوتا ہے لال لال
روباہ شام کانپتے ہیں اس کی شان سے بو آ رہی ہے شیر خدا کی نشان سے

نور خدا سے قالبِ خیر الاممؐ بنا سایہ نبیؐ کا ہو کے مجسّم علم بنا
واں ابر چترِ فرقِ نبیؐ ہر قدم بنا یاں پوشش علم وہ سحابِ کرم بنا
دامن اڑا تو چرخ پہ یہ غلغلہ ہوا دیکھو خدا کے فیض کا چشمہ کھلا ہوا

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۳، ص ۵۹، ۶۰)

اس کے بعد ایک نہایت اہم خصوصیت جذبات اور عقل کا امتزاج ہے یعنی میٹافیزیکل شاعری فکری کے ساتھ ساتھ جذباتی خیالات اور احساسات دونوں کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا، یہ دماغ اور دل کے بیک وقت استعمال سے وجود میں آنے والی شاعری ہے۔ ایک خصوصیت کہ جو میٹافیزیکل شاعری کا طرۂ امتیاز کہلا سکتی ہے وہ دوراز کار تشبیہات اور استعارات کا استعمال ہے۔ بعید استعارات اور موازنہ میٹافیزیکل شاعری کی روح ہیں اور دبیرؔ نے بالارادہ دوراز کار استعارات اور تشبیہات کا استعمال کر کے مرثیے ایسی مذہبی نظم کو ادب کے مزید قریب کرنے کی

بھرپور کوشش کی ہے۔

مرثیہ ''اے طبعِ رواں! سیفِ قلم جلد علم کر'' میں علمدارِ کربلا کی میدانِ وغا میں آمد کے ساتھ عالم پر جو ہیبت طاری ہے دبیرؔ اسے نظم کرتے ہیں:

موجوں سے قدِ بحر ہوا صورتِ محراب طاؤس سحر ڈر کے بنا کرمکِ شب تاب
ٹوٹا کفِ دریا میں ہر اک کاسۂ گرداب اور دیدۂ مخمل کو فراموش ہوا خواب
دُر چشمِ صدف میں ہمہ تن اشک ہوا ہے سیمرغ سمٹ کر پرِ کنجشک ہوا ہے

مزید فرماتے ہیں:

دہشت سے کیا کفر نے اسلام کا آداب الماس کی سوزن ہوئی مخمل کی رگ خواب
موجوں کی طرح نعل در آتش ہوئے گرداب دیوار کے پاؤں پہ گرا دوڑ کے سیلاب
کانٹے تھے تپِ خوف سے بجلی کی زباں میں زنجیر ہوا تھی قدمِ ریگِ رواں میں

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۴، ص ۱۰۶، ۱۰۵)

اس بات کا اعتراف تو خود شبلیؔ نعمانی بھی کرتے ہیں کہ دبیرؔ اس قدر دور کے استعارات ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں ان کے حریفوں کا طائرِ وہم پرواز نہیں کر سکتا۔ مگر اسی صفت کو علّامہ جمیلؔ مظہری ایک نقص گردانتے ہوئے کہتے ہیں کہ مفروضات کے چکر میں پڑ کر تشبیہ کی بے اعتدالی نے دبیرؔ کے یہاں پستیوں کو چھو لیا ہے جب کہ علامہ جس چیز کو پستی قرار دے رہے ہیں وہی دبیرؔ کا کمالِ فن ہے کہ جو ان کے میٹافیزیکل رویّے سے پیدا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ یہ شاعری ایک لحاظ سے استدلال پر مبنی ہے کیونکہ یہ خیالات کے لطیف ارتقاء کا ایک جرأت مندانہ مظاہرہ ہے۔ ایک میٹافیزیکل شاعر اپنے خیالات کے ناقابل شناخت ارتقاء کو ثابت کرنے کے لیے کسی وکیل کی طرح دلائل دیتا ہے۔

مرثیہ ''درپیش جسے ماتمِ فرزندِ جواں ہو'' میں حضرت علی اکبرؑ کا سراپا کہنا ہے دبیرؔ کو مگر ان کے پیشِ نظر ایک قدیم اور مشہور فتوی بھی ہے کہ تصویر کا بنانا حرام ہے مگر تصویرِ حضرت علی اکبر تو دکھانا ہے کہ اس کے بغیر سراپا مکمل کیسے ہو تو اس مقام پر حکمِ شرع کا پاس رکھتے ہوے دبیرؔ ایک راہ نکالتے ہیں اور جرح سمیٹتے ہیں:

صورت گرِ رخسارہ و الفاظ و معانی لکھتا ہے اب اکبرؑ کا سراپائے جوانی
نازک بدنی سرو قدی غنچہ دہانی افسردہ دلی خستہ تنی تشنہ دہانی
ترکیبِ بدن لکھیے جو سامان رقم ہو انگشت و کفِ روحؑ امیں لوح و قلم ہو

ممنوع ہے گر شرع میں تصویر کی تحریر مشروع ہے یہ شکل پئے صفحۂ تقریر
محشر میں شفاعت کی ہے صورت یہی تصویر کس شکل کو دکھلاؤں میں اس شکل کی تنویر

ظاہر میں تو یہ نقش مرادِ دو سرا ہے شبّیرؑ کی آنکھوں سے اسے دیکھیے کیا ہے

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ا، ص ۶۷۰، ۶۷۱)

اس کے علاوہ میٹافیزیکل شاعری اپنی منفرد امیجز سے واضح ہوتی ہے۔ ان میں امیجز زیادہ تر متضاد ہیں یا موازنہ میں کوئی ظاہری مشابہت نہیں رکھتی ہیں لیکن یہ میٹافیزیکل شاعروں کا انداز ہے جو غیر متعلقہ امیجز کے درمیان تعلق جوڑتا ہے۔

مرثیہ ''جب غنچۂ خورشید کھلا باغِ سحر میں'' سب سے پہلے تو اس مرثیے کا عنوان ہی ایک میٹافیزیکل امیج پیش کر رہا ہے پھر خیموں سے رخصتِ آخر کے بعد امام حُسین علیہ السلام جب میدان کی طرف جا رہے ہین تو اس مقام پر بھی سراپا کے بند میں دبیرؔ اپنی میٹافیزیکل اپروچ کو خوب ظاہر کرتے ہیں:

یوں ابنِ علیؑ خیمے سے میداں کو رواں ہے رگ رگ سے ہنر صانعِ قدرت کا عیاں ہے
اور خودِ سیہ میں سرِ پُر نور نہاں ہے خورشیدِ قیامت کا زحل سے یہ قراں ہے
شبیرؑ کو شاہِ شہدا حق نے کیا ہے یہ خود نہیں تاج شہادت کا دیا ہے

کیا خوب زرہ ہے تنِ پرنور پہ زیبا نرگس کا چمن ہے چمنِ حسن پہ پھولا
یا خلد کے خوش چشم بصد شوق و تمنّا نزدیک سے کرتے ہیں تنِ شہؑ کا نظارا
ہر حلقۂ جوشن سے یہ اسرار عیاں ہیں حُوریں تو نہیں شاہؑ کی خاطر نگراں ہیں

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۴، ص ۴۶۰)

ڈاکٹر جانسن نے میٹافزیکل شعراء پر جو الزامات لگائے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ میٹافزیکل شعراء میں اپنی علمیت کی نمائش کا جذبہ معجزن ہے جس کی بنا پر وہ ہر قسم کے مخفی علم سے اپنی نظموں کا تانا بانا بنتے رہتے ہیں اور خود محظوظ ہوتے ہیں ان کے اندر خلاق اور جاذبِ توجہ ہونے کی خواہش ضرورت سے زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایسے حقائق اور خیالات اکٹھے نظر آتے ہیں جو بے جوڑ ہیں اور نتیجتاً غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ذوق سلیم کو بدظن اور برگشتہ کر دینے والے مبالغے بھی کم نہیں وہ جذبے پر ندرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسی بات کہیں جو غالباً کسی نے نہیں کہی۔

یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ وہ اعتراضات جو سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی انگریزی میٹافیزیکل شاعری پر کیے گئے تقریباً اسی قسم کے اعتراضات بعد میں دبیرؔ کی شاعری پر بھی وارد ہوئے اور ایسا ظاہر ہے اس لیے ہوا کیونکہ مجتمع العلوم وفنون ہونے کے باعث دبیرؔ بہت سے مقامات پر ایک میٹافیزیکل شاعر کے طور دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ان کی فنکارانہ عظمت تھی مگر ہوا یہ کہ اس قسم کے شعری رویے کی شناخت اور تفہیم نہ ہونے کے باعث بعض اوقات مرزا صاحب کی اسی عظمت پر مبنی کام کو ہی موردِ اعتراض گردانا گیا۔

مثال کے طور پر مرزا دبیرؔ صاحب پر علامہ جمیلؔ مظہری کا ایک اعتراض، ہلالؔ صاحب نے ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' کے صفحہ ۳۸۸

پر نقل کیا ہے۔علامہ فرماتے ہیں:

''مفروضات کے چکر میں پڑھ کر تشبیہ کی بے اعتدالی کس پستی تک پہنچ سکتی ہے اس کا اندازہ مرزا دبیرؔ جیسے عظیم فنکار کی اس تخیل آفرینی سے کیا جا سکتا ہے جس میں وہ اپنے ہیرو کی تلوار کی عالم آشوبی دکھلاتے ہوئے مفروضات کا ایک سلسلہ شروع کر دیتے ہیں تلوار کی باڑھ میں جو چمک ہوتی ہے پہلے اس کو پانی فرض کرتے ہیں اور جب اثنائے جنگ میں وہ پانی بکثرت تلوار سے زمین پر گرتا ہے تو پھر دوسرا مفروضہ بقول ان کے یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی طرح

''ہوا رطوبتِ اطراف سے زمیں کو زکام''

اور ظاہر ہے کہ جب زکام ہوا تو چھینکوں کا آنا لازمی ہے اور جب زمین کو چھینکیں آنے لگیں تو کیا نتیجہ برآمد ہوا اس کو مرزا صاحب کی زبان سے سنیے

دماغِ خاک پہ نزلہ بصد وفور گرا کیا جو عطیہ تو قاروں اُچھل کے دور گرا

مبالغہ بھی شاعری کے لیے ایک سنگار ہے لیکن اس کے لیے بھی ایک سلیقہ چاہیے۔''

یہ اعتراض بجا ہے مگر اُس وقت کہ جب ہم دبیرؔ کو میٹافیزیکل اپروچ رکھنے والا شاعر نہ جانیں۔مگر جب ہمارے پیشِ نظر دبیر کی مذکورہ اپروچ ہوگی تو یہ مضمون ہمیں کچھ ایسا مذموم بھی نظر نہیں آئے گا۔اور کس قدر آسان ہے اس بیت سے حظ اٹھانا کہ قارون جیسے متکبر اور سرکش کردار کے ساتھ شعری پیرائے میں کس قدر ذلّت آمیز سلوک کیا گیا ہے جو کہ اس کردار کے حوالے سے بجا ہے۔وہ کراہت کہ ذکرِ قاروں جس کا متقاضی ہے وہ اس مفروضے سے پیدا ہو رہی ہے۔لہٰذا یہ بیت لطف سے خالی نہیں اگر دقت کی جائے۔

مبالغہ تو شاعری میں اغراق کی حد تک بھی جائز ہے۔ہاں سامع کا ذوق اور شاعر کا ذوق ہم آہنگ ہونے کی حد تک قریب ہوں۔لہٰذا سامع کے ذوق کی تہذیب، دبیر کے حوالے سے اس وقت ہو سکتی ہے جب اس کے سامنے دیگر امور کے ساتھ ساتھ میٹافیزیکل شاعری کے مسائل اور خصوصیات بھی ہوں۔

اگرچہ میٹافیزیکل شاعری کا مکتب واضح امتیازات رکھتا تھا اور وہ امتیازات معیاری اور مثبت نقد و بصر کے متقاضی تھے مگر اس کے وجود میں آنے سے لیکر بیسویں صدی تک اسے وہ پذیرائی، توجہ، تفہیم اور مثبت تنقید نہ مل سکی کہ یہ مکتبِ شعر جس حق رکھتا تھا۔مگر بیسویں صدی میں ٹی ایس ایلیٹ ایسے نقاد نے اس شاعری کی امتیازی خصوصیات پر قلم اٹھا کر اس کی تفہیم کے باب کو وا کیا۔ایلیٹ کے نزدیک سترھویں صدی کے میٹافیزیکل شعراء کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے خیال کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان کا خیال ان کے تجربے میں اس طرح ڈھل جاتا تھا جیسے وہ کوئی احساس ہو اور وہ اپنے خیال کو یا اس سے حاصل ہونے والے تجربے کو انتہائی شدّت کے ساتھ محسوس کرتے تھے اور پھر اسی شدّت کا اظہار کلام میں بھی کیا کرتے تھے۔

میٹافیزیکل شعرا پر ایک اعتراض یہ تھا کہ ان کے یہاں حد درجہ مختلف الاوضاع خیالات کو زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے غالباً اسی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ایلیٹ نے لکھا تھا کہ جب کسی شاعر کا ذہن کارِ تخلیق کے لیے مکمل طور پر ضروری ساز و سامان کے لیے

آراستہ ہوجاتا ہے تو وہ مختلف الانواع تجربوں کو برابر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ومخلوط کرتا رہتا ہے۔اس کیفیت کی دبیر کے ہاں ایک مثال سے وضاحت کرنا چاہوں گا۔

مرثیہ درحال جنابِ مسلم ابن عقیلؑ ''کوفے میں بہار آئی جو گلگشت چمن کو'' کا بند ملاحظہ فرمائیں کہ جس میں مظاہرِ قدرت کا حُسن کوفے کے حالات سے اس طرح جوڑا گیا ہے کہ پہلی نظر میں قاری یا سامع کے لیے ردّعمل کی نوعیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے

لشکر وہ درختوں کا وہ شاخوں کی سنانیں چم خم وہ کہ دم بھرتی تھیں تیغوں کی زبانیں
نہروں سے حریفوں کی نکلنے لگی جانیں موجیں تھی کہیں تیر کہیں کھنچ کے کمانیں
سنبل نے بنانے کو زرہ باغ کی پائی لالے کے رسالے نے سپر داغ کی پائی

(جواہرِ دبیرؔ،ص ۶۰ تحقیق وترتیب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۲، ص ۵۶۳)

جس قسم کے اعتراضات میٹافزیکل شاعروں پر وارد ہوئے اسی قسم کے بہت سے اعتراضات بعد میں مرزا دبیرؔ پر بھی وارد ہوئے لہٰذا جہاں تک اعتراضات کے موضوعات میں اتحاد رہے وہاں تک جو جوابات بیسویں صدی کے نقادوں خاص طور پر ٹی ایس ایلیٹ نے میٹافزیکل شاعروں کے دفاع میں دیے اسی سطح کے جوابات مرزا دبیرؔ کے دفاع میں بھی دیے جاسکتے ہیں۔مرزا صاحب کی ذہانت اور جذبے کو مربوط کرنے کی صلاحیت جب ہم پہ واضح ہوتی ہے تو پھر یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ خیالات جس قدر بلند اور عالمانہ ہیں اسی قدر حُسن اور جذبات کی شدّت کہیں زیادہ ان کی شاعری میں نظر آنے لگتی ہے۔

اب اس مقام پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی اصولوں سے متصادم نہ ہوں تو مرزا صاحب کے میٹافیزیکل تجربات پر مبنی وہ تمام صنائع بدائع اور علمِ بیان کے جواہرات جو مدح اہلبیتؑ میں یا مصائب میں ہمیں نظر آتے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا کہ ان میں بعض تو مرثیہ (بطورِ آرٹ) کے لیے مناسب ہیں اور بعض مناسب نہیں ہیں تو یہ کہنا اس قدر آسان نہ ہوگا۔وہ اس لیے کہ آرٹ کے دائرۂ کار میں کسی بھی تجربے کے مختلف الانواع عناصر کو دلچسپ اور معنی خیز اثر کے ساتھ ملا کر پیش کیا جاسکتا ہے۔

میٹافیزیکل ایک مخصوص اسلوب کا نام ہے جس میں شاعر چیزوں کے درمیان جو رشتہ محسوس کرتا ہے وہ حواسی اور جذباتی سے زیادہ فکری اور ذہنی ہوتا ہے کہ جس سے شاعری میں مجرد کو محسوس کے ساتھ بعید کو قریب کے ساتھ اور وقیع کو غیر وقیع کے ساتھ مربوط کردیا جاتا ہے۔

میٹافزیکل شاعری کے استعارات اور تشبیہات ٹھوس قسم کے ہوتے ہیں اور وہ مختلف علوم وفنون کے مواد سے ماخوذ ہوسکتے ہیں مثلاً علم ہندسہ، علم نجوم، علم فلکیات، علم جغرافیہ علم الٰہیات، فلسفہ وسائنس وغیرہ۔وہ اس لیے کہ ہر فن اور علم اپنا اظہار چاہتا ہے اور جس مقابلے اور موازنے کی فضا میں مرزا صاحب نے اپنے سفرِ فن آغاز کیا اس میں اپنے تمام تر علوم وفنون کا اظہار لازمی تھا کہ جس کے سبب دبیر نے اپنی صلاحیتوں کے سب سے روشن تمام رنگ مرثیوں میں کھپا دیے ہیں۔

مرثیہ ''آمد ہے بادشاہ فلک بارگاہ کی'' میں بند ۴ سے ۱۰ تک مرزا دبیرؔ نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ تفسیرِ قرآن، ضمنیات، اساطیر، تاریخ، فلکیات، عدالتِ اجتماعی، علمِ کلام سے مربوط مسائلِ معاش ومعاد اور ضرورتِ حجّت اور کتابیات سے جڑے ہوئے مضامین کو امام

حُسینؑ کی مدح میں ایک کے بعد بند میں قلم بند کیا ہے۔ اک تسلسل میں مختلف علوم سے بلا تکلف استفادہ مرزا دبیر کا میٹا فیزیکل رویّہ ہے جس پر اہلِ نقد و بصر تحسین اور عوام داد نچھاور کرتے ہیں۔

دل سے سکندر آئینہ دارِ حضور ہے ذوالکفل اک نقیبِ امامؑ غیور ہے
موسیٰؑ کے پیشِ چشم تجلّیِ طور ہے عیسیٰؑ بپاسِ حکم سواری سے دور ہے
یہ نقشِ نو نگینِ سلیمانؑ پہ کندہ ہے ہر بندہ اب حسینؑ کے احساں کا بندہ ہے

خاقاں کے تن پہ جوشنِ چینی شکستہ حال قیصر کے سر پر مغفرِ رومی ہے اب وبال
دستِ کمالِ رستم دستاں ہے بے کمال فرقِ عروجِ زالِ نریماں ہے پائمال
حاتم گدائے جودِ شہِؑ مشرقین ہے نوشیرواں بھی نائبِ عدلِ حسینؑ ہے

فرطِ ادب سے شحنۂ گردوں پیادہ ہے خوفِ ادب سے دور زُحل ایستادہ ہے
سکتے میں مثلِ خامہ عطارد فتادہ ہے انشا سے لوحِ ابجدِ ایجاد سادہ ہے
ہر کام پر قضا و قدر جو دلیر ہیں یہ ابن شیرِ حق کے اشارے سے شیر ہیں

شوکت کا جو فلک کی بلندی پہ ہے عتاب لاتا ہے وہ سند کے ہوں بے چوبۂ جناب
طلعت ہے مبطلِ شرفِ ماہ و آفتاب پر مہر و ماہ فخر سے دیتے ہیں یہ جواب
بے جا نہیں کلاہِ سرِ آسماں ہیں ہم نعلینِ پائے خسروِ کون و مکاں ہیں ہم

زنجیر پائے ظلم ہے ،انصاف حق پسند اک گھاٹ پانی پیتے ہیں اب گرگ و گوسفند
فتنہ کا تیغ قہر سے ٹکڑے ہے بند بند بیداد کی زبان سے فریاد ہے بلند
ہر دل پہ سکّہ رعبِ شہِؑ دو جہاں کا ہے شور الغیاث و الحذر و الاماں کا ہے

عقبیٰ پہ چشمِ مہر ہے دنیا پہ چشمِ قہر دوراں سے ہے محاسبۂ جمع و خرچِ دہر
جنّت محب کا گھر ہے جہنم عدو کا شہر کوثر ہے قند شیعوں کو اور دشمنوں کو زہر
تقدیر سے حساب طلب ہے کہ کیا کِیا کہتی ہے وہ ، حسینؑ نے جو کچھ کہا ، کِیا

بخشا ہے مصحفِ رُخِ روشن نے نورِ حق دیتے ہیں ذرّے شمس کو شمسیّہ کا سبق
صحرا شمیمِ تن سے ہے فردوس کا طبق پڑھتا ہے خار خار گلستاں ورق ورق

سایہ زمین پر ہے کہ سایہ ہے طور کا سرمہ ہے طور کا کہ یہ معدن ہے نور کا

(دبیرؔ کے مرثیے، مرتبہ اصغر مہدی اشعر جلد ۲، ص ۶۴۳-۶۴۴)

بیسویں صدی اور جدید مرثیہ کے صفحہ ۶۵ پر ہلالؔ صاحب لکھتے ہیں:

''دفتر ماتم کی ۲۰ جلدیں دیکھنے کے بعد دبیرؔ کے جس رنگِ سخن کی تصویر سامنے آتی ہے اس میں قوتِ متخیلہ کا شکوہ بھی ہے خیال آفرینی کا جوہر بھی، استعارات وتشبیہات میں ندرتِ تراکیب میں جدّت اور مبالغے میں شدت بھی صنائع بدائع کی کثرت بھی ہے اور مصائب کو تفصیل سے بیان کرنے کا رجحان بھی، واقعات کے بیان میں جزئیات نگاری بھی ان کے مرثیوں میں جگہ جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ حدیثوں اور روایتوں کے انبار بھی ہیں اپنے متقدمین مرثیہ گو شعراء کے مقابلے میں ان کا یہی طرز جدید ہے جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے دبیرؔ کے فن مرثیہ گوئی کا کلیدی پہلو ان کا جذبہ ایجاد واختراع ہے ایجاد واختراع کی یہ روان کے تقریباً ہر مرثیے میں نظر آتی ہے

ہلالؔ صاحب کے بیان کی روشنی میں ہمیں اردو شاعری کے اس عظیم میٹافیزکل شاعر کا فن کچھ اور بھی نکھرا ہوا نظر آئے گا اگر ہمارے پیشِ نظر شاعری مذکورہ مکتب کے ابعاد روشن ہوں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر ہلالؔ صاحب دبیرؔ پر اعتراضات کے حوالے سے بہت سی بحثوں کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں ''دبیرؔ کی شاعری متاثر کم کرتی ہے مرعوب زیادہ کرتی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کی بات معیار پر قائم ہے اور اس سے ہمارے دعوے کو مزید تقویت پہنچتی ہے کیونکہ میٹافیزیکل شاعری بذاتِ خود اپنے قارئین کو مرعوب کرنا چاہتی ہے۔ یہ اس شاعری کا مزاج ہے بلکہ یہ اس دور کا بھی مزاج ہے کہ جس میں دبیرؔ کی شاعری سطحِ تخلیق پر ابھر کر منازل نشر واشاعت طے کر رہی تھی لہٰذا دبیرؔ ہمیں مرعوب کرنے میں اگر کامیاب ہوئے ہیں تو یہ ان کے نکتۂ نظر اور مقصود کی کامیابی ہے۔

❁❁❁❁

اشاریۂ دبیرؔ

زیرِ طبع

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

ابرؔ جون پوری

کے مرثیے

زیرِ طبع

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ مونسؔ

زیرِ طبع

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

کاظمؔ علی خاں کی ''تلاشِ دبیرؔ''

پروفیسر عباس رضانیرؔ

ہمارے مضمون کی سرخی اپنے اندر دو موضوعات رکھتی ہے یعنی ہمارا مقصد ایک تو بہ حیثیت دبیرؔ شناس کاظم علی خاں کی بے لوث تحقیقی و تنقیدی خدمات کا جائزہ اور دوسرے خود مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مجموعی ادبی خدمات کی تعبیر و تفہیم اور تعیُّن قدر ہے۔

ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اردو کے نظم و نثر کے ادب پاروں پر مختلف موضوعات اور مختلف حوالوں سے تحقیقی و تنقیدی کام کیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تحقیق کے بڑھے ہوئے رجحان اور مصروفیات کے سبب ان کے اندر موجود نقاد کو بہت کھل کر اپنے پر و بال کھولنے کا موقع نہیں حاصل ہو سکا۔ لیکن تحقیق کی دنیا میں انہوں نے مسلسل اور بے تحاشا کام کیے۔ دہلی اور لکھنؤ کے نمائندہ وقدیم شعرا و ادباء کے ساتھ مخصوص طور پر انیسؔ و دبیرؔ ان کی دلچسپی کے خاص موضوع تھے۔ موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ پر ان کا تجزیاتی مطالعہ ''ردالموازنہ'' اور ''المیزان'' کے بعد تحقیق و تنقید کے نئے دروازے کھولتا ہے۔ آغا حجّو شرفؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، خطوطِ غالبؔ، منشی نول کشور کے چھاپہ خانے، ''امراؤ جان ادا'' اور باغ و بہار کے تجزیے کے علاوہ غالبؔ اور دبیرؔ کے متن اور توقیت کی تحقیق میں وہ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی تسامح پر بھی کسی سے مرعوب ہوئے بغیر وہ بہت کھل کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔

میر انیسؔ کا سنہ ولادت ۱۸۰۲ء ہے اور مرزا دبیرؔ کا ۱۸۰۳ء۔ اسی طرح میر انیسؔ کی وفات ۱۸۷۴ء میں ہوئی اور مرزا دبیرؔ کی ۱۸۷۵ء میں۔ اس طرح دونوں مرثیہ گو شاعروں کو شہیدانِ کربلا کی مداحی کے طفیل میں بہتر ۷۲ رسال کی زندگیاں عطا ہوئیں۔ یعنی اب ۲۰۴۵ء۔ ۲۰۲۴ء میں دونوں بزرگوں کے انتقال کو ۱۵۰ برس پورے ہو رہے ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ دونوں بڑے شعرا کی تعیُّنِ قدر کا سلسلہ ہی تقابلی تنقید سے شروع ہوا تھا۔ اس ذیل میں علامہ شبلیؔ نعمانی کی کتاب ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' کو خشتِ اول کی حیثیت حاصل ہے۔ موازنے کی اشاعت ۱۹۰۷ء میں ہوئی تھی یعنی یہ کتاب بھی ایک سو سترہ سال پرانی ہو چکی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی عجیب ہے کہ تحقیق و تنقید کی دنیا میں کسی محقق یا نقاد کا کوئی قول حرفِ آخر نہیں ہوتا لیکن انیسؔ و دبیرؔ کے سلسلے میں موازنے کے اعتراف و اختلاف کی طویل ترین بحثوں کے باوجود آج بھی انیسؔ و دبیرؔ پر محاکموں کا سلسلہ اسی موازنے کے اردگرد گھومتا رہتا ہے۔

۱۹۷۹ء میں ڈیمائی سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل نامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہونے والی کاظم علی خاں کی ''تلاشِ دبیرؔ'' سے وضاحت ہوتی ہے شبلی نعمانی کی ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' انیسؔ و دبیرؔ کی تعبیر و تفہیم کے سلسلے میں نقشِ اول تو ہو سکتا ہے لیکن ان دونوں اکابرین کی تعیینِ قدر کے حوالے سے صرف موازنے پر اکتفا کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ خاص طور سے تلاشِ دبیرؔ کے سلسلے میں اور بھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ حالانکہ تلاشِ دبیرؔ کے سلسلے میں کاظم علی خاں سے پہلے بھی کئی کتابیں تصنیف کی گئیں اور بعد میں بھی۔ موازنے کے جواب اور جواب الجواب کے علاوہ دبیرؔ

شناسی کے حوالے سے افضل حسین ثابتؔ کی کتاب ''حیاتِ دبیرؔ'' کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔اس کتاب میں نہ صرف یہ کہ مرزا دبیرؔ کی سوانح پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ان کی شاعری کے بہت سے ایسے امتیازات روشن کئے گئے ہیں جن کی جانب ابھی تک ناقدینِ ادب نے توجہ نہیں کی تھی۔اس سلسلے میں دوسری اہم کتاب ذاکر حسین فاروقی کی ''دبستانِ دبیرؔ'' کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس کتاب کو مرزا دبیرؔ کے بلا واسطہ اور بالواسطہ شاگردوں کا محض تذکرہ کہہ کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ کتاب کی ابتدا میں مرثیے اور دبیرؔ پر قائم کی گئی بحث دبیرؔ شناسی کی نئی راہیں کھولتی ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری کی دو کتابیں ''شاعرِ اعظم مرزا سلامت علی دبیرؔ'' اور ''باقیاتِ دبیرؔ'' بھی اس سلسلے میں کئی نئے زاویئے روشن کرتی ہیں لیکن ان دونوں کتابوں میں افضل حسین ثابتؔ کی ''حیاتِ دبیرؔ'' کے بعض مباحث کی تکرار بھی ہو گئی ہے۔لکھنؤ چونکہ ادبی معرکوں کا شہر ہے چنانچہ انشاؔ و مصحفیؔ اور انیسؔ و دبیرؔ کے تقابلی مطالعے کی شاندار روایتوں کی اس توسیع میں اکبر حیدری اور کاظم علی خاں کی تکرار اور ٹکرار بھی نہایت دلچسپ رہی ہے۔جس کے کچھ کچھ نقوش ہم جیسے مرثیے کے طالبِ علموں کے ذہن میں ابھی تک محفوظ ہیں۔

''دبیرؔ شناسی'' کے حوالے سے محمد زماں آزردہؔ کی کتاب ''مرزا سلامت علی دبیرؔ'' کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔آزردہ صاحب نے جدید تحقیقی وسائل کو کام میں لاتے ہوئے مرزا دبیرؔ کے کئی گمنام اور غیر مطبوعہ نگارشات کو پہلی بار اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔

ایس۔ایم۔صدیقی نے اپنی کتاب ''مرزا دبیرؔ کی مرثیہ گوئی'' میں مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری پر تفصیل سے بحث کی ہے۔لیکن یہ کتاب بھی مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری تک محدود ہے۔

سرفراز حسین خبیرؔ کی ''رزم نامۂ دبیرؔ''، ''سبعِ مثانی'' اور ''رباعیاتِ دبیرؔ'' ڈاکٹر صفدر حسین کی ''نادراتِ دبیرؔ'' وغیرہ کے علاوہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی سات کتابیں (۱) مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ (۲) سلکِ سلامِ دبیرؔ (۳) رباعیاتِ دبیرؔ (۴) طالعِ مہر غیر منقوط کلام (۵) مثنویاتِ دبیرؔ (۶) ابواب المصائب (۷) مصحفِ فارسی جیسی کتابیں بھی دبیرؔ شناسی کے ذخیرے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر کاظم علی خاں کی کتاب 'تلاشِ دبیرؔ' مرزا دبیرؔ کی شخصیت اور فن پر مختلف موقعوں پر لکھے جانے والے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے۔لیکن محض مجموعۂ مضامین نہیں ہے۔کتاب کے بعض مضامین تو واقعی تلاشِ دبیرؔ کے بالکل نئے مباحث قائم کرتے ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون ''مرزا دبیرؔ کے مجموعۂ کلام دفترِ ماتم کی بیس جلدیں'' مضمون میں نہایت دقتِ نظر کے ساتھ تحقیق کی مشکل ترین وادیوں میں خاک چھاننے کے بعد یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اب تک مرزا دبیرؔ کے غیر مطبوعہ کلام کے نام پر جو کچھ رسالوں میں شائع کیا جا رہا ہے وہ کہیں نہ کہیں دفترِ ماتم کی جلدوں میں محفوظ ہے۔بعض مرثیوں کے صرف مطلعے بدل دیے گئے ہیں یا یہ کہ وہ مرثیہ مطلعِ اول کے بجائے ضمنی مطلعے سے شروع ہو گیا ہے۔البتہ کاظم علی خاں نے بعض ایسے مرثیوں کی بھی نشاندہی کی ہے جنہیں مرزا دبیرؔ کا واقعی غیر مطبوعہ کلام کہا جا سکتا ہے۔بہر حال ہمیں تو اس موقع پر مہذبؔ لکھنوی کا مصرعہ یاد آ رہا ہے، ''بیس جلدوں سے سوا گھر میں ابھی ہے موجود۔''

کتاب کا دوسرا مضمون ہے ''مراثیِ دبیرؔ'' میں تکرار کی مثالیں۔اس مضمون میں ''دفترِ ماتم'' کی بیس جلدوں میں ڈاکٹر اکبر حیدری کے ذریعے شمار کی گئی مرثیوں کی تعداد ۳۶۰ کی تردید کی گئی ہے۔اور ۱۴۴ ایسے مرثیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے مقطعے دفترِ ماتم میں شامل دوسرے مرثیوں میں موجود ہیں۔مثلاً دفترِ ماتم جلد آٹھ میں شامل مرثیہ، ''کربلا میں جو ستم سبطِ نبیؐ پر گزرے'' اور جلد دس میں شامل مرثیہ،

''آج آفاق سے حیدرؑ کا نشاں اٹھتا ہے'' دونوں کا مقطع ایک ہی ہے؛ ''بس دبیرؔ اب نہیں کہنے کا مجھے ہوش وحواس۔'' یا یہ کہ جلد چھ میں ہی دو مرثیے ہیں، ''ملتا ہے مزہ روح کو حیدرؑ کی ثنا سے'' اور ''اے مومنو کیا رتبۂ ماہِ رمضاں ہے۔'' دونوں مرثیوں میں متعدد بند مشترک ہیں۔ کاظم علی خاں نے ایسی غلطیوں کو درست کرنے کے بعد مراثی دبیرؔ کی از سرِ نو اشاعت کی ضرورت محسوس کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ محض آنکھ بند کر کے مرزا دبیرؔ کے مرثیے گن لینے سے تلاشِ دبیرؔ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

کتاب کا اگلا مضمون ہے ''متفرقاتِ دبیرؔ'' اس مضمون میں ڈاکٹر کاظم علی خاں نے بتایا ہے کہ مرزا دبیرؔ تک شاعری کی صرف چار بحریں؛ رمل، ہزج، مضارع اور مجتث میں ہی مرثیے کہے جارہے تھے۔ اور وہ مخصوص اوزان تھے:

؎ جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ ؎ اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے
؎ کس کا علم حسینؑ کے منبر کی زیب ہے ؎ روانہ نہرِ لبن کو جو شیر خوار ہوا

لیکن مرزا دبیرؔ نے ان کے علاوہ سات اور بحروں میں پورے پورے مرثیے کہے ہیں۔ یا یہ کہ قدما کی روایت پر قائم رہے ہیں۔ مخمس کے علاوہ مربع کی ہیئت میں بھی مرثیے کہے ہیں۔ مثلاً مربع میں ایک مرثیے کا ایک مطلع اور ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

؎ لازم نہ تھا یہ چرخِ ستمگر کے واسطے یہ گردش اور آلِ پیمبرؐ کے واسطے
آبِ فرات شام کے لشکر کے واسطے اور پیاس ابنِ ساقیٔ کوثر کے واسطے

؎ مقتل کہیں مزار کہیں اور وطن کہیں یہ تفرقہ بھی دیکھا ہے چرخِ کہن کہیں
سر شہ کا دفن ہوئے کہیں اور بدن کہیں سر تڑپے تن کے واسطے تن سر کے واسطے

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مربع کی ہیئت میں میر تقی میرؔ کے مرثیوں کو بہر حال امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اسی مضمون میں کاظم علی خاں نے بتایا ہے کہ مناظرِ فطرت کا جو حاوی رجحان آگے چل کر میر نفیسؔ اور پیارے صاحب رشیدؔ کے یہاں نظر آتا ہے اس کے ابتدائی نقش ونگار مرزا دبیرؔ کے یہاں پہلے سے موجود ہیں۔ مرزا دبیرؔ کا ایک مرثیہ ہے:

؎ کوفے میں بہار آئی جو گلگشتِ چمن کو شرمانے لگا رنگِ زمیں چرخِ کہن کو
رگ رگ سے ملی نبضِ رواں گل کے بدن کو لالے نے کیا کھل کے سبک لعلِ یمن کو
ہے سرو بنا شکلِ زباں شوقِ سخن میں فوّارے در افشاں ہوئے تعریفِ چمن میں

اس مرثیے میں کاظم علی خاں نے خاص طور پر چہرے میں ماجرے کی کیفیت کو نمایاں کرنے کے لیے مرزا دبیرؔ کی فنکارانہ چابک دستی کی داد اور بجا داد دی ہے۔ واقعی یہ بہار دیکھیں:

؎ ہے موسمِ گل حسن پہ گلزارِ جہاں ہے سروِ چمنِ فاطمہؑ یثرب سے رواں ہے
کوفے میں بہار اور مدینے میں خزاں ہے واں نغمۂ بلبل یہاں زہراؑ کی فغاں ہے

پھل برچھیوں کے ہیں شہِ دلگیر کی خاطر اس فصل کا میوہ نہیں شبیرؑ کی خاطر

پھر واضح کر دینا ضروری ہے کہ مناظرِ فطرت کے بیان میں میر انیسؔ کی انفرادیت آج بھی قائم ہے۔

کتاب کا اگلا مضمون ہے ''توقیتِ مراثیٔ دبیرؔ''۔ کاظم علی خاں نے اس مضمون کی ضرورت اس لیے شدت کے ساتھ محسوس کی ہے کہ کسی انیسیے نقاد نے مرزا دبیرؔ کے معرکۃ الآرا مرثیے ''بانوؑ کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے'' میں میر انیسؔ کے اثرات پر بہت کچھ لکھ دیا تھا۔ جب کہ میر انیسؔ محمد علی شاہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند امجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ تشریف لائے۔ بعض مرثیوں کے مقطعوں اور دعاؤں سے بھی کاظم علی خاں نے مرزا دبیرؔ کے چند مرثیوں کا زمانۂ تصنیف معین کیا ہے۔ اور آنے والے محققین سے اس سلسلے میں مزید کام کرنے کی امید جتائی ہے اور ''توقیتِ مراثیٔ دبیرؔ'' کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

کتاب کا اگلا مضمون ہے، ''مرزا دبیرؔ کی غزل گوئی: سوانحی حالات کے آئینے میں۔'' کاظم علی خاں نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ مرزا دبیرؔ کے والد مرزا غلام حسین اور دادا مرزا غلام محمد تھے۔ اور پر دادا مرزا محمد رفیع تھے۔ مرزا محمد رفیع کے والد ملا ہاشم شیرازی تھے۔ ملا ہاشم شیرازی کے بڑے بھائی ملا اہلی شیرازی تھے۔ جو فارسی کے مستند شاعر تھے۔ جن کی مشہور مثنوی ''سحرِ حلال'' کے ہر شعر میں دو قافیے نظم ہوئے ہیں اور مثنوی کے ہر شعر کو دو بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ وراثت میں ملے شعری ذوق کے علاوہ مرزا دبیرؔ کے عہد میں لکھنؤ میں غزل نہایت مقبول صنفِ سخن تھی۔ جگہ جگہ مشاعروں میں خود مرزا دبیرؔ نے بھی غزلیں پڑھی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے کی مشہور طوائف حسین باندی نے کسی رقص و سرود کی محفل میں مرزا دبیرؔ کی غزل گائی جس سے اس غزل کی شہرت کو پر لگ گئے۔ مرزا دبیرؔ کی مذہبی طبیعت کو شہرت ناگوارِ خاطر ہوئی چنانچہ اس طوائف کو آئندہ اپنی غزلیں گانے سے روک دیا چونکہ یہ غزلیں مرزا دبیرؔ کی نومشقی کے زمانے کی ہیں اس لیے ان کی طبیعت سے میل بھی نہیں کھاتیں۔ صرف اپنے زمانے کے ماحول کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ چنانچہ ان سے مرزا دبیرؔ کا کوئی خاص تشخص قائم نہیں ہوتا۔ ایک غزل اس طرح ہے:

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں قبر بلبل کی بنے گلزار میں
اپنے یوسف کا عزیزو ہوں غلام چاہے مجھ کو بیچ دے بازار میں
سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا پھل لگا ہے آج نخلِ دار میں
گرمیٔ خوں کی مرے تاثیر دیکھ پڑ گئے چھالے تری تلوار میں
قبر میں روزن مری رکھنا ضرور مر گیا ہوں انتظارِ یار میں
میرا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی خون کے چھاپے لگے دیوار میں
بعدِ مردن میرے لاشے کو دبیرؔ دفن کرنا کوچۂ دلدار میں

کتاب کا چھٹا مضمون ہے ''مثنویاتِ مرزا دبیرؔ پر ایک نظر''۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اس مضمون میں مرزا دبیرؔ کی مثنوی ''فضائلِ چہاردہ معصومین علیہم السلام'' کے ۱۴۵ اشعار نقل کیے ہیں اور فرمایا ہے کہ:

''ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے پی۔ایچ۔ڈی۔ کے مقالے میں دبیرؔ کی محض ایک مثنوی 'احسن القصص' کی نشاندہی کی گئی ہے۔دوسری مثنوی 'معراج نامہ' کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین نے ۸۶۲ صفحات پر مشتمل اپنے ڈی لٹ کے ضخیم تحقیقی مقالے میں مرزا دبیرؔ کی مثنوی نگاری کے ماتحت محض ڈیڑھ صفحے میں دبیرؔ کی انہیں دو مثنویوں 'احسن القصص' اور 'معراج نامہ' پر اختصار سے روشنی ڈالی ہے۔جن کی نشاندہی ثابت لکھنوی حیاتِ دبیرؔ میں کر چکے ہیں۔ڈاکٹر سید سلیمان حسین کے پی۔ایچ۔ڈی۔ کے تحقیقی مقالے میں دبیرؔ کی مثنوی گوئی پر فقط دو اوراق پر اکتفا کی گئی ہے اور دبیرؔ کی محض دو مثنویوں 'احسن القصص' اور 'معراج نامہ' کا ذکر کیا گیا ہے۔ڈی فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے محولہ بالا تمام تحقیقی مقالے 'احسن القصص' اور 'معراج نامہ' کے علاوہ دبیرؔ کی کسی تیسری مثنوی کا ذکر نہیں کرتے۔راقم کو کافی تلاش کے بعد مرزا دبیرؔ کی ایک ایسی مثنوی دستیاب ہوئی ہے جو محولہ بالا تحقیقی مقالوں پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔''ا؎

مضمون تمام کرتے ہوئے ڈاکٹر کاظم علی خاں کہتے ہیں کہ اس موضوع پر یہ مضمون بھی ناکافی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ صاحبانِ قلم اس جانب سنجیدگی سے توجہ فرمائیں گے۔چنانچہ آج سید تقی علی عابدی نے ''مثنویاتِ دبیرؔ'' مرتب کر کے کاظم علی خاں کے خوابوں کو تعبیر دے دی۔اس کتاب میں مرزا دبیرؔ کی آٹھ مثنویاں ان پر الگ الگ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شامل کی گئی ہیں۔

تلاشِ دبیرؔ کا اگلا مضمون ہے، ''مرزا دبیرؔ کے بعض نادر قلمی آثار۔'' اس مضمون میں ڈاکٹر کاظم علی خاں نے مرزا دبیرؔ کے حوالے سے پانچ دلچسپ اور قابلِ قدر نگارشات پہلی بار مطبوعہ شکل میں پیش کی ہیں۔

۱۔مرزا دبیرؔ کی غیر معروف غزل۔''تل نمایاں ہے نہیں عارضِ جاناں کے تلے''۔بہ حوالہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی۔

۲۔مرزا دبیرؔ کا ایک غیر معروف مرثیہ۔''اے خالقِ سبحاں تو مری عقل رسا کر۔'' در مدح حضرت فاطمہ زہراؑ۔بہ حوالہ کتب خانہ ریاست محمود آباد۔

۳۔مرزا دبیرؔ کا ایک فارسی قطعہ تاریخ۔''بقصرِ لعلِ جناں شد ندیم بزمِ حسینؑ۔'' ۱۲۹۱ ہجری۔بہ حوالہ امام باڑہ تجمل حسین خاں، کٹرہ ابوتراب خاں، لکھنؤ۔

۴۔مرزا دبیرؔ کا ایک فارسی خط۔بہ حوالہ سید باسط حسین ماہر لکھنوی۔

۵۔میر ضمیرؔ کا ایک فارسی مکتوب بہ نام مرزا دبیرؔ۔ذاتی ذخیرے کے حوالے سے۔

بے شک یہ مضمون عملی تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر کاظم علی خاں کی جاں فشانی کا منھ بولتا آئینہ ہے۔

اگلا مضمون ہے ''مرزا دبیرؔ کے غیر مطبوعہ مراثی: بعض غلط فہمیوں کا ازالہ۔'' اس مضمون میں فاضل مصنف نے اشاریہ مراثی دبیرؔ کی مدد سے مرزا دبیرؔ کے ڈھائی درجن سے زائد ایسے مطبوعہ مرثیوں کی وضاحت کی ہے جن کو ان کے معاصر محققین نے غیر مطبوعہ بتایا تھا۔

تلاشِ دبیرؔ کا نواں مضمون ہے ''دبیرؔ نما۔'' اس مضمون میں ۱۲۲۰ ایسی کتابوں اور مآخذوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو مرزا دبیرؔ کی بلیو گرافی تیار کرنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔یہ مضمون تحقیقِ دبیرؔ کے لئے سنگِ میل کی حیثیت کا حامل ہے۔

اگلا مضمون ''مطالعہ مراثی دبیرؔ، تحقیقی ہوتے ہوئے بھی نواب کاظم علی کاں کے تنقیدی شعور کی بہترین مثال ہے۔واجد علی شاہ اخترؔ کی بیت:

بچپن سے ان کے دامِ سخن کا اسیر ہوں میں کمسنی سے عاشقِ نظمِ دبیرؔ ہوں ؎

نقل کرتے ہوئے کاظم علی خاں لکھتے ہیں:

''واجد علی شاہ کی کمسنی یعنی غازی الدین حیدر کے عہد میں مرزا دبیرؔ کے کلام و کمال کی شہرت اس حد تک ہو چکی تھی کہ واجد علی شاہ بچپن میں ہی دبیرؔ کے دامِ سخن میں اسیر ہو گئے تھے۔''۲؎

اس مضمون میں مرثیے کے اجزائے ترکیبی چہرہ، ماجرا، سراپا، رخصت، آمد، جنگ، شہادت، بین کے ذیل میں مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کے تفصیلی جائزے پیش کئے گئے ہیں اور ان پر کھل کر بحث بھی کی گئی ہے۔

تلاشِ دبیر کا بارہواں مضمون ''مقدمۂ اشاریۂ مراثی دبیرؔ'' ہے۔ اس مضمون میں اشاریے کی اہمیت و افادیت نمایاں کی گئی ہے کہ اشاریہ ہی وہ کشتی ہے جس کے ذریعے مراثی دبیرؔ کے اس بحرِ زخار کو پار کیا جا سکتا ہے جس کے لئے رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری نے نے کہا تھا کہ، ''دبیرؔ کا ذخیرۂ کلام اتنا بڑا ہے کہ عام پڑھنے والے اس بحرِ زخار کی پیرائی نہیں کر سکتے۔'' مراثی دبیرؔ کے اشاریے سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ:

۱۔ دبیرؔ کا کون سا مرثیہ کس جلد یا کتاب میں شائع ہوا ہے۔

۲۔ مراثی دبیرؔ کی جلدیں کب اور کہاں شائع ہوئی ہیں۔

۳۔ دبیرؔ کے کس مرثیے میں کتنے بند ہیں۔

۴۔ دبیرؔ کے کس مرثیے میں کس شہید کا حال ہے یا کس مرثیے کا کیا موضوع ہے۔

۵۔ کس شہید کے حال میں مرزا دبیرؔ کے کتنے مرثیے شائع ہوئے ہیں۔

۶۔ دبیرؔ کے کس مرثیے کا مقطع کیا ہے۔

۷۔ دبیرؔ کے کتنے مطبوعہ مراثی میں مقطعے موجود نہیں ہیں۔

۸۔ دبیرؔ کے کتنے مرثیوں میں مشترک مقطعے ہیں۔

۹۔ دبیرؔ کے کون کون سے مرثیے ضمنی مطلعوں کے ساتھ مکرر شائع ہو گئے ہیں۔

۱۰۔ دبیرؔ کا کون سا مرثیہ کس بحر اور کس وزن میں ہے۔

کتاب کا دسواں مضمون ہے ''اشاریۂ مراثی دبیرؔ بہ اعتبارِ مطلع'' اور گیارہواں مضمون ہے ''اشاریۂ مراثی دبیرؔ بہ اعتبارِ مقطع''۔ یہ دونوں اشاریے ڈاکٹر کاظم علی خاں کی محنت شاقہ کے ساتھ ان کی دقت نظر کا ثبوت ہیں۔

آخر میں مرزا دبیرؔ کی تصویر اور تحریر کے چودہ عکس حوالوں کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ جن کو ''تلاشِ دبیرؔ'' کے سونے پر سہاگا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کاظم علی خاں کی ''تلاشِ دبیرؔ'' کے تجزیے کے آخر میں ہم پھر وہیں پر آ جاتے ہیں جہاں ہم نے مرثیے کی تنقید کو موازنے کے سحر اور دائرے سے باہر نکالنے کی حسرت ظاہر کی تھی۔ جسے خود کاظم علی خاں صاحب نے بھی محسوس کیا تھا جس کا ثبوت ان کی کتاب ''تلاشِ

دبیرؔ'' ہے۔لیکن اس میں بھی مطالعۂ دبیرؔ پیش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''مرثیہ نگاری کے میدان میں جب انیسؔ اپنے حریف مرزا دبیرؔ کے مقابلے پر آئے تو انیسؔ تازہ دم تھے اور انہیں اس سے قبل اپنے کسی اہم حریف سے فیض آباد میں کوئی تھکا دینے والا معرکہ نہ کرنا پڑا تھا۔اس کے برخلاف مرزا دبیرؔ کو اس وقت تک صنفِ مرثیہ میں شہرت حاصل کرنے کے لئے فصیحؔ، دلگیرؔ، خلیقؔ اور ضمیرؔ جیسے میدان مرثیہ کے چار چار شاعروں سے نبرد آزمائی کرنا پڑی تھی۔ان چاروں مرثیہ نگاروں کے مقابلے میں آگے بڑھنے میں دبیرؔ کو جو قوت صرف کرنا پڑی ہوگی وہ معمولی نہ ہوگی۔ان سخت معرکوں کے بعد انیسؔ جیسے تازہ دم حریف کے مقابلے میں دبیرؔ ایک تھکے ہوئے مقابل کی حیثیت رکھتے تھے۔ایسے مقابلے کا انجام کیا ہوگا، ظاہر ہے۔مرثیہ گوئی میں ان کا انداز پختہ ہو چکا تھا اور اب نئے ماحول میں اسے زیادہ بدلنا آسان نہ تھا۔اس کے برعکس انیسؔ کی مرثیہ نگاری برابر آگے کی جانب بڑھ رہی تھے۔وہ اپنے حریف کے مقابلے میں اپنے فن پہ پوری قوت صرف کر رہے تھے۔ان حالات کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ دبیرؔ شہرتِ عام کے دربار میں بلند ترین مقام حاصل کرنے کے باوجود بقائے دوام کے دربار میں انیسؔ کے آگے نہ بڑھ سکے۔'' [۳]

بے شک چونکہ لکھنؤ ادبی معرکوں کا شہر ہے۔یہاں دو ہم عصر عظیم شاعروں کے تقابلی مطالعے میں ایسا نقطۂ نظر قائم ہونا بہر حال طبعی ہے۔لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ فطری شاعر فطری شاعر ہوتے ہیں۔ان کی فکر وفن کا ارتقا بھی فطری طور پر ہوتا ہے اور ان کی شہرت بھی فطری طور پر پروان چڑھتی ہے۔ان کی مسابقتیں یا چشمکیں عامیانہ نہیں ہوتیں۔میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں میں کسی کا رتبہ کسی سے کم نہیں ہے۔اگر میر انیسؔ اردو مرثیے کا دل ہیں تو مرزا دبیرؔ اردو مرثیے کا دماغ۔دل کا رجحان مناظرِ فطرت کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور دماغ تخیّل آفرینی بلکہ تحیّر آفرینی میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔لیکن انسانی وجود میں دل اور دماغ دونوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔چنانچہ انیسؔ و دبیرؔ نے ایک سے بڑھ کر ایک مرثیے کہنے کی ضرور کوشش کی لیکن نہ تو کسی جلوت میں ایک دوسرے کو پست دکھانے کی کوشش کی اور نہ کسی خلوت میں ایک دوسرے کی غیبت کی۔دونوں بزرگوں نے مولا سے اپنے لئے نئے نئے مضامین کی توفیق مانگی لیکن کسی کی مضمون آفرینی سے حسد نہیں کیا۔گویا میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں خدائے سخن اردو مرثیے کے دو کنارے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ہمیں موازنے کے حصار سے باہر نکل کر دونوں کی خوبیوں کی داد دینا چاہیئے۔تاہم کاظم علی خاں کو ایک معتبر اور مستند دبیرؔ شناس ثابت کرنے کے لئے ان کی کتاب ''تلاشِ دبیرؔ'' کے مضامین کافی ہیں۔

۱۔ تلاشِ دبیرؔ: کاظم علی خاں : نامی پریس،لکھنؤ : ۱۹۷۹: ص۱۱۹

۲۔ تلاشِ دبیرؔ: کاظم علی خاں : نامی پریس،لکھنؤ : ۱۹۷۹: ص۱۷۹

۳۔ تلاشِ دبیرؔ: کاظم علی خاں : نامی پریس،لکھنؤ : ۱۹۷۹: ص۱۸۸

دبیرؔ کے مرثیوں میں میدان جنگ کی منظر نگاری

پروفیسر شبیب نجمیؔ (انڈیا)

منظر نگاری شاعری کا ایک اہم جز ہے اور یہ وصف مشکل بھی ہے۔ منظر نگاری شاعری میں روح پھونکنے کا کام کرتی ہے۔ اردو شعراء نے مختلف اصناف شاعری میں کئی طرح کے مناظر کو اپنے تخیل کی پرواز سے پیش کیا ہے۔ کبھی کبھی تو شاعر کی قوت تخیل اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ بے جان منظر میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ یوں تو تمام اصنافِ سخن میں مختلف مناظر کو پیش کیا جاتا ہے لیکن صنفِ مرثیہ میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ مرثیہ میں مرثیہ نگار ایسے مناظر کو پیش کرتا ہے جو اس نے دیکھے نہیں ہوتے ہیں اور جس منظر کو خود شاعر نے دیکھا نہ ہو اس کو سامعین کے سامنے اس طرح پیش کرنا کہ سامعین کو محسوس ہو وہ خود اس جگہ موجود ہے اور سارے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ مرثیہ نگار کا یہی کمال فن ہوتا ہے کہ وہ ان دیکھے مناظر کو اپنے تصور کی آنکھ سے اس طرح جزئیات کے ساتھ دیکھتا ہے اور پھر صفحۂ قرطاس پر اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے یہاں منظر نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ صبح کی منظر نگاری، دوپہر کا سماں، دھوپ کی شدت، فوجِ حسینیؑ کے افراد کی رخصت کا منظر، میدانِ جنگ میں جاں نثاران راہ خدا کی آمد کی تصویر کشی اور جنگ کے مناظر کو پوری آب وتاب کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مرثیہ کی ترویج وترقی اور ادب میں صنفِ مرثیہ کو بلند مقام پر پہنچانے میں انیسؔ کے دوش بدوش دبیرؔ نے بھی اہم کردار نبھایا ہے اور اس فن کو وہ عروج وکمال بخشا ہے جس سے مرثیہ نے ترقی کی منازل تیزی سے طے کی ہیں۔ محمد حسین آزاد، آب حیات میں مرزا دبیرؔ کے کمال فن کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''خاندانی شاعر نہ تھے لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ استاد سے پایا اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھا دیا تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اس درجہ تک پہنچا دیا کہ جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا۔'' (آب حیات از محمد حسین آزاد، ص۔ ۵۳۷)

مرزا دبیرؔ مرثیہ نگاری کے وہ تابندہ ستارے ہیں جس کی چمک نے مرثیہ کے توسط سے شاعری کو بلندی عطا کرتے ہوئے رثائی ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ یوں تو مرزا دبیرؔ کے یہاں ہر منظر پوری جزئیات کے ساتھ ملتا ہے، چاہے وہ صبح کا منظر ہو، رخصت کا بیان ہو، امام حسینؑ کے عزیز واقارب کا میدان جنگ میں جانے کے لیے اجازت طلب کرنے کی تصویر کشی ہو، میدان جنگ میں امام حسینؑ کے رفقاء کی آمد کا بیان ہو ہر ایک منظر کو مرزا دبیرؔ نے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے لیکن میدان جنگ کی منظر نگاری میں اپنے فن کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ سامعین کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ میدانِ جنگ کا نقشہ، آلاتِ حرب کا بیان، دشمنوں کی صف بندی، شمشیر زنی، ایک دوسرے

سے مقابلہ کرنے کا منظر، تیراندازی، نیزہ بازی، ممدوح کا بہادری سے جنگ کرنا، سروں کا کٹنا اور رفقائے حسینؑ کا زخمی ہونا وغیرہ ایسے مناظر ہیں جس کو مرزا دبیرؔ نے سامعین کے سامنے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مرزا دبیرؔ کی یہ خوبی ہے کہ وہ جس منظر کو مرثیے کے قالب میں ڈھالتے ہیں اس میں اتنا زور پیدا کر دیتے ہیں کہ سامعین کی آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ یوں تو واقعہ کربلا ایک ایسا موضوع ہے جس کو کسی نے آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے لیکن سامعین اور قارئین اس واقعہ کے ہر پہلو سے واقف ہیں یہی وجہ ہے مرثیہ نگار کے لیے اس کی منظر نگاری کرنا دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کے لیے وہ نادر تشبیہات واستعارے، تراکیب، رعایت لفظی سے حسن پیدا کرتا ہے اور اپنے اشعار میں صبح کا سماں، طلوع آفتاب کا منظر، گرمی کی تپش، جنگ کے مناظر سے وسعت دیتا ہے۔

مرثیے میں جنگ کا منظر سب سے اہم جز ہوتا ہے کیونکہ پورے مرثیہ کا اطلاق جنگ پر ہوتا ہے اور مرثیہ کے سارے اجزاء جنگ کے منظر سے جڑے ہوتے ہیں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ مرثیہ نگار جنگ کے منظر کو پیش کرنے کے لیے ہی پورا مرثیہ تخلیق کرتا ہے۔ مرثیہ کا سب سے پہلا جز چہرا ہوتا ہے جس میں شاعر تمہید کے طور پر صبح کا منظر، خدا کی حمد اور امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی تعریف کرتا ہے اس جز میں بھی شاعر جنگ کی تیاری کا منظر بیان کرتا ہے، دوسرے جز میں ممدوح کے خدوخال، قدوقامت اور شان وشوکت کو بھی سراپا میں بیان کیا جاتا ہے ساتھ ہی ممدوح کے جاہ وجلال اور دیگر خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے،، مرثیہ کے تیسرے جز رخصت میں شاعر ممدوح کے میدان جنگ میں جانے کے منظر کو بیان کرتا ہے اور وہ کس طرح اپنے عزیز واقارب سے جنگ اذن طلب کرتا ہے اس کو جذباتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے، چوتھے جز میں بنیادی کردار کی میدان جنگ میں آمد کا منظر بیان کیا جاتا ہے یہ پورا حصہ رزمیہ ہوتا ہے۔ پانچواں جز رجز کا ہوتا ہے یہ بھی میدان جنگ کا ہی منظر ہوتا جس میں ممدوح اپنی بہادری اور اپنے آباواجداد کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے دشمن کی فوج کو للکارتا ہے۔ اس کے بعد شاعر جنگ کے مناظر کو بیان کرتا ہے۔ مرثیے کا یہ حصہ سب سے اہم اور مشکل ہوتا ہے مرثیے کا سارادارومدار میدان کربلا کے منظر پر ہوتا ہے جس میں میدان جنگ میں پیش آنے والی حق وباطل کی جنگ کے نقشہ کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کے اس جز میں جنگ کی تیاری سے لے کر گھوڑے کی ٹاپوں اس کی رفتار، تلوار کی کاٹ، تیروطبل کی جھنکار تک کے جزوی حالات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ سامعین یا قارئین کے سامنے میدان جنگ کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی موازنہ انیسؔ ودبیرؔ میں رزمیہ شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''رزمیہ شاعری کا کمال، امور ذیل پر موقوف ہے سب سے پہلے لڑائی کی تیاری، معرکہ کا زور وشور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہلچل، شوروغل، نقاروں کی گونج،، ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، نیزوں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا، نقیبوں کا گرجنا، ان چیزوں کا اس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں کے سامنے معرکۂ جنگ کا سماں، چھا جائے پھر بہادروں کا میدان جنگ میں جانا، مبارز طلب ہونا، باہم معرکہ آرائی کرنا، لڑائی کے داؤں پیچ دکھانا، ان سب کا بیان کیا جائے، اس کے ساتھ، اسلحۂ جنگ اور دیگر سامان جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچی جائے پھر فتح یا شکست کا بیان کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ دل دہل جائیں، یا طبیعتوں پر اداسی اور غم کا عالم چھا جائے۔

(موازنہ انیسؔ ودبیرؔ از شبلی نعمانی، ص۔ ۱۹۷)

مرزا دبیرؔ نے مرثیہ میں اپنے تخیل کی پرواز سے یہ تمام رنگ بھرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔میدان جنگ کی تمام جزئیات کوخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔میدان جنگ کی منظر نگاری میں گھوڑے اور تلوار کوخاص اہمیت حاصل ہے اور مرثیہ نگاروں نے گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں نادر تشبیہات واستعارات کا استعمال کیا ہے۔مرثیوں میں رزم کی عمومی شان توتلوار کی چمک دمک اور اس کی ہنگامہ آرائی سے عبارت ہے۔مرزا دبیرؔ ایک مرثیہ میں حضرت عباسؑ کی تلوار کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

نے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وتلاطم
ہر موج ہے گردش میں،گرے پڑتے ہیں انجم جس طرح سے آندھی میں جدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

یکسر صفتِ بختِ سیہ ڈھالیں تھیں بیکار تھی تن میں زرہ نامۂ عصیاں سے گراں بار
برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفار اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار
دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند تھا رعشہ نیزوں کو قدمِ پیر کی مانند

مرزا دبیرؔ شمشیر کی کاٹ اور جنگ کے مناظر بیان کرنے کے لیے ہر بار نئے تلازمات اور تراکیب تخلیق کرتے ہیں جس سے سامع کے سامنے میدان جنگ ایک نئے روپ اور نئی معنویت کے ساتھ ابھر کر آتا ہے۔ایک جگہ وہ تلوار کی خوبی اس طرح نظم کرتے ہیں:

چھل بل تھی چھلاوا تھی طلسمات تھی اسرار چالاک ، سبک سار ، طرح دار نمودار
نیزہ کہیں ، خنجر تھی کہیں اور کہیں تلوار بجلی تھی کسی جا تو کہیں نور کہیں نار
سیماب تھی ، سیلاب تھی طوفان تھی ہوا تھی شعلہ تھی شرارہ تھی قیامت تھی بلا تھی

مرزا دبیرؔ نے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹے منظر کو بھی فنی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔مثلاً ایک موقع پر حضرت علی اکبرؑ کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے گھوڑے کی عقل،رفتار،سم،دم اور آنکھوں کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں:

وہ رخش تھا یا ابلقِ ایّام کا اقبال نک سکھ سے درست اور جواں بخت و جواں سال
جادو کی نری آنکھ فقط معجزے کی چال خورشید کے سم ، برق کی دم سنبلہ کی یال
قوت کی طبیعت بھی دلیری کا جگر تھا سرعت کا بدن فہم کا دل ، عقل کا سر تھا

مرزا دبیرؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے خیال کی بلندی سے جنگ کے بیان کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ الفاظ میں زور پیدا ہوجاتا ہے۔مرزا دبیرؔ کے یہاں کربلا کے واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی ملتی ہے۔وہ خوبی کے ساتھ شاعری کے فنی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے جنگی آلات کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور بنیادی کرداروں کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے جنگ کے منظر کو پیش کرتے ہیں:

جھوما سپر کو روک کے منھ پر وہ روسیاہ جیسے شبِ فراق میں عاشق کا دود آہ

یاں سے بڑھا سفیدۂ صبحِ حسامِ شاہؑ آواز ڈھال سے ہوئی پیدا کہ واہ واہ
کوسوں تھا غل سپر جو کٹی بد صفات کی سچ ہے کہ دور جاتی ہے آواز رات کی

اس نے بھی حملہ غالبِ کونین پر کیا تیغ دو سر نے ضرب سے حربوں کو سر کیا
گرزِ گراں کے پیش کو زیر و زبر کیا شش پر کو اس کے طائرِ بے بال پر کیا
سہا یہ ترکش اس کا کہ سب تیر گر پڑے کانپا یہ پھل کہ جوہرِ شمشیر گر پڑے

آیا جلال میں اسدِ اشجعِ جہاں فاقے میں زورِ دلبرِ حیدرؑ ہوا عیاں
یوں اس کے تن میں تیغِ دو پیکر ہوئی نہاں جس طرح در میں فاتحِ خیبر کی انگلیاں
دو ہوگیا وہ دشمنِ دیں ذوالفقار سے گرنے لگا تو چار کیا ایک وار سے

لایا ابن سعد تمہیں ہے خیال کیا اک اک لڑے حسینؑ سے تو یہ مجال کیا
ان کے حضور تیغ زنوں کا کمال کیا اسفند یارو بہمن و سہراب و زال کیا
مل کر لڑو وگر نہ ہزیمت ہے صاحبو اس پر بھی فتح ہو تو غنیمت ہے صاحبو

دبیرؔ کے مرثیوں میں جنگ کے مناظر کثرت سے ملتے ہیں۔انہوں نے اپنے مرثیوں میں شہدائے کربلا کی جنگ کا منظر خوبصورتی سے بیان کیا۔وہ جنگ کا منظر بیان کرتے وقت شجاع کے کردار کے مطابق جنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں،جس سے مضمون آفرینی نئی معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے اور جنگ کی منظر نگاری اپنی تمام جزئیات کے ساتھ سامعین کے سامنے ابھرتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ بند ملاحظہ فرمائیں،جس میں امام حسینؑ کی جنگ کی ہیبت کے منظر کو بیان کیا ہے:

نے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم
ہر موج ہے گردش میں ، گرے پڑتے ہیں انجم جس طرح سے آندھی میں جدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

یکسر صفت بخت سیہ ڈھالیں تھیں بیکار تھی تن میں زرہ نامہ عصیاں سے گراں بار
برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفار اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار
دشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند تھا رعشہ نیزوں کو قدم پیر کی مانند

یہاں پر مرزا دبیرؔ نے جنگ کے منظر نامے میں دو کیفیتوں کو قلم بند کیا ہے۔ایک کیفیت جنگ دیکھنے والوں کی ہے جن پر معرکہ آرائی دیکھ

کرسکتہ طاری ہوگیا ہے وہ جنبش بھی نہیں کرسکتے اور دوسری طرف رعشہ وتلاطم سے ان لوگوں کی کیفیت بیان کی ہے جو جنگ میں حصہ لے رہے ہیں اور امام حسینؑ کی بہادری نے انہیں خوف ودہشت میں مبتلا کردیا ہے۔ چنانچہ دہشت سے ان کے جسم میں رعشہ وتلاطم کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس بند میں شاعر نے جنگ کی دہشت اور تلوار کی کاٹ کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ''ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے رنگوں سے'' معرکہ میں بے شمار مقتولین کے تواتر قتل کا اشارہ ہے، جو بالواسطہ امام حسینؑ کی شجاعت اور حرب وضرب کو ظاہر کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ نے اپنے علم وتفکر سے منظر کشی کو حقیقت سے قریب تر کردیا ہے۔ ان کے یہاں صرف شاعرانہ تخیل ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی مناظر ہیں۔ ''اے شمس وقمر نور کی محفل ہے یہ محفل'' میں حضرت امام حسینؑ کے بیٹے حضرت علی اکبرؑ کی جنگ کا نقشہ فنی مہارت سے کھینچتے ہیں۔ اس مرثیہ میں تقریباً بیس بند میں مرزا دبیرؔ نے اکبرؑ کی جنگ کا منظر پیش کیا ہے ان میں سے کچھ بند رجز کے ہیں اور باقی بندوں میں جنگ کا منظر ہے کہ کس طرح سے حضرت علی اکبرؑ نے بہادری سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے تہہ تیغ کیا۔

مثال کے طور پر چند بند پیش ہیں:

گر چار ہوا تیغِ دو سر سے کوئی سردار — اس پنجتنیؑ نے معِ ہمزاد کیا چار
یہ کاٹ کے معنی ہیں اسے کہتے ہیں تلوار — لشکر کے جوانوں کو مسن کر دیا اک بار
دو حصہ سن و سال کیے اہلِ ہوس کے — جو تیس برس کے تھے ہوئے ساٹھ برس کے

چھائی جو سرِ دست یہ صمصام کی بدلی — رت پھر گئی رنگت سپہ شام کی بدلی
بدلی نے ہوا گردشِ ایّام کی بدلی — غل تھا کہ نگہ کفر سے اسلام کی بدلی
مقتل میں یہ حالت ہوئی بیداد گروں کی — پڑنے لگی بوچھار جہنم میں سروں کی

مرزا دبیرؔ کے یہاں مشاہدہ کی صداقت ہے۔ امام حسینؑ کے رفقاء میں حضرت عباسؑ سب سے بہادر تھے۔ مختلف شعراء نے حضرت عباسؑ کی جنگ کے مناظر کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور ان کی بہادری کے جوہر دکھائے ہیں۔ مرزا دبیرؔ کا مشہور مرثیہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' میں حضرت عباسؑ کی بہادری کو خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس مرثیہ کی ابتداء ہی مرزا دبیرؔ نے میدانِ جنگ میں حضرت عباسؑ کی آمد سے کی ہے اس کے بعد منفرد انداز میں رجز کا بیان کرتے ہوئے حضرت عباسؑ کی جنگ کی تصویر کشی کی ہے۔ اس مرثیے کے چند بند ملاحظہ ہوں:

مرحب سے مخاطب ہوئے عباسِؑ دلاور — شمشیر کے مانند سراپا ہوں میں جوہر
ممکن ہے اک ضرب میں دو ہو تو سراسر — پر اس میں عیاں ہوں گے نہ جوہر مرے تجھ پر
لے روک مرے وار ترے پاس سپر ہے — زخمی نہ کروں گا ابھی اظہارِ ہنر ہے

کاندھے سے سپر لے کے مقابل ہوا دشمن بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب ہر فن
یہ سینہ یہ بازو یہ کمر اور یہ گردن یہ خود یہ چار آئینہ یہ ڈھال یہ جوشن
کس وار کو وہ روکتا تلوار کہاں تھی آنکھوں میں تو پھرتی تھی نگاہوں سے نہاں تھی

مرحب نے نہ پھر ڈھال نہ تلوار سنبھالی اس ہاتھ سے سر ایک سے دستار سنبھالی
ظالم نے سناں غصے سے اک بار سنبھالی اس شیر نے شمشیرِ شرربار سنبھالی
تانی جو سناں اس نے علمدار کے اوپر یہ نیزہ اڑا لے گئے تلوار کے اوپر

جو چال چلا وہ ہوا گمراہ وپریشاں پھرزائچہ کھینچاجو کماں کا سرِ میداں
تیروں کی لڑائی پہ پڑا قرعۂ پیکاں تیروں کو قلم کرنے لگی تیغِ درخشاں
جوہر سے نہ تیروں ہی کے پھل داغ بدل تھے گرشست کے تھے ساٹھ تو چلّے کے چہل تھے

مذکورہ مرثیے میں مرزا دبیرؔ نے جہاں حضرت عباسؑ کی بہادری کے جوہر کونظم کیا ہے وہیں جنگ میں استعمال ہونے والے اسلحے کا تفصیل سے بیان کیا ہے۔مرزا دبیر کا کمالِ فن یہ ہے کہ انھوں نے تصویر کے دونوں رخ کو پیش کیا ہے جس سے جنگ کا پورا منظر قاری کے سامنے آجائے۔انہوں نے جہاں حضرت عباسؑ کی بہادری سے مقابلہ کرنے کا منظر پیش کیا ہے وہیں فوج یزیدی کے وار کا ذکر بھی کیا ہے۔روایت میں ہے کہ حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے بھائی تھے اور لشکرِ حسینیؑ کے علمدار بھی تھے۔امام حسینؑ کو ان سے بہت ڈھارس تھی،صبحِ عاشورہ سے جب انصار واصحاب سب جام شہادت نوش فرمانے لگے۔تو حضرت عباسؑ نے بھی جنگ کی اجازت طلب کی لیکن امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کو جنگ کی اجازت نہیں دی۔حضرت عباسؑ نے خیامِ حسینیؑ میں چھوٹے چھوٹے بچوں اور معصوم سکینہؑ کو پیاس سے جاں بلب دیکھا تو امام حسینؑ سے پانی لانے کی اجازت مانگی اور نہر فرات پر پانی لینے کے لیے آگئے۔مرزا دبیرؔ نے اس پورے منظر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

دریا کو چلے ابر صفت ساتھ لیے برق مرحب کے شریکوں کا جدا کرتے ہوئے برق
سردار میں اور فوج میں باقی نہ رہا فرق مرحب کی طرح سب چھپ ہب میں ہوئے فرق
تلوار کی اک موج نے طوفان اٹھایا طوفان نے سر پر وہ بیابان اٹھایا

پانی مجھے اک مشک ہے اس نہر سے درکار بھر لینے دو مجھ کو نہ کرو حجّت و تکرار
چلّائے ستم گر ہے نہر پہ گزر دشوار غازی نے کہا ہاں یہ ارادہ ہے تو ہشیار
لو سیل کو اور برقِ شرر بار کو روکو رہوار کو روکو مری تلوار کو روکو

سوکھے ہوئے مشکیزے کا پھر کھولا دہانہ بھرنے لگا خم ہو کے وہ سرتاجِ زمانہ

اعدا نے کیا دور سے تیروں کا نشانہ اور چوم لیا روحِ یداللہ نے شانہ
فرمایہ کہ کیا کیا مجھے خوش کرتے ہو بیٹا پانی مری پوتی کے لیے بھرتے ہو بیٹا

حضرت عباسؑ نے جتنی دیر میں مشکیزہ بھرا اتنی دیر میں تمام فوج اشقیاء نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور تیر برسانے لگے۔ایک تیر حضرت عباسؑ کے دائیں بازو پہ لگا جس میں مشکیزہ پکڑے ہوئے تھے،عباسؑ نے مشکیزے کو بائیں ہاتھ میں لے لیا،لیکن ایک شقی نے ایک تیر بائیں ہاتھ میں مارا دوسرا ہاتھ بھی قلم ہوگیا،اب عباسؑ نے مشکیزے کے تسمہ کو دانتوں سے دبا لیا۔دونوں ہاتھ قلم ہوگئے تھے لیکن عباسؑ کی خواہش تھی کہ خیامِ حسینؑ تک پانی پہنچ جائے۔لیکن فوج یزیدی سے کچھ تیر ایک ساتھ چلائے گئے جو ایک ساتھ مشکیزے اور عباسؑ کی پیشانی پر لگے۔عباسؑ کا جسم تیروں سے چھلنی ہوگیا۔مرزا دبیرؔ نے اس منظر کو پوری مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے:

لکّھا ہے کہ ایک نخلِ رطب تھا سرِ میداں ابنِ ورقہ زیدِ لعیں اس میں تھا پنہاں
پہنچا جو وہاں سروِ روانِ شہِؑ مرداں جو شانہ تھا مشک وعلم و تیغ کے شایاں
وار اس پہ کیا زید نے شمشیرِ اجل سے یہ پھولی پھلی شاخ کٹی تیغ کے پھل سے

مشک و علم و تیغ کو بائیں پہ سنبھالا اور جلد چلا عاشق روئے شہِؑ والا
پر ابنِ طفیل آگے بڑھا تان کے بھالا برچھی کی انی سے تو کیا دل تہہ و بالا
اور تیغ کی ضربت سے جگر شاہؑ کا کاٹا وہ ہاتھ بھی فرزندِ یداللہ کا کاٹا

سقّے نے کٹی بانہوں پہ مشکیزے کو رکھ کر مانندِ زباں منھ میں لیا تسمہ سراسر
ناگاہ کئی تیر لگے آ کے برابر اک مشک پہ اک آنکھ پہ اور ایک دہن پر
مشکیزے سے پانی بہا اور خون بہا بدن سے عباسؑ گرے گھوڑے سے اور مشک دہن سے

گر کر لبِ زخمی سے علمدار پکارا کہہ دو کوئی پیاسوں سے کہ سقّا گیا مارا
سن لی یہ صدا شاہِؑ شہیداں نے قضارا زینبؑ سے کہا لو نہ رہا کوئی ہمارا
اصغرؑ کا گلا چھد گیا اکبرؑ کا جگر بھی بازو بھی میرے ٹوٹ گئے اور کمر بھی

مرزا دبیرؔ کا یہ مرثیہ معنوی اور فنی دونوں سطحوں پر کمال کا درجہ رکھتا ہے۔انہوں نے اپنے علم وتفکر سے منظر کشی کو حقیقت سے قریب کر دیا ہے۔ان کے یہاں صرف شاعرانہ تخیل ہی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی مناظر ہیں۔مرزا دبیرؔ نے جنگ کے منظر نامے کو پوری جزئیات کے ساتھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے سب کچھ ہو رہا ہے انہوں نے الفاظ کی کاریگری سے میدان جنگ کے مناظر میں ایسی جان ڈالی ہے کہ سارے منظر ایک کے بعد ایک قاری کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جنگ کی تیاری سے لے کر شہادت

تک کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور سامعین کے دلوں پر تادیر اثر رہتا ہے۔فوجِ یزید کا بیان بھی تفصیل سے کیا ہے جو مرزا دبیرؔ کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا ثبوت ہے۔

مرزا دبیرؔ کا کمالِ فن یہ ہے کہ جہاں انہوں نے میدان جنگ میں بہادری سے مقابلا کرنے کے مناظر کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے، وہیں ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے لاچاری ومجبوری کے منظر کو بھی بیان کیا ہے۔امام حسینؑ سوال آب کے لیے چھ ماہ کے بچے حضرت علی اصغرؑ کو لے کر فوج اعدا کے سامنے میدان کربلا میں آتے ہیں۔بڑا نازک مرحلہ ہے، بچے کے لیے پانی بھی مانگنا ہے لیکن غیرت حمیت مانع ہے۔مرزا دبیرؔ اس پورے منظر کو موثر انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

پہنچے قریب فوج تو تھرّا کے رہ گئے چاہا کریں سوال تو شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرّا کے رہ گئے چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں اصغرؑ تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

مرزا دبیرؔ نے میدانِ جنگ کے اس منظر کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے،امامِ حسینؑ کے سب انصار واقارب شہید ہو گئے ہیں اب امام حسینؑ کا چھ ماہ کا بچہ علی اصغرؑ ہے جس کو تین روز سے پانی نہیں ملا ہے،اس کی ماں کا دودھ بھی خشک ہو گیا ہے،معصوم بچے کا پیاس سے برا حال ہے۔ایک مجبور باپ اپنے بچے کو دیکھتا ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور یہی بے چینی بچے کو دشمنوں کی فوج کے سامنے لانے پر مجبور کر دیتی ہے اور امام حسینؑ سوالِ آب کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مرزا دبیرؔ نے میدانِ کربلا کی منظر نگاری میں بڑی سلاست پسندی سے کام لیا ہے اور بیان کی دلکشی،صنعت کا استعمال اور مفہوم کی بلاغت سے اثر پیدا کیا ہے۔انہوں نے انتہائی فن کاری سے شاعری کے فنی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے آلاتِ جنگ کی بھی تفصیل بیان کی ہے۔معرکہ آرائی کا منظر خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اور حق وباطل کی جنگ کے منظر نامے کو پوری جزئیات کے ساتھ سامعین کے حضور میں پیش کیا ہے۔

ماخذ: آب حیات از محمد حسین آزاد،	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۸ء
مرثیہ مرزا دبیرؔ جلد اول	مطبع منشی نول کشور لکھنؤ	سنہ اشاعت ۱۹۳۷ء
مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری	از ایس اے صدیقی، راحت پریس دیوبند،	سنہ اشاعت۔۱۹۸۰ء
کلامِ دبیرؔ	مرتبہ فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو،	سنہ اشاعت۔۲۰۰۵ء
موازنہ انیسؔ ودبیرؔ	از شبلی نعمانی انوار المطابع لکھنؤ۔	سنہ اشاعت۔۱۹۶۹ء

❁❁❁❁

دبیرؔ کا منفرد انداز نوحہ نگاری

ڈاکٹر ریحان حسن

اردو ادب کی دیگر اصناف سخن میں نوحہ منفرد حیثیت کا حامل ہی نہیں بلکہ فطرت انسانی سے قریب ترین صنف سخن بھی ہے غالباً اسی لیے اس صنف میں غم والم کی کیفیت کو جس قدر پر اثر انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے وہ پر اثر انداز بیان ہمیں کسی اور صنف میں نہیں ملتا ظاہر ہے کہ میّت کے متعلقین کے گریہ میں جس قدر شدت ہوگی اس سے اسی قدر محبت والفت کا درک ہوگا چنانچہ جناب ہابیل کی شہادت پر جناب آدمؑ کا گریہ اور جناب یعقوبؑ کی وفات پر جناب یوسفؑ کا پیشہ ور ماتم کرانے والوں سے ماتم نیز خود حضور اکرم کی بیٹی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا آنحضرتؐ کی وفات پر ان کا دردناک نوحہ

صبت علی مصائب لوانہا صبت علی الایام صرن لیا لیا

اے بابا آپ کی وفات کے بعد مجھ پر اس قدر مصائب پڑے کہ اگر دنوں پر پڑتے تو مثل تاریک شب ہو جاتے

اور شہید اعظم امام حسینؑ کا اپنے اصحاب واعزہ کی شہادت پر الآن انکسر ظھری، یا بنی علی الدنیا بعدك العفاء جی سے لفظوں میں پر درد نوحہ اور بعدِ شہادت امام حسینؑ زینبؑ وام کلثومؑ اور امام زین العابدینؑ کے نوحے مرنے والے سے محبت والفت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں اور آج بھی یہ نوحے سننے والے دلوں کو تڑپا دیتے ہیں۔

ایّام جاہلیت سے لے کر واقعۂ کربلا تک کسی بھی میّت سے متعلق رنج وغم کا اظہار اشعار کی شکل میں جو ہوا ہے ان کا تعلق براہ راست نوحے سے ہی ہے مگر ہمارے ناقدین نے ان نوائح کو بھی مرثیے کے زمرے میں ڈال دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرثیہ پر ناقدین نے جس طرح گفتگو کی اس قبیل سے نوحے پر نہ ہو سکی اس کے باوجود نوحے کی صنف کا تعلق چونکہ عوام وخواص دونوں سے تھا اس لیے نوحہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ مرثیے کو نصیب نہ ہو سکی۔

دراصل نوحہ وارثانِ میّت کے اظہارِ حزن والم کا نام ہے چونکہ نوحے میں انتقال کرنے والے شخص سے جو تحفظ اور آسائشیں، میسر ہوئی تھیں ان سے محرومی کا شکوہ ہوتا ہے اور مرنے والے کے صفات اور ذاتی اوصاف اس کے بین کے جز ہوتے ہیں اور ہمیں یہی صفتیں مندرجہ بالا اشعار میں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ بات صداقت پر مبنی ہے کہ نوحے میں اضطراب وبے قراری کی کیفیت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر شدت غم میں اضافہ کا سبب ہوگا اسی لیے نوحہ گوئی آسان کام نہیں جس کا اقرار دولھا صاحب عروج نے بھی کیا ہے وہ رقمطراز ہیں:

''لوگ خیال فرماتے ہیں کہ نوحہ تصنیف کرنا بہت آسان ہے۔ میرے نزدیک یہ زیادہ مشکل ہے کیونکہ عورتوں کی زبان میں جذباتِ شاعری اور حسنِ بندش کا خیال رکھنا اور محاورات کا محل پر صرف کرنا اور واقعات کربلا کو شریک کرنا مضمون کو ان الفاظ کے حوالے دینا جن

لفظوں کی روشنی میں مطلب اور بھی واضح طور سے نظر آنے لگے کوئی سہل بات نہیں۔''(۱)

اس لیے نوحہ نگاروں نے نوحے کا ماحصل بین و بکا کو سمجھتے ہوئے اس بات کی زیادہ کوشش کی کہ مصائب و شدائد کے واقعات کو خواتین کی زبان ہی سے بیان کیا جائے اور اس صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مردوں کے بہ نسبت عورتیں زیادہ حساس اور جذباتی ہوتی ہیں اس لیے وہ غم والم کی کیفیت کو جذباتی انداز میں بہتر طریقے سے ادا بھی کر سکتی ہیں اور اسی لیے جنابِ حمزہؓ اور جنابِ جعفرؓ کی شہادت پر گریہ کرنے کی غرض سے آنحضرتؐ نے عورتوں کو ہی طلب فرمایا تھا نہ کہ مردوں کو، چنانچہ آپ تاریخِ کربلا کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و اعزّہ کی شہادت پر خواتین کی زبان سے جو بین ادا کیے گئے ہیں وہ زیادہ غم انگیز بھی ہیں اور رقّت انگیز بھی۔ اہلِ بیتِ حرم کے مدینہ منورہ کے ورود کے موقع پر جناب اُمِّ کلثومؑ نے جو نوحے اپنے نانا کے وطن سے مخاطب ہو کر کہا ہے اس میں غم والم کی جو کیفیت نظر آتی ہے وہ کسی اور نوحے میں ہمیں نظر نہیں آتی۔ حضرت اُمِّ کلثومؑ کے نوحے کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں اور اس میں رنج و غم کا جو اتھاہ سمندر موجزن ہے اسے محسوس کریں ؎

مدينة جدنا لا تقبلينا فبا لحسرات والاحزان جئنا
خرجنا منك بالا هلين جمعا رجعنا لارجال ولابنينا
الاياجد ناقتلو احسينا ولم يرعوا جناب الله فينا

اے ہمارے جد کے مدینے ہمیں قبول نہ کر کیونکہ ہم حسرتوں اور غم واندوہ کے ساتھ تیری طرف آ رہے ہیں۔
ہم جب تجھ سے نکلے تھے تو اپنے تمام رشتہ داروں کے ساتھ تھے۔ اب جب واپس ہوئے ہیں تو نہ ہمارے مرد ہیں اور نہ ہمارے بچے ہیں۔
ہاں اے جد بزرگوار آپ کا حسینؑ قتل کر دیا گیا اور ہمارے بارے میں آپ کی منزلت کا بھی خیال نہ رکھا گیا۔(۲)

ہندوستان میں بھی جن نوحہ نگاروں نے نوحہ میں بین خواتین کربلا کی زبان میں ادا کیے ہیں وہ نوحے تاریخ نوحہ نگاری میں لاجواب ہیں شاید اسی بات کے پیشِ نظر نوحہ نگاروں نے نوحہ کو کسی خاص ہیئت اور تکنیک میں محدود نہیں کیا بلکہ اس بات کا التزام رکھا کہ نوحے میں ایسی ہیئت اور اسلوب کو اختیار کیا جائے کہ جس سے بین و بکا میں اضافہ ہو جب کہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا نوحے کی ہیئت کے متعلق یہ کہنا ہے کہ:

''ہیئت کے اعتبار سے نوحہ غزل مسلسل سے مماثل ہوتا ہے اور مواد کے اعتبار سے داخلی یا جذباتی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔''(۳)

اور مرتضیٰ حسین فاضل کا یہ کہنا ہے کہ:

''نوحہ وہ مبکی نظم ہے جس میں واقعات کربلا تنوع و خیال آفرینی کے ساتھ نظم کیے جائیں اور لحن کے ساتھ پڑھا جائے۔''(۴)

ابتداء میں نوحہ نگاروں نے ایسے ہی نوحے کہے جو کہ مبکی بھی تھے لیکن بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اس صنف میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ عارفانہ، فلسفیانہ اور تبلیغی انداز میں بھی نوحے کہے گئے۔ نوحہ گویوں نے آہ و بکا کے دائرے سے نکل کر جب تبلیغی نوحے کہنے شروع کیے تو انھوں نے اس بات کی سعی کی کہ ایک مصرع یا چند مصرعوں میں وہی غم والم کی کیفیت کو پیدا کیا جائے کہ جس رنج و غم کی کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے مرثیہ گویوں کو متعدد بندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نجمؔ آفندی اور نواب رامپور نے تبلیغی نوحے کہہ کر نوحہ کے حلقۂ اثر کو اس حد تک وسیع کیا کہ یہ صنف گھر گھر مقبول ہوگئی۔ تبلیغی نوحوں میں قریوں کی معاشرتی زندگی اور ان رسم و رواج کو نظم کیا گیا جو اس عہد کے

معاشرے میں رسم ورواج رچ بس گئے تھے چونکہ ان نوحوں میں عوامی لب ولہجہ کو بھی اپنایا گیا تھا لہٰذا ان نوائح کو عوام میں بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مقبول صنف سخن کے جہاں تک آغاز کا سوال ہے تو بلا جھجک یہ کہا جاسکتا ہے کہ رثائی شاعری کا آغاز دکن میں دراصل نوحہ سے ہی ہوا اور بحیثیت نوحہ نگار قلی قطب شاہ وہ پہلا شاعر ہیجس نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ قلی قطب شاہ کے بعد جن نوحہ نگاروں نے اس صنف میں قدم رکھا ان لوگوں نے بھی اس بات کا خیال رکھا کہ نوحہ میں مبکی مضامین ہی نظم کئے جائیں ان میں ملا وجہیؔ، غواصیؔ، نصرتیؔ، ملک خوشنودؔ ہاشمیؔ بیجاپوری، قلیؔ خاں شاہی، جلیل کاظمؔ محمود بحریؔ درگاہ قلیؔ خاں، سید محمد اشرفؔ، ہاشمؔ برہانپوری، میر مہدی متینؔ برہانپوری، اسد علی خاں تمناؔ، میر عبداللہ مسکینؔ، سراجؔ الدین، علی خاں آرزوؔ، نجمؔ الدین آبروؔ، محمد شاکر ناجی، غلام حسین ضاحکؔ، میر خلیقؔ، میر انیسؔ، میر نفیسؔ، میر عشقؔ، میر تعشقؔ، ضمیرؔ لکھنوی، دلگیرؔ لکھنوی آرزوؔ لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی، جمیلؔ مظہری، آلؔ رضا، امیدؔ فاضلی، مہدیؔ نظمی، نسیمؔ امروہوی، پیارے صاحب رشیدؔ، وحیدؔ اختر، صباؔ اکبرآبادی، نجمؔ آفندی، فضلؔ نقوی، شاربؔ لکھنوی، جذبؔ گوپالپوری، زائرؔ سیتاپوری، ندیمؔ گوپال پوری، جمالؔ ہلوری، قاسمؔ علی شمیم گوپالپوری، تجسسؔ اعجازی، شیداؔ گوپالپوری، کاظمؔ جرولی، طیبؔ کاظمی وغیرہ ایسے شعراء ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس صنف میں نئے نئے مضامین کو اس انداز میں نظم کیا کہ جس سے بین وبکا میں اضافہ ہوا۔

یہ سچ ہے کہ نوحہ کے مثل سلام بھی پہلے صرف بینیہ اشعار پر مشتمل ہوتے تھے چنانچہ گداؔ، احسانؔ اور ان کے ہم عصر مرثیہ گو شعراء کے یہاں اضطراب وبے قراری کے کیفیات کی ترجمانی ہی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ دراصل سلام چونکہ سرزمین ہند پر ہی پھلی اور پھولی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ سرزمین ہند پر چونکہ بھکتی اور عقیدت کی فضا عام تھی لہٰذا اس سے متاثر ہوکر یہاں کے شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن جس طرح مرثیہ میں تبدیلی واقع ہوئی سلاموں میں بھی تغیر ہوا اور سلاموں میں بینیہ اشعار کے علاوہ مدحیہ اور اخلاقی مضامین بھی شامل کردیئے گئے۔ چنانچہ مرزا دبیرؔ کے سلاموں کی جو تین جلدیں ہمیں ملتی ہیں ان میں ہمیں بینیہ اشعار کے ساتھ ساتھ مدحیہ اشعار بھی خال خال نظر آتے ہیں۔ لیکن سلاموں کے برعکس مرزا دبیرؔ کے جو نوحے ہمیں دستیاب ہیں ان میں مرنے والے کی تعریف وتوصیف اور مدح وثناء کے اجزاء کے بجائے غم ورنج کے مضامین ہی نظر آتے ہیں۔

نوحہ دراصل حضرت نوحؑ کی گریہ وزاری سے وابستہ ہے اور جب زبانِ عصمت وطہارت سے نوحہ ادا ہوا ہے تو اس کی بقاء واطاعت بھی لازم ہے۔ چنانچہ بیشتر نوحہ گو حضرات اسیران کربلا اور شہیدان کربلا کی زبان مبارک سے ایسے فقرے ادا کرتے نظر آتے ہیں جو انتہائی کربناکی کے حامل ہوتے ہیں لیکن مرزا دبیرؔ کا وصفِ خاص یہ ہے کہ انہوں نے دردناک وکربناک فقروں کو مقاتل اور تاریخی شواہد کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ مرزا دبیرؔ کے برعکس دوسرے نوحہ گو حضرات جذبات اور احساسات کی ترجمانی تو کرتے ہیں لیکن استدلال سے وابستگی نہیں پیش کرپاتے اس طرح دبیرؔ کے نوحوں میں جو خوبیاں ہمیں نظر آتی ہیں وہ ان کے ہم عصر شعراء کے یہاں خال خال ہی نظر آتی ہیں اس طرح انہوں نے نوحے کے عناصر ترکیبی کو بروئے کار لاکر مرثیہ کے مثل صنفِ نوحہ کو بھی اس منزلِ کمال تک پہنچایا ہے کہ جب تک شاعر ان کے نوحوں کی غواصی نہیں کرلیتا ایک اچھا نوحہ گو نہیں بن سکتا۔ جس طرح وہ مرثیے کے آفتاب کہے جانے کے مستحق ہیں بعینہٖ وہ نوحوں کے بھی ماہتاب کہے جانے کے حقدار ہیں۔ لیکن یہ ہماری شومئ قسمت ہے کہ ہمارے ناقدین نے دبیرؔ کے مرثیوں کی جانب جس انداز سے توجہ کی اس طرح دبیرؔ کے نوحوں کی جانب توجہ مبذول نہیں کی جبکہ دبیرؔ کے نوحوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ نوحہ نگاری کا کعبہ ہیں کیونکہ ان کے نوحوں میں جو سلاست وروانی دیکھنے کو ملتی ہے وہ قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیئے جانے پر مجبور

کر دیتی ہے۔انہوں نے شہزادی جناب زینبؑ کی زبانی جو نوحہ کہا ہے اس میں جو رنج وغم کی کیفیت نظر آتی ہے وہ براہ راست انسان کو میدان کربلا میں پہنچا دیتی ہے اور امام حسینؑ کی بیکسی وتنہائی پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

کہتی تھی شہؑ کی بہن ہائے حسینؑ غریب بے کفن و بے وطن ہائے حسینؑ غریب
آگے کہے کیا دبیرؔ ہلتا ہے عرشِ قدیر کہتی ہے شہؑ کی بہن ہائے حسینؑ غریب

دبیرؔ کے نوحوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ان لوگوں کے حال کا ہی نوحہ لکھا ہے کہ جن سے اہل حرم کو زیادہ شیفتگی والفت تھی چنانچہ میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے بیٹے حضرت علی اکبرؑ سے اہل حرم کو امام عالی مقامؑ کے بعد جو الفت وعقیدت تھی وہ دوسروں سے نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف امام حسینؑ کے فرزند ہی نہ تھے بلکہ وہ شبیہ رسولؐ بھی تھے اس لحاظ سے وہ سبھی کے لیے منظورِ نظر اور آنکھوں کا تارا تھے۔ظاہر ہے کہ ایسے فرزند سے ماں کو کس قدر الفت وعقیدت ہوگی اس کا اندازہ ظاہر بین نگاہیں نہیں کر سکتیں۔مرزا دبیرؔ نے بیٹے کے تئیں ماں کی محبت کو جس انداز سے نظم کیا ہے وہ قاری کو فرط الم میں مبتلا کر دیتی ہے ؎

جبیں پر خوں انگوٹھی منھ میں پھل برچھی کا سینے میں نہ بھولے گی کبھی یہ شان،میرے نامراد اکبرؑ

مرزا دبیرؔ نے صرف ایک مصرعے میں اس پورے واقعے کو نظم کر دیا ہے جن واقعات کا سامنا حضرت علی اکبرؑ کو کرنا پڑا تھا اور پھر دوسرے مصرعے میں ماں کی زبانی اس واقعہ کے جانکاہ مناظر کو فراموش نہ کرنے کا ذکر کر کے جس انداز سے ماں کے تاثرات کو نظم کیا ہے اس سے قاری کے دل کو جو ٹھیس اور چوٹ پہنچتی ہے وہ انسان کو خون کے آنسو رلانے پر مجبور کر دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حضرت علی اکبرؑ کی نرالی شان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

دراصل نوحہ مرنے والے کے سلسلے میں ذاتی تاثرات غم کا نام ہے چنانچہ جناب علی اکبرؑ کی ماں کی زبانی دبیرؔ نے جس انداز سے تاثراتِ غم کو نظم کیا ہے وہ ان کی نوحہ نگاری پر قدرت کاملہ کا بیّن ثبوت ہے مثال کے طور پر ذرا حضرت علی اکبرؑ کے نوحے کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

بھلے چنگے گئے گھر سے اور آئے مرکے باہر سے پدرششدر ہے ، ماں حیران ، میرے نامراد اکبرؑ
جگر پر ہاتھ دھرتے ہو ، تڑپ کر آہ بھرتے ہو یہاں برچھی ہے یا پیکان میرے نامراد اکبرؑ

ماں کے اس بین کا تاثر دبیرؔ کی زبانی سنئے:

دبیرؔ اک حشر تھا برپا ، یہی بانوؑ کی زاری تھی مرے غازی ، مرے ذیشان میرے نامراد اکبرؑ

مرثیے ہوں یا سلام یا نوحہ ہی کیوں نہ ہو رثائی شاعری کے جملہ اصناف میں حضرت امام حسینؑ اور جناب سکینہؑ کی محبت کو شعراء نے اس قبیل سے نظم کیا ہے کہ باپ کو بیٹی سے اور بیٹی کو جو باپ سے محبت ہے اس کا قاری کو بھرپور اندازہ ہو سکے۔لیکن دبیرؔ نے اپنے مراثی کے علاوہ نوحوں میں بھی جنابِ سکینہؑ کی محبت وشیفتگی کو جس انداز سے نظم کیا ہے وہ ہمیں میر انیسؔ کے علاوہ دیگر شعراء کے یہاں بہت کم نظر آتا ہے۔ جنابِ سکینہؑ کی زبانی دبیرؔ نے جو نوحہ نظم کیا ہے وہ غم والم کے ایسے ماحول میں انسان کو پہنچا دیتا ہے کہ انسان رنج وغم سے نڈھال ہو جاتا ہے۔ جنابِ سکینہؑ کی حالت زار دبیرؔ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

اس زور سے دُر کھینچے مرے کان سے بابا جو کان ہیں زخمی سر ننگے پھرایا مجھے بازاروں میں دردر، پیارے مرے بابا
رستے میں اگر دیکھ کے میں روتی تھی بابا، سر نیزے پہ تیرا ہر جا پہ گھڑکتا تھا مجھے شمر ستمگر، پیارے مرے بابا
تم کو تو قضا لے گئی اب کون سلائے، سینہ پہ مجھے آہ اب کون مجھے بیٹی کہے گود میں لیکر، پیارے مرے بابا

مرزا دبیرؔ کے اس نوحے میں صرف سوز وغم کی ہی کیفیت نہیں بلکہ بیٹی کو جو باپ سے عقیدت والفت ہے اس کا بھی بیان بہت ہی حسین انداز میں کیا گیا ہے۔ جسے پڑھ کر قاری دبیرؔ کی نوحہ نگاری پر قدرت کاملہ کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دبیرؔ نے اپنے نوحوں کو معمولی معمولی پابندیوں سے بھی آزاد رکھا ہے ان کے نوحوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے نوحوں میں ان واقعات کو بھی نظم کیا ہے کہ جن کا تاریخ میں تذکرہ ملتا ہے۔ چونکہ نوحہ کسی ایک ذات کے احوال ومصائب سے متعلق رہتا ہے اسی لئے دبیرؔ کے بیشتر نوحے کسی ایک ذات ہی سے متعلق رہتے ہیں۔ چنانچہ امام حسینؑ سے جناب شیریں کو جو عقیدت تھی اس عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شیریں کی زبانی امامؑ کی بیکسی وتنہائی کو جس انداز سے نظم کیا ہے وہ یقینا دبیرؔ کا ہی حصہ ہے ؎

شیریں نے کہا یہ سر شبیرؑ سے روکر، ہے ہے مرے آقا افسوس پھرا آپ کے حلقوم پہ خنجر ہے ہے مرے آقا
اک قطرہ نہ پانی کا دم نزع پلایا، پیاسا ہی کیا قتل بے رحم تھا کیسا وہ لعیں شمر ستمگر، ہے ہے مرے آقا
حیواں کو دم نزع پلادیتے ہیں پانی، یہ رسم جہاں ہے پیاسا ہی تمہیں قتل کیا سینے پہ چڑھ کر ہے ہے مرے آقا
پانی نہ ملا آپ نے مانگا تھا کئی بار، ہے ہے تہ خنجر پیاسے ہی گئے آپ جہاں سے لب کوثر، ہے ہے مرے آقا
فرمایا تھا وعدہ کہ ضرور آؤں گا شیریں، مہمان ترے گھر سو آپ کا وعدہ ہوا دنیا میں برابر، ہے ہے مرے آقا

دبیرؔ کے نوحوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بلا جھجک یہ کہا جاسکتا ہے کہ دبیرؔ کے نوحے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور ان کے نظم کیئے گئے نوحے ''نوحہ'' کہے جانے کے مستحق بھی ہیں جس کے ثبوت کے لیے جناب علی اصغرؑ کے حال کا نوحہ ''ماں بولی کہ اب ضبط کا یارا نہیں اصغرؑ'' کے چند اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جس سے قاری کو دعوی کی دلیل بخوبی مل سکتی ہے ؎

بیکس کہوں، سید کہوں یا بے کفن اے لال نام اتنے ہیں، اک نام تمہارا نہیں اصغرؑ
پھر لاش کو لپٹا کے کلیجے سے یہ بولیں واللہ ترا ہجر گوارا نہیں اصغرؑ
ظالم نے کلیجے پہ مرے تیغ پھرائی یہ تیر گلے پر تیرے مارا نہیں اصغرؑ

دبیرؔ کا یہ بھی کمال ہے کہ وہ نوحوں میں قرآن کریم کی آیتوں کو اس انداز سے نظم کرتے ہیں کہ وہ آیت شعر کا جزو لاینفک معلوم ہوتے ہیں ؎

سمجھ کے ترجمہ، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ہوا محبت حق میں فنا حسینؑ حسینؑ

الوداع نوحہ کی ہی ایک قسم ہے جس میں انتہائی غم والم کے ساتھ شہدائے کربلا کو الوداع کہا جاتا ہے چنانچہ ایام محرم کے اختتام پہ عزا کے رخصت کی کیفیت کو اکثر شعراء نے نظم کیا ہے۔ لیکن مرزا دبیرؔ نے جس انداز میں امام کی رخصتی کو نظم کیا ہے اس کا انداز ہی جداگانہ ہے۔ امام سے وداع کا بیان دبیرؔ کی زبانی جو ملتا ہے اس میں جس قدر سوز والم کی کیفیت ہے اسے سن کر قاری غم کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے ذرا دبیرؔ کا

یہ نرالہ انداز ملاحظہ تو فرمائیں ؎

لو یارو الوداع دم شور و شین ہے اب تم سے سال بھر کو وداع حسینؑ ہے
ماتم بھی آخری ہے یہ مجلس بھی آخری اب تم سے سال بھر کو وداع حسینؑ ہے

حضرت امام حسینؑ کی چہیتی بیٹی جناب سکینہؑ کی رخصتی دبیرؔ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں ؎

ننھے ہاتھوں سے کمر پکڑے سکینہؑ کہتی تھی ہائے بابا ، ہائے سیّد ، ہائے سرورؑ ، الوداع
ہائے اب کھینچے گا زلفیں میری شمر بے حیا ہائے اب چھن جائیں گے کانوں سے گوہر الوداع
الوداع اے تین دن کے بھوکے پیاسے الفراق الوداع اے تشنہ لب آقائے کوثر الوداع

دبیرؔ کے نوحوں میں سلاست وروانی، سوز وغم، رنج والم کی جو کیفیت نظر آتی ہے وہ دبیرؔ کو دیگر نوحہ گویوں سے ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے نوحوں میں اس بات کا خصوصی طور پر لحاظ رکھا ہے کہ کلام میں روانی وشستگی کے ساتھ ساتھ غم والم کی وہ کیفیت باقی رہے کہ جس بنا پر نوحے کو ''نوحہ'' کہا جا سکے۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دبیرؔ نے صنف نوحہ نگاری میں نوحہ گویوں کیے لیے وہ اصول متعین کیئے ہیں جو نوحہ نگاروں کے لیے آج بھی مشعل راہ ہیں۔ کیونکہ نوحہ کا وصف خاص مبکی ہونا ہے چنانچہ دبیرؔ نے آیاتِ الٰہی اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں گریہ وبکا کی رمز آفرینی کو انتہائی کمالِ فن سے اپنے نوحوں میں پیش کیا ہے آج جب کہ نوحہ نگاری اپنے بام عروج کو پہنچ چکی ہے لیکن دبیرؔ اور مرزا دبیرؔ کے معاصرین نے جو نقوش ثبت کیئے ہیں اس سے ہٹ کر نوحہ کی کوئی شکل گریہ وبکا کی ضامن نہیں بن سکتی۔ خصوصاً مرزا دبیرؔ نے اپنے نوحوں میں نوحہ کی اس کیفیت کو اجاگر کیا ہے جو زبانِ عصمت وطہارت سے ادا ہو کر دلوں کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی اور جس کے تار ہائے غم آج بھی دلوں کو جھنجھنا رہے ہیں۔

☆☆☆

(۱) دولھا صاحب عروج، جوش ماتم، حصہ اول
(۲) نفس المہموم، صفحہ ۲۷۵، ناسخ التواریخ، صفحہ ۳۵۳
(۳) دبستان دبیر، صفحہ ۲۴
(۴) نظارہ، لکھنؤ، ابوالفصل العباس نمبر ۱۴، جون ۱۹۱۶ء

''فروغِ مرثیہ'' کا (اٹھارہواں شمارہ) انیسؔ نمبر شائع ہو گیا ہے

صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۸۰۰ روپے

ایڈیٹر
اصغر مہدی اشعر

''دبیرؔ کے مرثیے'': اک مہم جو سر ہونے کو ہے

عادلؔ مختار

دنیائے ادب کے عجائب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ غیر مطبوعہ مرثیوں کی تعداد مطبوعہ مرثیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر اس سے بھی عجیب تر معاملہ ان مطبوعہ مرثیوں کا ہے جو اپنی اشاعت کے بعد بھی یا تو ناپید ہو گئے یا اس قدر شکستگی اور خستگی کا شکار ہو گئے کہ ان کی تجدید نہ ہو سکی۔ رثائی ادب سے ریاستی اور عوامی بے اعتنائی تو ایک کھلی حقیقت ہے مگر اس میدان کے خواص کی غیر سنجیدگی کو بھی ہم اس وقت شدّت کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں جب ہم مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کا اصل حجم اور ان کے آثار و باقیات میں نسبت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دبیر کے کلام کے حجم کا اندازہ لگانا ہو تو اردو کے برومند نقّاد فراقؔ گورکھپوری فرماتے ہیں کہ ''دبیرؔ کا ذخیرۂ کلام اس قدر زیادہ ہے کہ عام قاری اس بحرِ زخار کی پیرا کی کر ہی نہیں سکتا''۔

اگر دبیرؔ کے مرثیوں کے آثار و باقیات کے جمع و تحفیظ کا اندازہ لگانا ہو تو اردو ادب کے نامور محقّق ڈاکٹر ہلالؔ نقوی صاحب فرماتے ہیں:

''دفترِ ماتم کی ۲۰ جلدیں اردو زبان اور ادب کے سامنے ایک سوالیہ نشان کی طرح مہر بہ لب ہیں۔ گزشتہ صدی کے نصف دوم میں دبیرؔ کے کئی مرثیے مجموعوں کی صورت میں سامنے آئے تو ہیں لیکن ایسے کام ایک دو جلدوں کے بعد تھم گئے''

سابق مشیرِ اعلیٰ اردو لغت بورڈ، جناب عقیلؔ عباس جعفری فرماتے ہیں:

''دبیرؔ کے مرثیے ایک طویل عرصے سے ناپید تھے۔ کسی زمانے میں دبیر کے رثائی کلام کی ۲۰ جلدیں ''دفترِ ماتم'' کے نام سے شائع ہوئی تھیں مگر پاکستان میں سوائے اردو لغت بورڈ اور علامہ ضمیر اختر نقوی کے کتب خانوں کے یہ تمام جلدیں کہیں موجود نہیں تھیں

اب ان بیانات سے دبیرؔ کے مرثیوں کے حجم اور ان کی موجودہ باقیات کے درمیان ہوش ربا نسبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے عالم میں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اس وقت اردو ادب کے شعبۂ تحقیق کے لیے سب سے بڑی مہم مراثیٔ دبیر کی جمع آوری اور اشاعت ہے۔ اگر یہ کہنا جائز ہے تو یہ مہم ''فروغِ مرثیہ'' کے مؤسس، باہمت محقّق اور ادیبِ مفید جناب اصغر مہدی اشعر سر کرنے کو ہیں۔ قدرت نے شاید اپنی بے نیازی کے اظہار کے طور پر اس قحط الرجال میں یہ کام کراچی کی این ای ڈی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اک انجینئر سے لیا ہے جو ایک عرصے سے کینیڈا میں مقیم ہیں اور یہ دبیرؔ کے تمام مطبوعہ مرثیے دوبارہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھا چکے ہیں۔

اس حوالے سے اشعر صاحب کا کہنا ہے کہ ''دفترِ ماتم'' کے علاوہ بھی تقریباً چونتیس کتابوں میں دبیر کا کلام آج تک چھپا مگر ان میں سے اکثر جگہوں پر بہت ہی بے ترتیب اور غلطیوں سے پر کلام تھا۔ اور اس میں مؤلفین نے، شاید عجلت میں، یہ بھی کیا کہ تین تین مرثیے ایک مرثیے میں کر کے چھاپ دیے یا دو دو مرثیے ایک مرثیے میں شامل کر کے چھاپ دیے۔ اس کے علاوہ صحتِ متن کے حوالے سے بھی دقّت کا احساس نہیں ہوتا۔

اشعر صاحب نے جب ''فرہنگِ دبیر'' پر کام شروع کیا تو اس میں انہوں نے دبیر کے ۴۵۶ مرثیوں کا اشاریہ بھی مرتّب کیا تھا۔ اس حوالے سے یہ بات ذہن نشین رہے کہ اشعر صاحب سے قبل دبیرؔ کا مفصل اشاریہ اگر کسی نے سب سے بہتر لکھا تو وہ ''تلاشِ دبیرؔ'' میں کاظم علی خان صاحب نے لکھا۔ اس حوالے سے انھوں نے بہترین کام کیا ہے مگر وہ بھی ۳۵۰ یا ۳۶۰ مرثیوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

اصغر مہدی اشعر صاحب کی ڈاکٹر ہلالؔ نقوی، ڈاکٹر عقیل عباس جعفری اور سیّد جاوید حسن صاحب سے تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی اور یہ طے پایا کہ ''فرہنگِ دبیرؔ'' میں جو طویل فہرست ہے دبیرؔ کے مرثیوں کی اسی پر کام کیا جائے اور اس طرح اشعر صاحب نے وہ ۴۵۶ مرثیے جو ''فرہنگِ دبیرؔ'' کے اشاریہ میں ذکر کیے گئے انہیں منصۂ شہود پر لانے کا عزم کیا۔ اشعر صاحب کا مذکورہ ۴۵۶ مرثیے نو جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس وقت جب کہ یہ تحریر لکھی جا رہی ہے ''دبیر کے مرثیے'' کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ان پانچ جلدوں میں دبیرؔ کے ۲۳۱ مرثیے محفوظ ہو چکے ہیں۔ اشعر صاحب ایک صاحبِ ارادہ شخص ہیں اور ان کہنا ہے کہ دبیر کے مذکورہ مرثیے ۲۰۲۵ء کے آخر تک شائع ہو جائیں گے۔

قدیم نسخوں کی نہ صرف تجدید کرنا، ان کی تاریخ کو محفوظ رکھنا اور جدید طرزِ اشاعت کے ذریعے نئے زمانے کے سامعین تک ان کی رسائی ایک پیچیدہ اور جان کاہ عمل ہے بلکہ دھندلی لکھائی کو سمجھنا، لسانی تبدیلیوں اور ثقافتی اختلافات سے پیدا ہونے والے ابہام کو حل کرنے کے لیے اشاریہ یا لغت ترتیب دینا بھی نہایت مہم ہے۔ یہ محقق کی پیشہ ورانہ اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اسی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے جب ''دبیرؔ کے مرثیے'' کی نو جلدیں مکمل ہو جائیں گی تو ان ۴۵۶ مرثیوں کے محاسن و خصوصیات اور تحقیقی زاویوں کو اجاگر کرتا ہوا ایک مفصل اشاریہ دسویں جلد کی صورت میں ۲۰۲۶ء میں شائع ہوگا۔

''دبیرؔ کے مرثیے'' ایسی مشکل ترین مہم کو سر کرنے کے لیے رہنمائی کا ذکر کیا جائے تو سب پہلے ڈاکٹر ہلالؔ نقوی صاحب کا نام آئے گا۔ اشعر صاحب کا کہنا ہے کہ ''فرہنگِ دبیرؔ'' کی ترتیب کے دوران اور اس کے بعد اس بات پر زور دینا کہ اشاریے میں مذکور مرثیے آنے چاہیے تو اس باب میں ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کا نام سرِفہرست ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر عقیلؔ عباس جعفری اور سیّد جاوید حسن صاحب بھی اس پر اصرار کرتے رہے اور ہمت افزائی فرماتے رہے۔

اس وقت ''دبیرؔ کے مرثیے'' ایسے بحرِ ذخار کی پیراکی آگ کا دریا اور ڈوب کے جانے کے مترادف ہے اور اس پیراکی میں وہ صاحب جو پیش پیش نظر آتے ہیں وہ اس کتاب کے کمپوزر ریحان احمد صاحب ہیں اور ان کا شاملِ مہم ہونا بہت برکت کا باعث بھی ہے کیونکہ یہ مرثیے کے آدمی ہیں۔ یہ وہی ریحان احمد ہیں جنہوں نے علامہ ضمیر اختر نقوی کی کتابوں کے ساتھ کمپوزنگ کے حوالے سے مکمل انصاف کیا ہے۔

اس کے بعد جناب جوہرؔ عباس صاحب کی پروف ریڈنگ ''دبیرؔ کے مرثیے'' کے حوالے سے مزید اعتماد کا باعث ہے۔ جوہرؔ عباس صاحب آبروئے تحریر و تقریر سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ زبان و بیان کی حرمت کے ایک بیدار اور متحرک پاسدار ہیں۔ پروف کے حوالے سے ان کا نام بالیقین متن کی صحت کی ضمانت ہے۔

اس مہم میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے حوالے سے اردو لغت بورڈ سے وابستہ طارق بن آزاد کا بھی ذکر ضروری ہے۔ ''دفترِ ماتم'' کا جب بھی کوئی صفحہ دستیاب نہ ہو، یا کوئی صفحہ کٹا ہوا یا پھٹا ہوا ہوتا ہے تو یہ اشعر صاحب کے ساتھ بہت تعاون کرتے ہیں اور اس حوالے سے بہت محنت کرتے ہیں اور وہ الفاظ جو سلائی کے اندر دب جاتے ہیں ان کو بھی ان کے سامنے لے آتے ہیں۔

دیگر کئی کتب اور ''دبیرؔ کے مرثیے'' کی اشاعت کے علاوہ اصغر مہدی اشعر کے فنافی الرثاء ہونے کے ثبوت کے طور پر یہ بات بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ یہ تمام مرثیے اپنی تکمیل کے بعد رثائی ادب کے سب سے بڑے مرکز www.emarsiya.com پر پی ڈی ایف میں دستیاب ہوں گے جہاں قارئین اور محققین اپنی ضرورت کے مطابق انتخاب کو ڈاؤنلوڈ کرسکیں گے۔ جناب افتخار عارف صاحب فرماتے ہیں:

''پچھلی نصف صدی میں'' رثائی ادب'' ہلالؔ نقوی اور تقیؔ عابدی نے مطالعاتِ دبیرؔ کو معیار و اعتبار عطا کیا۔ اشعر کا کام اس روایتِ جلیلہ کی توسیع ہے۔ ایک لائقِ تحسین و ستائش توسیع۔ دبیرؔ کے مرثیوں کی نو جلدیں اور فرہنگیں ایک مستقل دائرۂ معارف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ''لہٰذا، نول کشور، سید مرتضیٰ حُسین فاضل لکھنوی، ڈاکٹر ہلالؔ نقوی اور ڈاکٹر تقی عابدی کی عرق ریز تحقیق سے منصۂ شہود پر آنے والے دبیرؔ کے معروف مگر قلیل مرثیوں نے ہی ایک زمانے سے سامعین کو مبہوت اور مسحور کر رکھا ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ اب اشعر صاحب کی ''دبیرؔ کے مرثیے'' کی صورت میں اور emarsiya پر ان کی عالمی سطح پر اشاعت سے، آنے والے زمانے اس سے بڑھ کر مسحور اور مبہوت رہیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ دبیرؔ فہمی اور دبیرؔ پر تنقید اور تحقیق کے نئے باب کھلیں گے۔

❁❁❁❁

رباعیات در مدح مرزا دبیرؔ علیہ الرحمہ

قیصر عباس قیصر

(۱)

مضمونِ تولاّ کے عطارد کی ثنا — تنظیمِ تبرا کے عطارد کی ثنا
توفیق خدا دے تو ابھی ہوجائے — اردوئے معلّیٰ کے عطارد کی ثنا

(۲)

انسان محبت میں غدیری ہوتے — ناقد نہ اگر یار شریری ہوتے
انصاف کیا جاتا تو اکثر شاعر — لکھ لکھ کر مرثیہ دبیریؔ ہوتے

(۳)

ملتی نہیں مرزا کی زمانے میں نظیر — حیدرؑ ہیں بلا فصل محمدؐ کے وزیر
اعلان یہی کر کے گئے دنیا سے — مضبوط عقائد کے ہیں مالک دبیرؔ

مرزا دبیرؔ کی غزلیہ شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر وفاؔ نقوی

مستند حوالوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مرزا سلامت علی دبیرؔ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں غزلیں بھی خوب کہیں لیکن جب مدحِ اہلِ بیت کو انھوں نے اپنا طرۂ امتیاز بنایا اور باقاعدہ ذاکرِ حسینؑ اور ایک مرثیہ نگار کی حیثیت سے ان کا شہرہ چار دانگِ عالم میں ہوا تو انھوں نے اپنی غزلوں کی اشاعت سے گریز کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام کے مجموعوں میں ان کی غزلیں نہیں ملتیں۔ اس کے باوجود ان کے چاہنے والوں اور کلام کے یکجا کرنے والوں نے کہیں کہیں سے ان کے چند غزلیں جمع کیں یا ان کی غزلوں کے کچھ اشعار ان کے ہاتھ لگ گئے تو وہ اردو ادب کے قارئین تک پہنچ گئے۔

جب ہم مرزا دبیرؔ کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا بخوبی انداز ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور بھی کتنا شعور مند اور انفرادیت کا متحمل تھا۔ ظاہر ہے وہ لکھنؤ کے دبستان سے وابستہ تھے اور وہاں ناسخؔ و آتشؔ کے ساتھ ساتھ دیگر معتبر غزل گو شعراء بھی اردو شاعری کو نئے مزے، نئے آہنگ اور نئی فضا سے ہمکنار کرنے کی شعوری کوشش کر رہے تھے جو لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کی عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ عیش و عشرت سے بھی لبریز تھی۔ یہاں دل کی شاعری نہیں بلکہ دماغ کی شاعری ہوتی تھی۔ یعنی داخلیت کو پسِ پشت کرتے ہوئے خارجیت کا رنگ زیادہ سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہی وہ دور تھا جب ناسخؔ جیسے استاد شاعر کی اصلاحی تحریک مشہور تھی جس کے زیرِ سایہ نو واردانِ سخن کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی طبع آزمائی میں مصروف و مشغول تھے۔ اس دور میں جب کوئی غزل کی عام روش سے ہٹ کر کچھ کہتا تو اس کو اس دور کے ادبی ذوق کے مطابق خاطر میں لانا مشکل ہوتا تھا۔ اسی لئے مرثیہ نگار کے لئے ''بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو'' مشہور تھا۔ اس ماحول میں ظاہر ہے کہ کوئی شاعر اگر روش سے ہٹ کر بھی اپنی نگارشات پیش کرتا تھا اس کے باوجود بھی وہ مکمل طور سے اپنے ادب کے اجتماعی مزاج سے کنارہ کش نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مرزا دبیرؔ کے ہمعصر شاعر میر انیسؔ یا دوسرے شعراء کے مراثی یا سلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں تغزل کے عناصر نمایاں طور پر ملتے ہیں لیکن یہ بات بھی حق ہے کہ مرزا دبیرؔ نے اپنے سلاموں میں کافی حد تک غزل کے عناصر سے دامن محفوظ رکھا مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر انیسؔ کی طرح ان کے مراثی بھی تغزل سے ہمکنار ہیں۔

ہم یہ ببانگِ دہل کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی شاعر تغزل سے بچ کر نہیں گزر سکتا اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ شاعر کی شاعری کا آغاز غزل سے ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ غزل کا تعلق انسانی جذبات و خیالات سے نہایت مضبوط ہے۔ جب کوئی شاعر ابتداء میں طبع آزمائی کرتا ہے تو غزل کا شعر ہی اس کے ذہن میں وارد ہوتا ہے اور وہ اس کو سنا کر یا شائع کر کے قلبی سکون حاصل کرتا ہے اور خود کو شعراء کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔ اب یہ الگ بات کہ آگے چل کر اس کا ذوق تبدیل ہونے کی وجہ سے وہ کسی اور صنف کا سفر اختیار کرے۔ مرزا دبیرؔ کا بھی یہی معاملہ ہے

انھوں نے شروعات میں بہترین غزلیں تصنیف کیں جو ان کے دور کے ادبی ماحول کی خوبصورت تصویر کشی کرتی ہیں۔مثلاً:

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں قبر بلبل کی بنے گلزار میں
اپنے یوسف کا عزیزوں ہوں غلام چاہے مجھ کو بیچ لے بازار میں
سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا پھل لگا ہے آج نخلِ دار میں
سر کے کٹنے کا مجھے کچھ غم نہیں خم نہ پڑ جائے تری تلوار میں
قبر میں روزن مری رکھنا ضرور مر گیا ہوں انتظارِ یار میں
میرا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی خون کے چھاپے لگے دیوار میں
گرمیٔ خوں کی مرے تاثیر دیکھ پڑ گئے چھالے تری تلوار میں
بعد مردن میرے لاشے کو دبیرؔ جاکے رکھنا کوچۂ دلدار میں

اگر اس غزل کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو ہمیں بخوبی اندازا ہوسکتا کہ مرزا دبیرؔ اس سلسلے سے مبتدی ہونے کے باوجود اپنے دور کے ادبی ذوق کے بہترین مبصر نظر آتے ہیں۔ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مرزا دبیرؔ نے غزل کے فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشعار کو محدود نہیں بلکہ معنی و مطالب کی وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔اس میں ان کا عقیدہ اور مذہبی شعور بھی مترشح ہے۔

مطلع دیکھیں تو ایک سچے عاشق کی خواہش عیاں ہے کہ جب وہ مرجائے تو اس کو کوئے یار میں دفن کیا جائے۔اس ضمن روایتی شاعری کا ذوق ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بلبل کو عاشق سے اور محبوب کے کوچے کو باغ سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن یہ شعر اگر اپنے معنی و مطالب میں یہیں تک محدود رہے تو پھر مرزا دبیرؔ کا کمال کیا ہوا۔بغور دیکھیں تو اس شعر میں شاعر کی عقیدت بھی عیاں ہے۔یہاں ''کوئے یار'' سے مراد متبرک مقامات بھی ہوسکتے ہیں جہاں رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے ایام گزرے مثلاً مدینہ، نجف، کربلا وغیرہ وغیرہ اور ایک محبِ اہلِ بیت ان مقامات میں پیوندِ خاک ہونا اپنے لئے توشۂ آخرت جانتا ہے۔

دوسرا شعر تلمیح پر مشتمل ہے۔اس دور کا خاصہ یہ ہے کہ شاعر اپنے محبوب کو یا تو یوسفؑ سے مثال دیتا ہے یا بعض مرتبہ محبوب کو حضرت یوسفؑ پر فوقیت دے دیتا ہے لیکن دبیرؔ نے مبالغے سے کام نہ لیتے ہوئے میانہ روی سے کام لیا ہے۔انھوں نے اپنے محبوب کو یوسف ضرور کہا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ 'یوسف' میں کوئی مادی محبوب ہی سانس لے رہا ہو۔اس شعر کی حدود نورانی کیفیتوں سے بھی ہمکناری کا احساس دلاتی ہیں۔

عام طور سے غزل میں محبوب کو قاتل سے مشابہ کیا گیا ہے اور اس کا کردار ایک ظالم اور ستمگر کی طرح ہمیں نظر آتا ہے لیکن کوئی ضروری نہیں کہ مرزا دبیرؔ کہیں:

سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا پھل لگا ہے آج نخلِ دار میں

تو یہاں ایک روایتی محبوب سے ہی مراد ہو۔بڑا شاعر ہمیشہ روایت سے استفادہ کرتے ہوئے روایت شکنی بھی کرتا ہے۔اس شعر کے پہلے مصرعے سے دنیا میں رونما ہونے والے حادثات و سانحات کے ساتھ ساتھ خونچکاں واقعات بھی اپنی کہانی سناتے ہیں۔تاریخِ اسلام میں ہی دیکھیں ظالم حکمرانوں اور جابر بادشاہوں نے حق پرستوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر ان کے سروں کو سنانوں پر یا قلعے کی دیواروں پر بلند کیا تاکہ عوام الناس میں زیادہ سے زیادہ خوف کا ماحول عام کرسکیں۔

اگلا شعر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے کہ عاشق سر کے کٹنے کا غم نہیں کرتا بلکہ اپنے قاتل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

خم نہ پڑ جائے تری تلوار میں

یعنی عاشق کا قتل عاشق کی موت کا نہیں بلکہ قاتل کی ہی فنا کا سبب بن سکتا ہے۔ یہاں مقتول ایک عام حق پرست بھی ہوسکتا ہے اور وہ شخصیت بھی ہوسکتی ہے جو شہادتوں کا وقار اور سید الشہداء بن کر کون ومکاں میں نگاہِ معبود میں امتیاز حاصل کرتی ہے اور رب جسے نفسِ مطمئنہ کا قرار دیتا ہے۔

اردو غزل میں انتظارِ یار پر مبنی مضامین عام طور سے قدم قدم پر موجود ہیں لیکن مرزا دبیرؔ کی غزل کا اگلا شعر صرف مادی محبوب کے انتظار اور اس کے مسائل تک محدود نہیں بلکہ یہ اس کا انتظار بھی ہوسکتا ہے جس کا انتظار ساری دنیا کر رہی ہے جس کے دیدار کی خواہش میں نہ جانے کتنے لوگ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے جس کے ظہور کی دعا برسوں سے مانگی جا رہی ہے لیکن اس کا ظہور مرضئ الٰہی کے تحت ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ شخصیت قائمِ آلِ محمد امام مہدیؑ آخر زماں کی ہوسکتی ہے۔

عاشق کا مرنا اور محبوب کے گھر شادی کا ماحول ہونا۔ دبیرؔ کے دور کے معاشرے کی طرف ذہن مبذول کرتے ہیں۔ غزل کا اگلا شعر ان کے دور کی رسم وروایات اور سماج کا آئینہ نظر آتا ہے۔

عاشق کا خون گرم ہوتا ہے اور قاتل کی تلوار جب اس کے سر کو کاٹتی ہے تو ممکن ہے قاتل کے گرمئ خون کے سبب قاتل کی تلوار پر چھالے پڑ جائیں، ظاہر ہے اگلے شعر میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے لیکن ہم اس شعر سے مرزا دبیرؔ کے مزاج کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا مزاج مرثیہ نگاری کی جانب کتنی تیزی سے رواں دواں تھا۔

غزل کا مقطع بھی نہایت خوبصورت ہے عاشق چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے جنازے کو محبوب کی گلی میں رکھا جائے تا کہ محبوب کی نگاہ اس پر پڑ سکے اور اس کی موت کامیاب ہو سکے۔ یہاں بھی وہی بات نظر آتی ہے کہ ہر محبِ رسولؐ وآلِ رسولؐ کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی قبر اس دیار میں بنے جہاں محبت وبخشش کی نگاہ عام ہے۔

اس غزل سے مرزا دبیرؔ کے مزاجِ غزل سے بخوبی آشنائی ہوجاتی ہے کہ وہ جہاں اپنے دور میں کہی جانے والی غزل کی نمائندگی کر رہے تھے وہیں اپنی مخصوص فکر کا بھی اظہار کر رہے تھے۔ یہی انداز ان کی دستیاب تمام تر غزلوں کا خاصہ نظر آتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

عجب ناز و ادا سے اس نے کاٹا میری گردن کو　　رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا

ظاہر ہے ناز وادا جیسے الفاظ لانا اس دور کے شاعرانہ مذاق کے زیرِ اثر ہے لیکن شعر کا پہلا مصرع:

رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا

ہماری فکر کو عصرِ عاشور کربلا تک لے جاتی ہے جہاں امام حسینؑ کو کند خنجر سے رک رک کر شہید کیا جا رہا تھا۔

مرزا دبیرؔ کا ہنر یہ بھی ہے کہ ان کی غزل کے اشعار چاہے مختلف معنی ومطالب کے تحت اپنی کارفرمائی دکھاتے ہوں لیکن ان کی غزل مجموعی طور پر غزل ہی رہتی ہے۔ اس میں ان کے دور کے پیشِ نظر لفظیات، مضامین اور صنائع بدائع کا طریقۂ کار صرف نظر ہی نہیں آتا بلکہ ایک تاثر بھی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اس دور کی شاعری کا ایک اسلوب یہ بھی تھا کہ اس میں لفظیات ایسی لائی جاتی تھیں جو عوام کے لئے ہی نہیں بلکہ خواص کے لئے بھی سامانِ حظ فراہم کرتی تھیں اور ان کے معیارِ ذوق پر مکمل کھری اترتی تھیں۔ مرزا دبیرؔ یہاں بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ کچھ شعر

دیکھیں:۔

اگر وہ غیرتِ شمشاد جائے سیرِ گلشن کو گلوئے سرو میں پہنا دے قمری طوقِ گردن کو
میں کشتہ ہوں کسی گل کے مسی آلودہ دنداں کا چڑھانا باغباں تربت پہ میری برگِ سوسن کو
سوادِ نامۂ اعمال کیا ہے اشک دھوئیں گے نہ شبنم نے کیا تبدیل رنگِ برگِ سوسن کو

ان اشعار میں قصیدے کی جھلک بھی نمایاں ہے اور ظاہر ہے قصیدے میں جن الفاظ کا استعمال ہوتا ہے ان کا شکوہ اور ولولہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کی غزلوں میں تغزل بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔غزل میں محبوب کے حسن کی تعریف عام بات تھی جو روایت کے زیرِ سایہ آج بھی نظر آتی ہے۔اس دور میں محبوب کے چہرے کے خال کو محبوب کے حسن میں اضافے کا باعث سمجھا جاتا تھا۔نہ جانے کتنے شعراء خالِ رخِ یار کے دیوانے ہوا کرتے تھے اور اس کو کبھی ماہتاب کبھی رات کبھی ستارے سے تشبیہ دینا عام بات تھی۔مرزا دبیرؔ بھی غزل کے اس انداز کو فراموش نہیں کرتے۔کہتے ہیں:

تل نمایاں نہیں ہے عارضِ جاناں کے تلے ہے ستارہ کوئی روشن مہِ تاباں کے تلے

اسی طرح ایک جگہ اور محبوب کے چہرے کے تل کا ذکر کرتے ہیں۔کہتے ہیں:

آشکارہ زلف کے حلقے سے خالِ یار ہے حلقۂ پرکار میں یا نقطۂ پرکار ہے

تل کو نقطۂ پرکار کہنا جہاں غزل کے حوالے سے شاعر کے ذہنِ رسا کی پہچان کراتا ہے وہیں نادر تشبیہ کا وجود بھی ظاہر ہوتا ہے۔

روایتی غزل میں عاشق کی فراوانی جذبۂ عشق کے تحت چاک گریبانی ایک عام بات تھی جس پر ناصح کا کردار نصیحت کرتا ہوا نظر آتا تھا گویا کہ عاشق کو عشق کے نقصان بتا کر اسے عشق سے متنفر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔مرزا دبیرؔ کہتے ہیں:

چاک سینے کو مرے دیکھ کے ناصح بولا لاکھوں ہی داغ ہیں تیرے گریباں کے تلے

لیکن یہ شعر مرزا دبیرؔ کا شعر ہے اگر کوئی معمولی شاعر ہوتا تو ہم اس کی تشریح محدود کر سکتے تھے یہ شعر ایک ایسے شاعر کا ہے جو ماتمدارِ حسینؑ ہے اور ظاہر ہے ماتم کے بعد سینے پر نشان بنتے ہیں اور ان نشانات پر بعض افراد طنز بھی کرتے ہیں یا ماتم سے اتفاق نہیں رکھتے یہاں ایسے افراد ناصح کا کردار ادا کرتے ہیں لیکن عاشق ناصح کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔

ایک سچا عاشق آہ وزاری کرنے کا عمل انجام دیتا رہتا ہے اور اسی میں اپنی زندگی محسوس کرتا ہے شعراء نے عاشق کی آہ کو مختلف تشبیہات سے یاد کیا ہے عام طور سے اسے برق سے بھی مثال دی گئی ہے۔مرزا دبیرؔ بھی یہاں پیچھے نہیں وہ مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:

اس کو مت برق سمجھ یہ جو فلک پر ہے چمک ہے دبیرؔ آہ تری گردشِ دوراں کے تلے

اردو غزل میں شراب کا ذکر عام نظر آتا ہے یہ الگ بات کہ یہ شراب ام الخبائث نہیں بلکہ علامتی طور پر متعدد معنی ومطالب کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔عاشق شراب پینا پسند کرتا ہے اور اس کا محبوب بھی اس کا ہم پیالہ وہم نوالہ ہو تو اس کی خوشی کی انتہاء نہیں رہتی لیکن محبوب عاشق سے غافل یا متنفر بھی ہوتا ہے اور وہ عاشق کے سچے جذباتِ عشق سے ناآشنائی کا اظہار کرتا ہے۔مرزا دبیرؔ کہتے ہیں:

مئے سے توبہ کی ستمگر نے غضب تو دیکھو جبکہ تیار مری خاک سے پیمانہ ہوا

عام طور سے اس دور میں بھی محبوب کی زلفوں کو سانپ سے نسبت دی جاتی تھی اور آج بھی راویت کے پاسدار شعراء اس سے گریز نہیں کرتے۔لیکن مرزا دبیرؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ محبوب کی زلفوں کے آگے سانپ کے سیاہ رنگ کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں۔کہتے ہیں:

زلف سے سانپ کو ہے کیا نسبت ایسے کالے غلام گھر کے ہیں

اس سلسلے سے ان کے یہاں طرح طرح کی تشبیہات در آئی ہیں۔وہ تاریکیٔ زمانہ کو محبوب کی کھلی زلفوں میں دیکھتے ہیں۔شعر ہے:

کسی کی کہیں زلف شاید کھلی ہے جو تاریک سارا زمانہ ہوا ہے

ان کے یہاں محبوب سے گفتگو کا انداز بھی نہایت دلکش انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔شعر ہے:

وہ ہنس ہنس کے کل مجھ سے یوں پوچھتا تھا تجھے کیا ہوا کیوں دوانہ ہوا ہے

غزل میں مشاہیر عشاق کا بیان بھی جا بجا ملتا ہے یا یوں کہا جائے کہ روایتی غزل ان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔مثلاً قیس وفرہاد ہر غزل گو کے یہاں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ان کا ذکر سچے عاشق کے لئے حوصلے کا باعث ہوکر اس کو عشق کی راہ میں مزید توانائی بخشنے کا سبب ہوتا ہے۔مرزا دبیرؔ بھی اس راہ میں کسی سے کم نہیں۔کہتے ہیں:

قیس و فرہاد اور جنابِ دبیرؔ دشت اور کوہ ان کے گھر کے ہیں

یعنی مرزا دبیرؔ قیس وفرہاد کا ذکر کرتے تو ہیں ان کی جانب مرغوب بھی ہیں لیکن ان سے مرعوب نہیں اسی لئے وہ اپنے عشق کو ان کے عشق سے زیادہ عظیم سمجھتے ہیں۔

غزل میں نامہ بر کا کردار بھی نہایت اہم ہوتا ہے یہ وہ شخص ہے جو عاشق کا پیام محبوب تک لے جاتا ہے اور عاشق محبوب کے جواب کا منتظر ہوتا ہے لیکن اکثر اس کے ہاتھ مایوسی ہی لگتی ہے۔مرزا دبیرؔ نے یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔وہ نامہ بر کے حوالے سے شعر کہتے ہیں:

چشم بر راہ گوش بر آواز منتظر بیٹھے نامہ بر کے ہیں

ظاہر ہے شعر عاشق کی اضطرابی کیفیت کی منظر کشی کر رہا ہے۔اسی طرح ایک اور شعر ہے:

قاصد جو نامہ لے کے پھرا کوئے یار سے رویا لپٹ کے خوب ہمارے مزار سے

یعنی عاشق کے پاس نامہ بر کو آنے میں اتنی دیر ہوگئی کہ عاشق مر بھی گیا اور دفن بھی ہوگیا جس کا سبب محبوب کی غفلت کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جائے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مرزا سلامت علی دبیرؔ کا میدان مرثیہ نگاری ہے۔ان کی غزل جو ان کی ابتدائی شعری فکر کی عکاس ہے ان کی پختہ شاعری یا ان کی مرثیہ نگاری کے قطعی ہم پلہ نہیں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اگر مرزا دبیرؔ صرف غزل کے ہی شاعر ہوتے تو اس وادی میں میرؔ و غالبؔ کے ہم رتبہ و ہم منصب ہوتے۔چونکہ ان کی ذات صرف اور صرف مدحِ رسولؐ و آلِ رسولؐ کے لئے مخصوص تھی۔اس لئے انھوں نے غزل کی شاعری سے کنارہ کشی اختیار کی۔واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو اردو ادب رثائی حوالے سے پائے تکمیل تک نہ پہنچتا۔بلاشبہ انھوں نے مرثیے کو جو مقام عطا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے اور یہی اردو ادب میں ان کی بقا کا وسیلہ ہے۔وہ اردو ادب کے زندۂ جاوید شاعر ہیں۔

❁❁❁❁

پنجاب میں دبیرؔ سے عقیدت کی تاریخ اور مستقبل

عادل مختار

ہمارے یہاں پنجاب میں دبیرؔ ایک تقدس مآب شاعرِ اہلبیتؑ ہیں۔ یہ بات انتہائی حیران کن ہے وہ دور کہ جس میں مضافات تو دور خود لاہور، قصور، چونیاں، اوکاڑہ، فیصل آباد، ساہیوال، شیخوپورہ، جھنگ اور بھکر ایسے شہروں میں بھی کلامِ دبیرؔ یا تو دستیاب نہیں تھا یا نادر تھا اور اگر کہیں دستیاب تھا تو عام نہیں تھا، اس دور میں بھی دبیرؔ ہی ایسا مرثیے کا شاعر تھا کہ جس کا سرائیکی ذاکری کے سبب پنجاب کے عزائی حلقوں میں مسلسل ذکر ہوتا تھا۔

پنجاب کے طول وعرض میں سرائیکی ذاکری کا ہمیشہ سے دور دورہ رہا ہے اور سرائیکی ذاکری کے نصاب میں فضائل اور مصائب کے دبیرؔ کے حوالے سے کچھ باقاعدہ مضامین بزرگ ذاکرین نے ترتیب دے رکھے تھے جو سینہ بہ سینہ سفر کرتے رہے ہیں اور منبر پر مسلسل پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے تو فضائل پر مبنی بیرِ العلم کی روایت ہے کہ جو بار بار منبر پر پڑھی جاتی رہی اور اسے مرزا دبیر اور زعفرِ جن کے پوتے کے واقعے کے ساتھ متصل کیا جاتا اور بعد میں ذکرِ شہادتِ امام مظلومؑ کیا جاتا۔

اس کے علاوہ یہ قصہ بھی منبر پر معروف تھا کہ دبیرؔ جب بھی کوئی مرثیہ کہتے تو نماز سے پہلے مصلّے کے نیچے وہ مرثیہ رکھتے اور بعدِ نماز جب وہ مرثیہ مصلاّ اٹھا کر دیکھتے تو اس پر امام حُسین علیہ السلام کی مہرِ مبارک ثبت ہوتی تھی۔

اگر مصائب کے مضمون کا ذکر کیا جائے تو ذاکری نصاب میں یہ مضمون کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا مضمون ہے مگر میں یہاں اختصار کے ساتھ عرض کروں تو ذاکر فضائل کی مذکورہ روایت کے بعد مصائب کے مضمون کی یہاں سے ابتدا کیا کرتا کہ مولاع کے یہی منظورِ نظر شاعر مرزا دبیرؔ نماز کے بعد لکھنؤ کی جامع مسجد میں بچوں کو درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک عورت اپنے بچے کو دبیرؔ کے پاس درس کے لیے چھوڑ کر جاتی ہے۔ بعد میں اس بچے کی محیر العقول حرکات دیکھنے کے بعد دبیرؔ اپنے حقِ استادی کا واسطہ دے کر اس بچے سے اس کی حقیقت معلوم کرتے ہیں تو وہ بچہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ زعفرِ جن کا پوتا ہے۔ مرزا صاحب کے اصرار پر زعفرِ جن سے دبیرؔ کی ملاقات ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے وہ کربلا کے واقعے کے بعد ہر وقت مصروفِ عزائے مظلومؑ رہتا ہے اور وہ دبیرؔ سے، چشم دید گواہ ہونے کے اعتبار سے، شہادتِ امام مظلوم علیہ السلام کا تفصیلاً ذکر کرتا ہے۔

دبیرؔ سے منسوب اسی واقعے سے اور زعفر کے انہی بیانات سے استفادہ کرتے ہوئے سرائیکی شعرا اور ذاکرین نے مجلس کے عزائی ادب میں بہترین شاعری کا اضافہ کیا کہ جواب ایک مستقل باب ہے سرائیکی ذاکری کا۔

دبیرؔ سے اس حد تک پنجابی اور سرائیکی ذاکرین کی عقیدت کی وجوہ اور اس کی مستند تاریخ مجھ پر واضح نہ ہو سکی۔ ''دبیر اور پنجاب'' کا عنوان

قائم کر کے ''جواہرِ دبیر'' کے مقدمے میں سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے پنجاب میں دبیر کے حوالے سے جو عقیدت پائی جاتی ہے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور اس کی بنیاد جاننے کی اپنی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ جھنگ سے اس حیرت ناک عقیدت کی بنیاد ڈھونڈتے ہوئے سید کسراں پہنچے وہاں بھی سب کو دبیریے پایا۔ اس کے بعد اسی جستجو میں ملتان کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے بزرگوں کو بھی دبیرؔ کا عقیدت مند پایا۔ مگر لکھتے ہیں کہ ملتان میں بھی دبیرؔ سے عقیدت تو ملی، عقیدت کی تاریخ نہ مل سکی''۔

آخر میں اپنی تمام تر تحقیق اور جستجو کے نتیجے کو سید مرتضیٰ حُسین فاضلِ لکھنوی ان الفاظ میں سمیٹتے ہیں:

''۱۸۵۷ء سے پہلے لکھنؤ کے رؤسا اور ان کے زیرِ اثر ماحول میں مرزا دبیر چوٹی کے شاعر و مرثیہ گو تھے لہٰذا جو مسافر لکھنؤ جاتا وہ مرزا صاحب کا چرچا سنتا، ان کا کلام دیکھتا تھا، لہٰذا واپسی میں یہی سوغات لے کر جاتا چنانچہ دبیرؔ کا نام اور کلام شہر شہر پہنچا اور ہر اردو داں کے لیے محبوب تحفہ ہو گیا۔''

فاضلِ لکھنوی کے اخذ کیے گئے اسی نتیجے پر میں ایک عرصے تک اکتفا کرتا رہا مگر امسال ۲۰۲۴ء میں عشرۂ محرّم الحرام کے سلسلے میں جب استاذی مولانا عزادار حُسین لاشاری (فاضلِ قُم) کا میرے گاؤں جمبر خورد آنا ہوا تو اس موضوع پر سیر حاصل بات ہوئی کہ جس میں علامہ صاحب نے فاضلِ لکھنوی علیہ الرحمہ کے نتائجِ تحقیق سے ہی بات کو آگے بڑھایا اور اس موضوع کے حوالے سے گراں قدر نکات کا اضافہ فرمایا۔ مولانا صاحب چونکہ جمالی بلوچاں، خوشاب، سے تعلق رکھتے ہیں، پھر سرائیکی ذاکری اور خطابت سے بھی تیس برس سے وابستہ ہیں اور کئی بزرگ ذاکرین اور علماء کے ساتھ آپ کے خاندان کے دیرینہ اور قدیم مراسم رہے ہیں اور ان سب سے بڑھ مولانا کے خاندان کے کئی بزرگ ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ میں قیام رکھتے تھے اور وہاں کی عزائی ثقافت کو وطن واپس آ کر پنجاب یا سرائیکی پٹی میں انھوں نے اپنے حلقوں میں رائج بھی کیا تو جب دبیر اور پنجاب کا ذکر ہوا تو مولانا نے جو تفصیل عطا کی اس میں میرے لیے حیرت سے بھرپور انکشافات تھے۔

مولانا عزادار حُسین لاشاری صاحب نے فرمایا کہ پنجاب کے طول و عرض اور سندھ کے کئی علاقوں میں سرائیکی ذاکری ہمیشہ سے چھائی رہی ہے۔ مگر ایک زمانہ ایسا بھی رہا ہے کہ آج جس انداز کی ذاکری رائج ہے سرائیکی ذاکری اس سے بہت مختلف تھی۔ اس وقت ذاکری، واقعات کی تفصیل ہو یا واقعۂ کربلا کے کرداروں کے مابین مکالمے ہوں وہ نثر کی بجائے قطعات کی صورت بیان کیے جاتے تھے۔ مثلاً امام حُسینؑ سے جناب عباسؑ کیا عرض کر رہے ہیں وہ ایک قطعہ اور امام حُسینؑ جناب عباسؑ سے کیا فرما رہے ہیں وہ دوسرا قطعہ ہوتا تھا۔ یعنی اس وقت کی ذاکری کلی طور پر شعری ذاکری تھی۔

ذاکری کا اُس وقت مذکورہ طریقہ رائج تھا کہ انیسؔ اور دبیرؔ کی زندگی میں ہی اس وقت کے معروف سرائیکی ذاکر شعرا نے ان کے کلام کو سرائیکی میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ یہ رسم جو چلی تو ایک عرصے تک برقرار رہی۔

ان حضرات میں سب سے نمایاں افراد سائیں سیّد علی شاہ کے خانوادے سے ظاہر ہوئے۔ خاص طور پر اس زمانے میں سائیں سید علی شاہ کے بیٹے جو ''شہزادے'' کہلاتے تھے، شہزادہ ملازم حُسین اور شہزادہ خادم حُسین، اور ان کے بعد پیر ظہور الحسن شاہ صاحب کا نام ایک معروف نام ہے، یہ تمام افراد انیس علیہ الرحمہ کے افکار اور کلام کا سرائیکی میں ترجمہ اور تتبع کیا کرتے تھے۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے

سید امتیاز حُسین شاہ (پہاڑ پور) آج بھی پنجاب کی ذاکری کا ایک معروف نام ہے۔

اس کے علاوہ وہ افراد جو خصوصیت کے ساتھ دبیر کے کلام کا، طرزِ سخن کا اور دبیر کے افکار کا سرائیکی میں تتبع کیا کرتے تھے وہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے، جسے مقامی زبان میں ''کچھی'' کہا جاتا ہے، سے تعلق رکھنے والے دیگر ذاکر اور شعرا تھے اور ان سب میں نمایاں نام سکندر خان جسکانی کا ہے کہ جنھوں نے دبیرؔ کے کلام کو شعر سے شعر سرائیکی میں ترجمہ کر کے ذاکری کے منبر اور عزائی ثقافت کی زینت بنایا۔

سرائیکی ذاکری اور اردو مرثیے کے تعلق کے حوالے سے ابھی تک کی تمام معلومات سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہیں مگر وسیب کے ادب کے نامور اور آبرومند محقق جناب صفدر کربلائی صاحب نے کتاب ''دبستانِ کچھی'' کو تالیف اور ترتیب دے کر اس بات کے ٹھوس شواہد اور ثبوت فراہم کر دیے ہیں کہ ابتدائی سرائیکی ذاکری کے نقوش بنانے میں اردو اور خاص طور پر انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں نے کس قدر بنیادی عمل انجام دیا ہے۔

دبستانِ کچھی میں صفدر کربلائی صاحب نے تقریباً ایک صدی پہلے کے چار بڑے سرائیکی مرثیہ گو شعرا سائیں سَیّد علی شاہ، مولوی نذر حُسین ترک، مولوی غلام علی لنگاہ اور شہزادہ خادم حُسین خلف سائیں سید علی شاہ کا بکھرا ہوا اور زمانے کی گرد میں دبا ہوا کچھ کلام دریافت کیا ہے۔ اگر ہم ان شعرا کے سرائیکی مسدسوں ہی کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ سرائیکی ذاکری میں انیسؔ کے اور مصائب کے بیان میں انیسؔ سے بھی بڑھ کر دبیرؔ کے مرثیوں کے کس قدر قوی اثرات پائے جاتے ہیں۔ وہ شعرا اور ذاکرین کہ جو انیس کا تتبع کیا کرتے تھے وہ بھی خاص طور پر مصائب کے مسدس لکھتے ہوئے دبیرؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چونکہ پنجاب میں عمومی طور پر دبیرؔ سے عقیدت کی تاریخ ہمارے پیشِ نظر ہے لہٰذا ''دبستاں کچھی'' سے بزرگ ذاکرین اور شعرا کے کلام کو اس گمان کی بدولت تشریک کیا جا سکتا ہے کہ ان شعرا اور ذاکرین نے دبیرؔ کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس سے استفادہ بھی کیا ہوگا اگرچہ خود ان ذاکرین کا کلام اور اس کا دبیرؔ کے کلام سے تقابلی جائزہ تحقیق کے حوالے سے مستقبل میں ایک عظیم کام ہو سکتا ہے۔

سیّد فعلی شاہ متوفی ۱۹۰۷ء مروّجہ سوز والی ذاکری کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔ طاہر شیرازی فرماتے ہیں ترجمہ: ''سائیں سید علی شاہ سرکار کا کلام پڑھ کر اس طرح لگتا ہے کہ جیسے مرثیہ نگاری ان جو کہ سید سردار پر برکت کے طور پر نازل ہوئی''۔ سید علی شاہ کے مسدس کے چند بند پیشِ کیے جا رہے ہیں: بیرؔ کے رنگ میں مصائب کی شدّت کا اظہار کرتے ہوئے اس مسدس کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

چنگا ہا کلمہ گویاں کوں ہدیہ ونڈاونڑا — ہدیہ کجا قرآن تے گھوڑے بھجاونڑا
یا کر کے ورقہ ورقہ مٹی وچ رلاونڑا — زخمی کوں زخم ڈیوونڑا ول ول ڈکھاونڑا
ورقے قرآنِ ناطق دے ریتاں تے رُل گئے — حافظ یزیدی فوج دے قرآن بھل گئے
زخماں توں خون جاری ہا شاہ بے قرار ہا — سانگے پڑھن نماز دے بیٹھا تیار ہا
سید دا خون فرش تے پانڑی دے کار ہا — پانڑی بغیر بیٹھا عبادت گزار ہا
تیمم دے کانڑ سید جیں پاسے لُڈ ونجے — مارے جو ہتھ زمین تے رت نال بُڈ ونجے

ایک مسدس میں شمر کا دامن جنابِ سکینہؑ کے ہاتھ میں ہے اور وہ فریاد کرتی ہیں:

شاہد ہے اللہ پاک سید بے قصور ہے — زخماں تو چور چور تے وطناں تو دور ہے
جے مر گیا ملاح تا مر ویسی پور ہے — سب پور پردے داراں دا رلنڑا ضرور ہے
بعد از ملاح جہاز ودا دھیڑے کھاسیا — وچ غم الم دے بحر دی کندھیاں نہ لا ہسیا
ڈتی جھنڑک سکینہ کو اوں بانیٔ ستم — طاقت نہیں جو کیویں کراں میں ایکوں رقم
جے کر کراں رقم تھا قلم تھیندا ہے قلم — بہتر سکوت کرنا ہے ایں جھاء تے، کر کرم
کیتا ظلم حیا نہ آیا بد شعار کوں — چا سونپ ایہو فیصلہ پروردگار کوں

سائیں سید علی شاہ کے بعد ''دبستانِ کچھی'' کے دوسرے شاعر مولوی نذر حُسین ترک متوفی ۱۹۴۴ء ہیں۔ مذکورہ کتاب میں جہاں مولوی صاحب کے مسدس میں نظم کیے گئے واقعۂ شیریں پر اُنیس بند اردو مرثیے کی روایت کے مطابق درج ہیں وہیں ولادت وشہادتِ امام حُسین پر بھی بند درج ہیں جو مسدس اور مرثیے کے حوالے سے اہم بھی ہیں اور جن میں مولوی نذر حُسین ترک دبیر سے متاثر بھی نظر آتے ہیں:

جمیاں جاں باغ ہاے رسالت دا باغبان — وچ عارضے علیل ہوئی خاتونِ دو جہان
ہا تھوڑا ایں سبب توں رضاعت والا سمان — انگشت پاک آ کے چُسیندئے نبی زمان
چالہی ڈیہاڑے تھیندی رہی خدمت شبیر دی — انگشت پاک بنڑ گئی ہے نہر کھیر دی

دبیر کے ہاں غیر معروف روایات کا نظم ہونا ایک بہت ہی اہم موضوع ہے اور دبیر کے تتبع سے ہی دیگر مرثیہ نگاروں کو مطالعے کی وسعت اور ایک ہی موضوع پر مختلف مقامات پر مختلف روایات نظم کرنے کی تحریک ملتی ہے۔

دبیر کی اسی روش کی تقلید کرتے ہوئے مولوی نذر حُسین ترک نے ایک روایت نظم کی ہے کہ جس میں جنابِ عباسؑ اپنے ایک فرزند محمد کو امام حُسینؑ پر فدا ہونے کے لیے خود تیار کر کے اور امامؑ سے بااصرار اجازت لے کر مقتل میں بھیجتے ہیں۔ جب وہ کمسن فوجِ اشقیا کے سامنے آتا ہے تو ایک شامی طنزاً لشکر والوں سے کہتا ہے کہ اس بچے کو چھاؤں میں بلا کر اس کی بات سنو۔ کہیں دھوپ میں یہ بچہ سنولا نہ جائے اس پر مولوی نذر حُسین فرزندِ عباس کا خطاب نظم فرماتے ہیں:

معصوم بہوں فصیح ہے عجائب کلام ہے — اے ساکنانِ شام ایہا غم دی شام ہے
حاکم خدا کنوں میڈا چاچا امام ہے — دھپ تے کھڑا امام ساکوں چھاں حرام ہے
احمد دے جانشین کوں دھپ تے کھڑیندے ہو — اوندے غلام زادیاں کوں ول چھاں ڈکھیندے ہو

لڑن دا گھر کنوں میں کر آیا خیال ہاں — ظاہر دے وچ جے بال تاں صاحب کمال ہاں
جیڑھا علی دا لال اوں غازی دا لال ہاں — عقلوں بزرگ عارف ہاں گو خورد سال ہاں
میں تاں کھڑا تیار ہاں ڈس کیہاں دیر ہے — آوے جو آوے حاضر اے شیراں دا شیر ہے

افسر جڈاں اے بولیا ہشیار ہوشیار معصوم کر ڈتا ہے اوں لشکر کوں بے قرار
جوہر ڈکھائے اے جہیں چھوٹی جہیں ذوالفقار خوش ہو گیا امام تے آکھا بصد قرار
دلیری اَتے مردائی دے وچ باش بھتیجا تھ می گیا ہے چاچا تینڈا پُرباش بھتیجا

جلدی ونجو عباس جو ماریا گیا معصوم ہک بال ظاہر کر ڈتے جنگاہ دا علوم
کوفے دو کوفی شام دو بھج گئے نی شامی شوم لشکر دی ابتری کنوں بس ہو گیا معلوم
کل عشق والے دفتراں کوں دھو گیا عباس بچڑے دی موت ڈیکھ کے خوش ہو گیا عباس

امام حُسین علیہ السلام کی جنگ کا حال رقم کرتے ہوئے مولوی نذر حُسین ترک فرماتے ہیں:

حیدر دے ہتھ دی تیغ صفائی کرے عجب لحظے دی کار آئی ادائی کرے عجب
شجرِ لعین دی او کٹائی کرے عجب تسے دا زور ڈیکھ خدائی کرے عجب
ہلے جو ہتھ حُسین دا چھنڑکار پے ونجے مردے ڈھن زمین تے کڑکار پے ونجے

غلام علی لنگاہ متوفی ۱۹۵۳ء کے قافلۂ حُسینی کی مدینہ سے روانگی کے منظر پر مبنی مسدس چند بند ''دبستانِ کچھی'' میں نقل کیے گئے ہیں جو انیس و دبیر کے مرثیوں کا اس موضوع پر مجموعی اثر لیے ہوئے ہیں۔

ویلا ہا فجر دا جو لگی ہوونڑ تیاری دیگر تائیں اسباب بدھے عاشقِ باری
ہیہات دا غل ہو گیا وچ شہر دے جاری ہر گھر کنوں آواز آیا گریہ و زاری
سادات دے گھر پاک دا تھیندا ہے اجاڑا گویا کہ تھیا کوچ پیمبر دا ڈیہاڑا

دیگر دا ہے ویلا تے پئی ٹُردی ہے سادات ہر در اتے دیوار توں آواز ہے ہیہات
اے کوچہ و بازار دے سب مرد تے عورات محشر کنوں بھاری ہے لاریب ایہا رات
ہے راہ پہاڑاں دا بیا جیٹھ مہینہ ٹردا پیائے شبیر تے ویران مدینہ

سب شہر دیاں ذالیں جو پٹینڈیاں ہویاں آیاں زلفاں وی پریشان تے خاکاں وی روایاں
رو رو کے پیاں آکھدیاں خاتون دی جایاں اج کوچ اساڈا ہے اللہ بیلی اے مائیاں
رخصت کرو ساکوں جو پئی تھیندی کویل اے اج ڈینھ ہے وچھوڑے دا تھیسی حشر کوں میل اے

شہزادہ خادم حُسین متوفی ۱۹۵۸ء ''دبستانِ کچھی'' کے چوتھے اور آخری شاعر ہیں۔

اسی کتاب میں اقبال کندانی لنگاہ صاحب پر اپنے مضمون ''سرائیکی مسدس کا آخری شاعر'' میں لکھتے ہیں،

''مولوی نذر حسین ترک کے بعد مسدس کو وہ شان بخشی کہ سخن داران زمانہ انگشت بدنداں نظر آئے ان کا ایک عظیم دوہڑا دیکھیے گا۔

ہمشیر ڈٹھی جاں ویر دے تن تے زخماں دی گل کاری نال پھلاں دے جھور پئی ہے شاخ امامت ساری
ویا باغ بہشت دے وچ ہن نہراں عدن دیاں جاری ڈیکھ کے حالت گلشن دی ڈٹھے بے وس ابر بہاری

شہزادہ خادم حُسین کا یہ دوہڑہ جوشانِ دبیری لیے ہوئے ہے، اس کے متعلق اقبال کندانی فرماتے ہیں؛ ''قم مقدسہ میں علمائے کرام کی ایک محفل میں میں نے متذکرہ دوہڑا پڑھا۔ سب نے یہ دوہڑا لکھ لیا اور علماء نے بہت داد دی۔ دیر تک محفل میں گریہ کی کیفیت جاری رہی اس مقدس محفل میں میں نے شہزادے کے اور بھی مسدس سنائے اس محفل کے اثرات و کیفیات آج تک محسوس کرتا ہوں۔''

رزم کے دوران امام حسین ع اپنی تلوار سے مخاطب ہوتے ہیں جسے شہزادہ خادم حُسین نظم فرماتے ہیں:

ہتھ دے وچ گردش ڈتی تلوار کوں کر ڈتا مرعوب ہر مردار کو
شاہ علم کیتا جاں جوہر دار کوں ونج ملی ہے تیغ کرّہ نار کوں
تُوں فقط اتنی مہربانی کریں میں کپاں توں آتش افشانی کریں

ایک مسدس کہ جس میں وقتِ شہادت امام حسینؑ کے پاس جبرائیل حاضر ہوکر عرض کرتے ہیں۔

یا مولا جبرائیل ہاں تیڈا غلام ہاں ہتھ بنھ ادب دے شاہا کریندا سلام ہاں
ستویں کنوں حُسین ودا بے آرام ہاں ڈیویں حکم تاں فوج کریندا تمام ہاں
ارشاد کر زیناں دا تختہ الٹ ڈیواں ایں فوج شام ساری دی اج بیخ پٹ ڈیواں

یاد ہوسنی حُسین ایں نوکر دیاں لولیاں پینگھا جھٹاونڑا اتے جنت دیاں بولیاں
ہِن یاد تیڈے ناز اتے جنت دیاں بولیاں اج توں اوہو حُسین تے پتھرا دیاں جھولیاں
جیں ویلے میں غلام تیڈے کول آواں ہا تو ہس کے ڈہدا ہانویں میں ہانہہ نال لاواں ہا

جبرائیل کے جواب میں امام حُسین فرماتے ہیں:

جیں ویلے جبرائیل میڈے یار مر گئے بچپن دے سارے دوست تے انصار مر گئے
غم ہو گیا حلال جاں غمخوار مر گئے جیڑھے آہن زمانے دے دلدار مر گئے
توڑے جوفوج ساری میڈے پاس ہووے ہا تاں لطفِ زندگی ہا جو عباس ہووے ہا

اس کے علاوہ وہ شاعر جو اپنی ذات سرائیکی کے ایک دبستان کے بانی ہیں وہ ارشاد جھنڈیر ہیں کہ جو دبیرؔ سے حد درجہ متاثر تھے اور اپنے کلام میں دبیرؔ کے افکار اور طرزِ سخن کا بااہتمام تتبع کیا کرتے تھے۔ اور ایسا اس لیے تھا کہ ارشاد جھنڈیر سرائیکی کے علاوہ عربی، فارسی پر بھی دسترس رکھتے تھے اور اردو کے نشیب و فراز سے بھی واقف تھے۔

ارشاد جھنڈیر جنھیں سرائیکی بیلٹ میں مکتبِ دبیرؔ کا مبلّغ اور سفیر بھی کہا جا سکتا ہے اپنے علمی تبحر کی وجہ سے بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ استاذی علامہ عزادار حُسین لاشاری فرماتے ہیں کہ یہی اوصاف ہیں کہ جس کی وجہ سے دبیر اور جھنڈیر میں ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ استاد

فرماتے ہیں کہ اپنی نوجوانی میں ایک مجلس میں انھوں نے ارشاد جھنڈیر کو براہِ راست سنا کہ جس میں ایک اہلسنّت مفسر کا حوالہ دے کر جھنڈیر صاحب نے فرمایا کہ سورۂ رحمٰن کی آیت ۲۰ ''بَینھما برزخٌ لا یبغیان'' میں برزخ سے مراد حضرتِ زہراؑ ہیں حالانکہ عموماً یہاں برزخ سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات کو لیا جاتا ہے۔ اس نادر تفسیری نکتے کی بنیاد پر نبوّت اور امامت اور ان کے درمیان حضرتِ زہراؑ کو برزخ مراد لے کر جھنڈیر صاحب نے ایک کمال نظم پڑھی۔ اس قسم کی نکتہ آفرینی اور علمی تبحر دبیرؔ کے ہاں بھی بکثرت ملتا ہے۔

استاد صاحب نے آخر میں فرمایا کہ جب عرصے کے بعد ذاکری کا رنگ تبدیل ہوا اور شعریت کم ہونے لگی اور خود اہل منبر کی ان خزائن اور جواہر میں دلچسپی نہ رہی تو ایک طرف وہ قطعات پر مشتمل ذاکری ختم ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ دبیرؔ کے آثار بھی سرائیکی ذاکری سے محو ہوتے گئے۔

یہ کام جامعات کا تھا کہ وہ سرائیکی مرثیہ و دوہڑہ اور اردو مرثیہ کے تقابلی جائزے پر تحقیق اور تنقید کے کاموں کا باقاعدہ آغاز کرتے۔ اس طرح سرائیکی شاعری کا یہ خزانہ اپنی پوری قدر و قیمت کے ساتھ محفوظ رہتا مگر ایسا ہوا نہیں اور اس باب میں صفدر کربلائی صاحب کی مجاہدانہ تحقیق کی داد بہرحال اہل تحقیق اور اہل نقد و بصر پر لازم ہے۔

ذاکری کے علاوہ بھی پنجاب اور دبیرؔ کا تعلق بہت ہی دلچسپ ہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی آٹھویں جماعت اور اس کے بعد میٹرک کے لیے جاری کردہ اردو گرامر اور انشاء پردازی کی کتاب میں تشبیہ کے ضمن میں میر تقی میر کا شعر

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اور استعارے کے ضمن میں دبیر کے مرثیے کے یہ مصرعے درج تھے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

حکومت کے وضع کردہ تعلیمی نصاب میں شمولیت کی بدولت یہ کتاب پنجاب بھر میں پڑھی اور پڑھائی جاتی رہی ہے اور اس طرح دبیر کا یہ مصرع زباں زدِ خلائق ہوا اور ایسا ہوا کہ یہ مصرع کھیل کے میدانوں کے کمنٹری بکس سے بھی سنایا گیا، تیئیس مارچ کو نشر ہونے والی پریڈ کے دوران بھی سنا گیا اور یہ مصرع ملک میں عام انتخابات کے دوران سیاسی جلسوں میں اور امیدواروں کے بینروں اور اشتہاروں کی بھی زینت بنتا رہتا ہے۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی پڑھے لکھے پنجابی سے معلوم کریں تو اس کو مرثیے کا اور مرزا دبیرؔ کے بارے کچھ معلوم ہو نہ ہو مگر یہ مصرع ضرور یاد ہوگا۔

اب ہم دبیرؔ اور پنجاب کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ ۲۰۰۴ء سے ۲۰۱۱ء تک دبیرؔ کا کلام ملک بھر میں اور خصوصاً پنجاب کے گلی کوچوں میں گونجتا رہا ہے تو یہ بات شاید بہت سے لوگوں کے لیے ناقابلِ یقین ہوگی مگر ایسا ہوا ہے اور ایسا ہوا ہے سفیرِ عزا سید ندیم رضا سرور کی بدولت۔

سیّد ندیم رضا سرور پنجاب میں اپنے ۱۹۹۷ء کے البم ''کربلا لے چل مجھے'' کی بدولت اتنے معروف ہوئے کہ پھر ہر سال محرّم میں بلا تفریقِ مذہب و ملّت سب سے زیادہ انہیں سنا جانے لگا اور مذکورہ البم کے ساتھ ساتھ ہر سال ان کے ریلیز ہونے والے ہر نئے البم کا انتظار

رہنے لگا اور ریلیز ہونے پر باقاعدہ سنا جانے لگا۔ سال ۲۰۰۴ء کے البم ''نبی نبی ہوگا'' میں سفیرِ عزا نے میر انیس کا نوحہ ''نیند آئے گی جب آپ کی بُو پاؤں گی بابا'' شامل کیا اور مرزا دبیر کا سلام'' جو بھی مصروفِ سلام شہدار ہتا ہے شامل کیا۔ اس کے بعد اس سلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مضافات میں بھی لوگوں کی زباں پر یہ سلام عام ہوا۔ اس سلام کو سید ندیم سرور صاحب کی ہی طرز میں مجالس میں پڑھا جانے لگا۔

اس سلام کا ایک شعر تھا

شمر کہتا تھا یہی ماں ہے علی اکبر کی جس کا اک ہاتھ کلیجے پہ دھرا رہتا ہے

اس شعر کو ذاکرین نے بھی مصائب میں شامل کیا اور ایسا بھی دیکھنے کو ملا کہ ذاکر مصائبِ جناب علی اکبرؑ کا ذکر کر کے منبر سے اترا تو نقیبِ منبر نے بعد میں پڑھنے والے ذاکر کو دعوتِ خطاب دینے سے پہلے اسی شعر کو با آوازِ بلند پڑھا اور مجمع میں پھر سے گریے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں اور نقیبِ منبر سے یہ شعر مکرر کرنے کو کہا گیا اور جب شعر پھر پڑھا گیا تو مزید گریہ شدّت اختیار کر گیا۔

۲۰۰۵ء کے البم ''گونج رہا ہے یا حُسینؑ'' میں دبیرؔ کا کلام ''مسافرانِ مصیبت وطن میں آتے ہیں'' پنجاب میں عمومی طور پر سنا گیا۔

سفیرِ عزا کے ۲۰۰۷ء کے البم ''سلام یا حُسینؑ'' کو جو پذیرائی پنجاب کے ہر طبقے میں ملی وہ بھی ایک قابلِ ذکر واقعہ ہے۔ اس البم میں دبیر کا معروف کلام ''قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے'' شامل تھا اور اگلے برس ۲۰۰۸ء کے البم ''بس یا حُسینؑ'' میں ''زینب سفر میں ساتھ ترے ماں کہا نہ تھی'' شامل ہوا۔ دبیرؔ کے یہ دو کلام آج بھی عشرۂ محرم کے دوران شیعہ اور غیر شیعہ گھروں میں سنے جاتے ہیں، کیبل آپریٹرز کی جانب سے نشر ہوتے ہیں، مجلس گاہ میں اور جلوسِ عزا کے رستے میں آنے والے چوکوں میں ساؤنڈ کے ذریعے، بسوں میں، اور رکشوں میں سنائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۰۱۱ء کے البم کے بھی ٹائٹل کلام میں دبیرؔ کے مرثیے سے استفادہ کیا گیا اور اس طرح وہ کلام گھر گھر پہنچا۔

سو پنجاب کی نسلِ نو سیّد ندیم سرور کو سنتے ہوئے کلامِ دبیرؔ سے جس حد تک آشنا بھی ہوئی ہے اور متاثر بھی، اس کے لیے سید ندیم سرور ہماری داد، دعا اور عقیدت کے پہلے سے کہیں زیادہ مستحق نظر آتے ہیں۔ جدید پیرائے میں انیسؔ اور خاص طور پر دبیرؔ کو جس طرح نئی نسل سے ندیم سرور صاحب نے متعارف کروایا ہے، سفیرِ عزا کا یہ احسان پنجاب کے نئے ذہنوں پر ہمیشہ رہے گا۔

پنجاب میں اس وقت دبیر پرستی، دبیرؔ فہمی اور دبیر کی ترویج کی ایک نئی لہر ہے جو عرصے سے نئی بنیادوں پر اٹھی ہے۔ نوجوان مرثیہ گو شاعر جناب محمد علی ظاہر صاحب اپنے باطن میں اپنے آبائی شہر جھنگ سے دبیرؔ سے عقیدت لے کر لاہور کے عزائی اور ادبی منظر پر ظاہر ہوئے ہیں اور انھوں نے محافل و مجالس حتیٰ کہ نجی محفلوں میں بھی دبیرؔ کی تفہیم کے باب وا کیے ہیں۔ موصوف صحیح معنوں میں عاشقِ دبیرؔ واقع ہوئے ہیں اور اس کا ثبوت ان کی کلامِ دبیرؔ کے دقت کے ساتھ مطالعے اور اس کے حوالے سے نکتہ آفرینی کی صورت میں ملتا ہے۔ بزمِ راحتِ سخن کے بینر تلے کئی مجالس و محافل کے بعد انیسؔ کے ساتھ ساتھ دبیرؔ کے فن پر بات ہوئی اور ہمارے قابل ترین سخن فہم اور شاعر دوستوں نے محمد علی ظاہر صاحب کی معیت میں دبیرؔ اعلی اللہ مقامہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور یہ سلسلہ تادیر جاری رہنے کا قوی امکان ہے۔

اس کے علاوہ ایک عرصے سے کراچی سے تعلق رکھنے والے دبیرؔ شناس شعرا جناب جوہر عباس صاحب اور عدنان رضا صاحب سے

پنجاب کے نوجوان شعرا سوشل میڈیا کے ذریعے مسلسل رابطے میں ہیں اور ان حضرات سے دبیرفہمی کے خرمن سے خوشہ چینی میں مصروف ہیں۔صورتِ واقعہ یہ ہے کہ سال بھر دبیرؔ کا انتخاب فیس بک پر پوسٹ بھی ہوتا رہتا ہے اور اس پر تبصروں کا سلسلہ بھی قائم رہتا ہے۔

ایک نہایت اہم پیش رفت گزشتہ چند برسوں سے دکھائی دے رہی ہے اور وہ یہ کہ فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل کے ذریعے دبیرؔ کے مرثیوں کی اشاعت اس وقت پانچ جلدوں تک پہنچ چکی ہے اور آئندہ آنے والی مزید پانچ جلدوں پر کام جناب اصغر مہدی اشعر کی سربراہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، ان شاء اللہ۔ اس دورِ ابلاغ میں پنجاب کا ہر سنجیدہ اور مرثیے سے محبت رکھنے والا قاری اور شاعر اس پلیٹ فارم سے جڑا ہوا ہے۔لہٰذا دبیرؔ کے مرثیوں کی دس جلدوں کی اشاعت ایک ایسا کام ہوگا جو اگلے سو برس تک دبیرؔ کے مرثیوں کے حوالے سے کفایت کرتا رہے گا۔اس سے دبیرؔ کے کلام کی عدم دستیابی یا قلت کا عذر ختم ہو چکا ہے لہٰذا دبیرؔ سے عقیدت کے بعد اب باقاعدہ مطالعۂ دبیرؔ کا مرحلہ آ پہنچا ہے اور اس کے بعد یقیناً تفہیم اور دبیرؔ پر نقد و بصر کا سلسلہ قائم ہوگا۔

یہ بات یقینی ہے کہ جب دبیرؔ کے حوالے سے بے سروسامانی کے عالم میں بھی پنجاب میں ان کا ذکر دوسو برس کا عرصہ کامیابی سے پورا کرنے والا ہے تو آج جبکہ ادارہ فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل ان کے مرثیوں کی بڑے پیمانے پر ترتیب، تہذیب اور اشاعت کر چکا ہے تو مستقبل میں بھی دبیرؔ سے عقیدت، ذکرِ دبیرؔ اور کلامِ دبیرؔ مع نقد و بصر پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو کر فروغ پائیں گے۔

❁❁❁❁

دبیرؔ کے مرثیے

(جلد ششم)

زیرِ طبع

اصغر مہدی اشعر

دبیرؔ کے مرثیے

(جلد پنجم)

شائع ہوگئی ہے

اصغر مہدی اشعر

مونسؔ کے مرثیے

(جلد اوّل تا سوم)

زیرِ طبع

ترتیب و تدوین

اصغر مہدی اشعر

مراثی دبیرؔ میں ارسطوی عناصر

فرحت نادر رضوی

ادب وشاعری میں ماورائی فضا کا طلسم شاید اسی وقت سے چھایا رہا جب سے انسانی ذہن نے کہانی گڑھنی سیکھی، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر اگر یوں کہا جائے کہ ہر وہ گفتگو جسے پہلے پہل انسان نے دلچسپی سے سنا وہ دراصل ایک کہانی ہی تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا، چنانچہ انتہائی ابتدائی دور میں وجود پزیر ہونے والے وہ الوہی نغمات جنہیں دوران عبادت پڑھا جاتا رہا، وہ بھی کہانیاں ہی تھیں، منظوم کہانیاں، اس طرح بہ تدریج ذہن انسانی میں ابھرنے والے خوف واندیشے مذہبی کہانیوں میں صورت پزیر ہوکر عقیدے کی بالیدگی کا سبب بنے جبکہ سبب واسباب کی علت وتوجیہ پر مبنی کہانیاں فلسفہ اور سائنس کی بنیاد فراہم کرنے کا سبب بنیں اور انسانی ذہن کی تخیل طرازی اور فنتاسی سے عبارت کہانیوں نے اسے ایجادات اور تکنیکی ارتقاء کا راستہ دکھا کر نایاب کو پایاب کر لینے کی بے پناہ صلاحیت بخشی اس قدر گہرا اور قدیم رشتہ رہا انسان کا قصے، کہانیوں کے ساتھ۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ ایک قصے کو قصہ بنانے والی بنیادی شئے تحیر کی وہ کیفیت ہے جو ہر بار اس قصے کو سننے کے لئے آمادگی پیدا کرنے کا سبب بنی اور چشم بصیرت ہر بار اسی ایک منظر کو ایک نئے پس منظر میں درک کر کے ایک نیا مفہوم اخذ کرتی رہی اور مسرور ہوتی رہی۔ یہی فطرت آدم ہے، چنانچہ وہ قصہ کے اس طلسم سے کسی صورت باہر نکل ہی نہیں سکتا، یہ اور بات ہے کہ ارتقائے انسانی کے ساتھ ساتھ اب ان قصوں کو مختلف علوم وفنون سے وابستہ مختلف شقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک خالص ادب وشاعری کا تعلق ہے، اس کا تو براہ راست رشتہ ہے وجدان اور تخیل کے ساتھ، ورائے تجربہ بھی بہت کچھ ہے جو ناگہانی طور پر اکثر حد ادراک میں در آتا ہے اور تب کوئی تخلیقی کارنامہ صورت پزیر ہوتا ہے جو کسی آئس برگ کی طرح بہت تھوڑا ہی دکھائی دیتا ہے جسے اہل ذوق حد فہم وادراک میں سمیٹ لینے کی کاوش کرتے ہیں، مگر ایک تخلیقی فن پارے کا بہت سا حصہ عام سطح فہم وادراک سے ماورا ہوتا ہے، جسے خاص خاص حالتوں میں حسب توفیق وصلاحیت مختلف حسی جذبی سطحوں سے اکثر درک بھی کر لیا جاتا ہے، مگر اس طرح کے تجربات کا چونکہ کوئی واضح تعارف یا توضیح نہیں پیش کی جاسکتی لہٰذا ہم اسے ماورائیت سے موسوم کر لیتے ہیں۔

یہ ماورایت ہی شاعری کی جان ہے، بیانیہ میں اسی ماورایت کو سمونے کی غرض سے اکثر ایسے فوق تجربہ خیالات وواقعات پیش کیے جاتے رہے ہیں جنہیں آج ہم اور آپ طلسم وسحر اور جادوگری کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ ذہن انسانی کی اسی ماورائیت پرستی نے داستانوں کے دفتر کے دفتر گڑھ ڈالے۔ بعد کے ادوار میں جب مغربی ادبی اثرات کے تحت ڈرامہ ناول اور افسانہ جیسی مختلف اصناف عالم وجود میں آئیں تو اسی ماورائیت نے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں یہاں شعور کی رو جیسی اصطلاحات میں ڈھل کر اپنی آفاقیت کا سکہ بٹھایا اور شاعری میں تلمیح، استعارہ، کنایا اور تشبیہات کی صورت جلوہ افروز ہوکر ہمیں یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا کہ ماورائیت کی گرفت اور غیر محسوس کو محسوس اور ناقابل تسخیر کو تسخیر کر لینے کی کاوش اور تجربہ ہی اصل لطف وانبساط کا سبب ہے چنانچہ حسب توفیق واستطاعت ہر تخلیق کار نے کمند فکر میں اس پیکر عنقا کو اسیر کرنے کی کوشش کی۔

یہ تو ہوئی عمومی گفتگو، لیکن وہ خصوصی گفتگو بھی ضروری ہے جسکا تعلق براہ راست دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کے اسطوری عناصر سے ہے۔اب جہاں کہیں لکھنؤ کا ذکر ہوتا ہے وہ دلچسپ مرقع کشی یاد آجاتی ہے، جہاں شام ڈھلے پیالیوں میں افیون گھلتی ہے، گنے کی گنڈیریاں چھلتی ہیں، منچلوں کا جمگھٹ ہوتا ہے اور داستان سرائی کے دور چلتے ہیں، جہاں بزم سے لیکر رزم تک کے ولولہ انگیز مناظر پیش کر دیئے جاتے ہیں اور ایک اکیلا قصہ گو مکمل اسٹیج کی ترتیب صرف اور صرف اپنی گفتگو کے دم خم پر کر گزرتا ہے، گویا قصہ گو لفظوں کے نگارخانے ترتیب دیتا ہوا، تخیل کی ایک سے ایک حیران کن دنیا آباد کرتا چلا جاتا ہے، اور سامع مبہوت و بے خود عالم حیرانی میں اپنے بے لگام تخیل کی مہار سنبھالنے کی تگ و دو میں قصہ گو کی دکھائی ہوئی اجنبی راہوں پر بلا ارادہ بڑھتے چلے جانے پر مجبور و بے بس نظر آتا ہے، یہی وہ عام لکھنوی فضا تھی جس میں لکھنؤ کا شاعر اور سامع دونوں ہی سانس لے رہے تھے۔

ظاہر ہے، بیانیہ شاعری کی خواہ کوئی بھی قسم ہو اس طرز ادا سے اثر پزیری فطری تھی جسے ہم داستانوی طرز ادا سے موسوم کرتے ہیں، اسکی بظاہر ایک وجہ تو لکھنوی تہذیب و مزاج تھا، مگر اس سامنے کی بات کے علاوہ دوسری اہم وجہ وہی تھی جسے سب سے پہلے بیان کیا گیا، یعنی بیان واقعہ میں اسطوری عناصر کی آمیزش بیان واقعہ کو وہ ڈرامائیت بخشنے کے لئے ضروری محسوس کی گئی کہ اسے دل چسپی سے سنا جائے، ورنہ ایک سیدھے سپاٹ اور بے لطف بیان کے لئے سامعین کی توجہ کا حصول ممکن نہ تھا۔

اودھ میں مجالس عزا امراء و رؤسا اور نوابین کی سرپرستی میں منعقد ہو رہی تھی، یہی وہ دور تھا جب مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ اور شعرا نے دقت فکر و نظر کے ساتھ اس فن کی تکمیل میں سرگرمی دکھائی۔ اس سلسلے میں ضمیر کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے ہی شاگرد رشید مرزا دبیر تھے۔ دبیر کا مشاہدہ بہت گہرا تھا، وہ اپنی غیر معمولی قوت مشاہدہ سے کام لیکر معمولی مناظر میں غیر معمولی کیفیات پیدا کر دینے کی قدرت رکھتے تھے، اسی صفت نے انکے مراثی کو غیر معمولی اسطوری کیفیات عطا کر دیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنی بے پناہ قدرت بیان کے استعمال سے یکے بعد دیگر منظر پر منظر ترتیب دیتے چلے جاتے تھے، اگرچہ یہ مناظر واقعات اصلی سے ہی ترتیب پاتے، مگر ان واقعاتی صورتوں میں ایک ماورائی کیف و کم وہ اس طرح پیدا کرتے کے تخیل کے ہزار ہا ہزار نگار خانے سجتے چلے جاتے، اور ایک سحر انگیز فضا قائم کر دیتے جہاں سامع کا تخیل ایسے مناظر سے متحیر رہ جاتا جو اسکی اصلی زندگی سے اگرچہ ملتے جلتے ہوتے مگر ان میں ایک ایسی تازگی محسوس ہوتی جو اصل سے کہیں زیادہ کیف انگیز ہوتی۔

دبیرؔ کے مرثیوں میں ماورائی اسطوری فضا بندی جن وسائل کی مرہون منت ہے ان میں پرسونیفکیشن اور امیجری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ان وسائل سے وہ غیر معمولی حسی منظر نامے تشکیل دیتے ہیں، اور سامعین کے لیے ادراک کے نئے دریچے وا کرتے ہوئے اسے تخیلی سفر کی وہ وسعت بیکراں عطا کرتے ہیں، جہاں ہر ہر قدم پر ایک اچھوتے تحیر انگیز تجربے سے کسب انبساط کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔

مثلاً زخموں کی دریدگی کو شدتِ احساس عطا کرنے کے لیے دیکھیے کس زاویے سے بیان کرتے ہیں:

منھ زخموں نے پھیلا دیے لینے کو جماہی

شدتِ تحیر کو اپنی انتہا تک پہنچا ہوا پیش کرنا چاہتے ہیں، دیکھیے کیا تصویر کھینچتے ہیں:

انگڑائی کا لینا بھی کماں بھول گئی تھی

زخموں کے چاک کو شاید ہی کبھی کسی نے اس انداز میں دیکھا اور پیش کیا ہو، ایک کیفیت کی تجسیم کا کیسا انوکھا انداز ہے دوسری مثال میں

کمان کی کشیدگی کو انگڑائی سے تعبیر کرتے ہوئے ایک بیجان شئے یعنی کمان کا پرسونیفیکشن کیا گیا اور پھر انگڑائی لیتے لیتے عالم تحیر میں اسی ایک کیفیت میں ٹھہر جانا یعنی انگڑائی مکمل کرنا بھول جانے کا ذکر کر کے شاعر نے کمان کے وجود میں تحیر کی انتہائی کیفیت کو مجسم کر دیا ہے:

ایک شعر اور دیکھئے:

بپھرا ہوا ہے شیر پھریرے کا بے جدال شیرِ فلک کو دیکھ کے ہوتا ہے لال لال

یہاں دو بے جان اور بہ ظاہر غیر متعلق چیزیں یکجا کی گئی ہیں ایک علم کا ہوا سے اڑتا ہوا پھریرا جسے 'بپھرا ہوا شیر' کہہ کر شاعر نے صاحبِ علم کے غیض وغضب کی کیفیات کو ہوا سے اڑتے ہوئے پھریرے میں بپھرے ہوئے شیر کی کیفیات کے ساتھ مجسم کر دیا ہے، اس تجسیم کے بعد پھریرے کے شیر کے بپھرنے کی وجہ اس کے حریف یعنی 'شیرِ فلک' کی موجودگی کو قرار دیا گیا ہے، اور اس طرح فلک اور پھریرے کے درمیان جو رشتہ مخالف قائم ہوا اسکی توجیہ یہ فراہم کی گئی ہے کہ چشم فلک آج مظلوموں کا قتال دیکھنے پر آمادہ ہے جبکہ علمِ عباسؑ ناموسِ رسولؐ کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ لہٰذا علمِ عباسؑ اور فلکِ پیر کو دو باہم مخالف ومتصادم قوتوں کی صورت پیش کیا گیا ہے، اور انکی تجسیم حیوانی صورتوں میں کر کے انہیں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے کو آمادہ دکھایا گیا ہے۔ اس طرح یہ مکمل تاثر کسی لفظی توضیح کے بجائے دو شیروں کی کیفی تجسیم میں اس طرح سمیٹ لیا گیا ہے کہ چشم تخیل ہوا میں اڑتے ہوئے پھریرے میں ایک بپھرے ہوئے شیر کو صاف طور پر دیکھ لیتی ہے جو اپنے حریف کی موجودگی سے ناخوش ہو کر غصے کے عالم میں غراتا ہوا نظر آ رہا ہے، جبکہ آسمان پر بنتے بگڑتے مناظر میں چشم تخیل خود اپنے ہی تصور کو پڑھتی ہے، لہٰذا دوسرے شیر کا وہاں نظر آ جانا عین ممکن ہے۔

جناب عابد حسین حیدری نے دبیر کے مرثیوں کی ماورائی فضا پر گفتگو کرتے ہوئے بہت عمدہ بات کہی ہے:

'شاعری میں ماورائے عقل کائنات کی تشکیل خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ تشکیل دو سطحوں پر ہوتی ہے۔ کبھی براہ راست بیانیے کی بنیاد پر اور کبھی بالواسطہ انداز میں، جو اپنے اندرونی معنی بھی رکھتا ہے۔ مثنوی سحر البیان اور گلزارِ نسیم پہلے قبیل کی مثالیں ہیں تو مصور سبزواری کے یہ اشعار دوسرے قبیل کی ترجمانی کرتے ہیں:

نہ کھینچی تھی تمہیں سطح آب کی چادر کبھی کا گھات میں بیٹھا بھنور نکل آیا

جو چیخ ماری ہواؤں نے پار اترتے ہوئے وہی کٹا ہوا دریا سے سر نکل آیا

یہاں جہان معنی کی تشکیل کے لیے جتنا کام شاعر کرتا ہے اتنا ہی قاری یا سامع کا ذہن بھی۔ بقول ایزر:

'معنی نہ تو کاغذ پر چھپے ہوئے لفظ میں ہیں نہ متن سے باہر، معنی قاری کے سمجھنے کے عمل میں ہیں۔ یوں معنی کوئی شئے نہیں جسکی کوئی تعریف قائم ہو سکے، معنی اثر ہے جسکا فقط تجربہ ہی کیا جا سکتا ہے' (بحوالہ ساختیات پس ساختیات، پروفیسر گوپی چند نارنگ)

(ماخوذ از: انیسؔ اور دبیرؔ، دوسو سالہ سمینار۔ گوپی چند نارنگ، صفحہ ۲۰۳)

مندرجہ بالا حوالے کے بعد ایک بار پھر ان مصرعوں کو دیکھیے اور اپنے تخیل کو ذرا آزاد چھوڑیے، یہ نہ سوچئے کہ ابھی آپ رثائی تصویر کدوں سے گزر رہے ہیں، بعید نہیں کہ دبیرؔ کی یہ تخیل انگیز مصوری آپ کو اساطیری دنیا کی کچھ جانی پہچانی سی گلیوں تک پہنچا دے۔

عام مناظر سے خاص کیفیات منعکس کر دینے کی یہ خداداد صلاحیت دبیرؔ کے مرثیوں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے، ظاہر ہے دبیرؔ کا بسیط مطالعہ،

زبان پر تصرف اوران کا گہرا مشاہدہ یہاں اہم رول ادا کرتے ہیں مگر بیان کی اس سحر طرازی کا اصل سہرا انکی بے پناہ تخیلی صلاحیتوں کے سر جاتا ہے۔ وہ گفتگو میں مبالغہ آرائی پسند کرتے ہیں، لیکن مبالغہ آمیز تصور پیش کرتے ہوئے ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے فطری موجودات کا سہارا لیکر بیان کو غیر اصلی اور بے لطف ہونے سے نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھتے ہیں بلکہ اپنے سامعین وقارئین کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ایک بیکراں تخیلی وسعت فراہم کردیتے ہیں جہاں حیرتناک مناظر اور ناقابل فراموش تجربات آغوش انبساط وا کیے منتظر ہوتے ہیں۔

کہا نہیں جاسکتا کہ دبیرؔ کے مرثیوں میں یہ کیفیت کسی حتمی کوشش کا نتیجہ ہے، یا یہ اس مخصوص ذہن کا فطری میلان، جس نے داستانوں کی سحر آگیں فضا میں تربیت پائی تھی اور جو فطرتاً اسی محیط بیکراں کا سفری تھا جس میں داستانیں پلتی بڑھتی رہیں، لیکن ان کے مرثیوں کے حوالے سے یہ اعتراف بہرحال ناگزیر ہے کہ یہاں جب بھی گفتگو شروع ہوتی ہے تو فکر اسی عرصۂ بیکراں میں رواں دواں نظر آتی ہے اور انہیں عناصر سے کیفیات ماخوذ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو خالصتاً داستانوی ہیں ۔

دبیرؔ نے بڑی کثرت کے ساتھ ہفت افلاک سے زیر زمیں تک کے بے شمار متنوع مناظر مرثیوں کے محدود دامن میں بے حد نفاست، چابکدستی اور سلیقے کے ساتھ اس طرح یکجا کردیے ہیں کہ کہیں بھی یہ ذکر بے سبب نہیں محسوس ہوتا۔ انہیں اجرام فلکی سیاروں اور ستاروں کے استعارے خصوصیت کے ساتھ پسند تھے، اسکی وجہ بھی غالباً انکی ماورایت پسندی ہی ہے، دوسرے نامعلوم کا سحر اور اجنبی سرزمین کی اسطوری کشش بھی اس سلسلے کا ایک اہم محرک ہوسکتی ہے۔

یہاں دبیرؔ کے مرثیوں سے کچھ مثالیں پیش ہیں جہاں انہوں نے موجودات فلکی کو مرکز میں رکھ کر مکمل گفتگو پیش کی ہے، مرثیہ ہے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

دبیرؔ نے اپنے اس مرثیے میں کئی کردار پیش کئے ہیں جو اگرچہ اجرامِ فلکی کے ہم نام ہیں اور انکی عملی سرگرمی کا مرکز ایک ماورائی مقام یعنی فلک ہے، مگر ان میں کل صفات انسانی ہیں۔ کچھ کردار مرکزی ہیں جبکہ کچھ ضمناً پیش کیئے گئے ہیں ضمنی کردار اپنی کوئی خاص انفرادیت نہیں رکھتے، سوا اس ایک صفت کے، جسکے لیئے دبیرؔ نے اپنے منظرنامے میں انہیں داخل کیا ہے۔ جلادِ فلک، جوزا، عطارد اور خورشید وغیرہ ایسے ہی کردار ہیں جبکہ پیرِ فلک پشتِ دوتا، اپنے نام کے حوالے سے ہی خاصا واضح کردار ہے، یہ موجودات سماوی کے درمیان اپنی قدامت وعیاری کے سبب نمایاں حیثیت سے سامنے آیا ہے، اسکے مکروفریب اور مظالم کا، ایک زمانہ شکار رہا ہے مگر فلک کی سازشوں کے آگے کبھی کسی کی ایک نہیں چلتی، سب اسکے آگے مجبور و بے بس نظر آتے ہیں۔

تمام گفتگو کا مرکز میدان کارزار میں ایک کردار کی آمد ہے، اعلان آمد سوالیہ ہے، کیونکہ آنے والے کی آمد کے رعب سے رن کانپ رہا ہے بعد ازآں شیر کی آمد کے نتیجے میں رونما ہونے والے ایک واقعاتی سلسلے کا بیان شروع ہوجاتا ہے اور اس حوالے سے شاعر سامع کی نظروں کے سامنے سے تیز رفتاری سے یکے بعد دیگر مختلف مناظر گزارتا چلا جاتا ہے، پہلا منظر زیرِ زمیں سے پیش کیا گیا ہے:

رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے

دوسرے منظر میں نظر ایکبار پھر روئے ارض پر کانپتے ہوئے قصر سلاطینِ زمن کا منظر دیکھتی ہے:

سب قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے

تیسرے مصرعے میں نظر سطحِ ارض سے جانب چرخ کہن پرواز کرتی ہے۔۔۔ وہاں بھی سراسیمگی کی کیفیت ہے:

سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

ایک مکمل پس منظر کی تکمیل کے بعد شاعر ایکبار پھر بنیادی منظر کی جانب لوٹ کر آتا ہے اور اس بار منظر نامے میں اس 'شیر' کی تصویر کو مکمل طور پر واضح کر دیا جاتا ہے جسکی آمد کے سبب آسمان سے زیر زمین تک سب لرزہ براندام ہیں:

شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو

۔۔۔پیش منظر کا یہ بیان اگر چہ ابھی ادھورا ہے لیکن یہیں تھم کر اس حرّ کی منظر کو ایکبار پھر سے دیکھیے۔۔۔کیا دیکھا آپ کی چشم تخیل نے ۔۔۔ایک ہاتھ میں شمشیر علم کیئے دوسرے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام سنبھالے ایک تیز رفتار سوار نہایت سرعت کے ساتھ اسٹیج کے کسی گمنام گوشے سے نمودار ہو کر عین مرکز کی جانب بڑھتا چلا آرہا ہے۔۔۔ یہاں آپکے تخیل کو بصارت کے ساتھ ساتھ سماعت نے بھی کچھ مانوس آوازوں کی یاد دلا کر تقویت بہم پہنچائی ہے، اور اب اگلا منظر دیکھیئے جو پیش منظر بھی ہے اور پس منظر کا نقطۂ تکمیل بھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک مکمل کیفیت کا نقطۂ عروج بھی۔

تھراتے ہیں جبریلؑ سمیٹے ہوئے پر کو

اب پیش منظر میں دوسرا کردار بھی اچانک نظر آنے لگا ہے مگر یہ پہلے کردار کے شانہ بہ شانہ نہیں نظر آتا، بلکہ نظر کو سطح ارض سے ذرا بلند ہونا پڑتا ہے، یہ ایک ماورائی کردار ہے، یعنی 'جبریلؑ' جو خوف سے اپنے پروں کو سمیٹے ہوئے تھرا رہا ہے، غور کیا آپ نے جبریلؑ کی آمد پسرِ حیدرؑ کی آمد سے کس قدر مختلف ہے، گویا ماورائیت کی ایک دھند ہے جو ابتک غیر محسوس تھی مگر اب محسوس ہونے لگی ہے، اور اسی دھند میں چشم تخیل جبریل کو مجسم دیکھ لیتی ہے۔ یہاں ایک تلمیح کی مدد سے شاعر نے حیدرؑ کے پسر کی نسبی شجاعت کی یاد تازہ کر دی ہے، اور اسطرح زمین و آسمان کے ہیبت زدہ ہو کر کانپنے کی علّت بھی بیان کر دی گئی ہے اس طرح یہ ایک منظر نامہ مکمل کر کے اب شاعر نئے سرے سے دوسرے منظر نامے کی ترتیب کی جانب متوجہ ہوتا ہے، اس بار پہلے منظر کے آخری سین سے منظر نامے میں 'محسوس' ماورائی دھند کو کچھ اور قریب سے دیکھے جانے کی کوشش کی جاتی ہے اور مزید کچھ تخیلاتی مناظر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔۔۔ یہ نو قلعہ افلاک ہیں جنکے آہنی دروازے مقفل ہیں، مکمل ماحول مہیب خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے:

ہیبت سے ہیں نہ قلعۂ افلاک کے در بند

اب نظر اس قلعے کے اندر کے مناظر دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے، سب سے پہلے اسے جلّادِ فلک نظر آتا ہے جسے اس قلعے میں نظر بند کر دیا گیا ہے:

جلّادِ فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند

دربارِ شاہی کا یہ عالم ہے کہ تمام سیارے اپنی اپنی جگہ حاضر ہیں مگر ساکت و سامت کھڑے ہیں کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے، کمرِ چرخ سے جوزا کا کمر بند عالم پریشانی میں کھل گیا ہے مگر اسے خبر تک نہیں:

وا ہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند سیارے ہیں غلطاں صفت طائر پر بند

عطارد جو منشی ہے قائدے کے مطابق درباری کارروائی شروع کرنا چاہتا ہے، مگر جیسے ہی قلم اٹھاتا ہے خوف کے سبب اسکے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر پڑتا ہے، اور منشی ہی پر کچھ موقوف نہیں، خود سپہ سالار چرخ کی سراسیمگی کی یہ کیفیت ہے کہ جیسے ہی علم بلند کرنا چاہتا ہے ہیبت کے

سب پنجوں سے چھوٹ کر علم گر پڑتا ہے:

انگشتِ عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے   خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

یہ ماورائیت کی دھند تخیل کو وہ تصوراتی وسعت عطا کرتی ہے جہاں ہر قسم کے امکانات موجود ہیں اگر دیکھنا چاہتے ہیں تو تمام مناظر زندہ ہیں ورنہ سب موہوم و معدوم۔ اور آسمان کی صفت اصلی بھی یہی ہے، جو ان تمام ماورائی مناظر کے بیان کا جواز بھی فراہم کر دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے داستانوں میں ایک قصہ گو کی چشم تخیل ہمیں دھویں کے مرغولوں میں عجیب و غریب مناظر دکھا سکتی ہے:

'بیچ دریا پر پل بنا ہے لیکن وہ دھویں کا ہے۔ تین درجے پل کے ہیں، اوپر کے درجے میں ہزار ہا برج بنے ہیں اور دیو بوقیں اور شہنا منہ سے لگائے کھڑے ہیں۔ اگر ایک بوق بجے طلسم کے ساکن بیہوش ہو جائیں۔ پر یزادیں برج کے اندر موتی جھولیوں میں بھرے اچھالتی ہیں۔ ایک درجے میں زنگی لڑ رہے ہیں۔ سر کٹ کر گر رہے ہیں۔ خون زخموں کا ان کے بہہ کر دریا میں جاتا ہے۔ بجائے پانی کے خون بہتا ہے۔ (ہوشربا اول ص ۱۰۱، ماخوذ از اردو کی نثری داستانیں از گیان چند جین صفحہ ۷۶۹ اشاعت ۱۹۸۷)

آئندہ چار بندوں میں تواتر کے ساتھ کئی ماورائی کردار تمثیل کی صورت میں پیش کر دیے گئے ہیں لیکن اس منزل سے شاعر کافی روا روی میں گزرتا ہے چنانچہ اپنے نام کی مناسبت کی حد تک ہی کرداروں کا تعارف حاصل ہو پاتا ہے۔ اس سے زیادہ کی تفصیل سامنے نہیں آتی البتہ دربار فلکی پر روزمرہ کی کاروائی کے اہتمام کا نقشہ ضرور کھنچ جاتا ہے۔ لیکن ایک زندہ منظر ضرور اس گفتگو میں موجود ہے۔ فلکِ پیر، جسکی عیاریوں اور مظالم کا شکار اہل جہاں ہمیشہ سے رہے ہیں، جسکی قدامت و مکر کے آگے تمام ساکنان فلک ہیچ ثابت ہوئے ہیں، جسکی موجودگی عدل و مساوات کے قیام میں رخنہ اندازی کا سبب رہی ہے آج اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے، آج فضائے عرش بالکل بدلی ہوئی ہے، اور یہ سب کچھ آمدِ عباسؑ کا فیض ہے، یعنی منتظمانِ فلک (مہ و خور) کے اندر آج وہ جرات پیدا ہوئی کہ انہوں نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے 'پیرِ فلک پشتِ دوتا' کو پیچھے سرکنے پر مجبور کر دیا جس کے نتیجہ میں عدل کو آگے بڑھ کر ایک مدت سے درہم برہم نظامِ ہستی کی درستی کا موقع حاصل ہوا:

چمکا کے مہ و خور زر و نقرہ کی عصا کو   سرکاتے ہیں پیرِ فلک پشتِ دوتا کو
عدل آگے بڑھا، حکم یہ دیتا ہے قضا کو   ہاں باندھ لے ظلم و ستم و جور و جفا کو
گھر لوٹ لے بغض و حسد و کذب و ریا کا   سر کاٹ لے حرص و طمع و مکر و دغا کا

پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ دبیرؔ کے کلام کا ایک وصف خاص مبالغہ ہے، جسے اکثر و بیشتر انکی شاعرانہ نمود علم و کمال تصور کیا گیا ہے، مگر در حقیقت بات کچھ اور ہے۔ شاعر جب کسی تصور کو پیش کرتا ہے تو اس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک وہ اظہار کو منتہا تک نہ پہنچا لے، اس سلسلے میں وہ مختلف کاوشیں کرتا ہے، جس میں ایک خاص عمل بیان میں لامتناہیت پیدا کر کے تخیل کے طرفوں کو کھول دینا ہے، جب وہ گفتگو کرتا ہے تو تخیل کے سروں کو سما تا سمک کھینچ کر سامع کے حیطہ امکان میں موجود تمام تر تجربات و مشاہدات کا انسلاک بیانیہ کے بنیادی واقعے کے ساتھ کر تا چلا جاتا ہے، اس طرح جن جزئیات و تفصیلات کو گفتگو میں نہیں سمیٹا جا سکا ہے، شاعر مخصوص حوالوں کی مدد سے انکی جانب بھی اشارے کر جاتا ہے اور اپنے سامع کو درک تجربہ کی بنیاد پر تخیل طرازی کے غیر معمولی مواقع فراہم کرتا ہے، اس طرح اسکا قاری و سامع تخیلی سطح پر کسب تجربہ کی لذت بے پناہ سے آشنا ہوتا ہے، اور بیانیہ کے بنیادی تصور کو خود اپنی تخیلی کاوش سے اس نقطۂ عروج تک پہنچ کر پا لیتا ہے، اور اس ماورائیت کا ادراک کر لیتا ہے جس تک رسائی بیان کی سرحدوں کو توڑ کر نکلنے کے بعد ہی ممکن ہے۔

راحت کے محلّوں کو بلا پوچھ رہی ہے ہستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہو
تقدیر سے عمر اپنی قضا پوچھ رہی ہے دوزخ کا پتہ فوجِ جفا پوچھ رہی ہے
غفلت کا تو دل چونک پڑا خوف سے ہل کر فتنے نے کیا خواب گلے کفر سے مل کر

'راحت کے محلے' ایک ماورائی مقام، یا شاید داستانوں کی دنیا سے لی گئی کوئی سرسبز وشاداب بستی ہے جہاں کسی وجود کو زوال نہیں، جہاں ہر رنگ اصل سے زیادہ بارونق اور پائیدار ہے، اور پھر اسی کیفیت کی متضاد کیفیت یعنی 'بلا' کا ذکر ہے جو راحت کے محلوں کی تلاش میں ہے، ابھی فکر راحت کے محلوں کی لطافت کسب کر ہی رہی ہے کہ 'بلا' کی مہیب ترین کیفیات گفتگو میں در آتی ہیں، اور اس طرح تخالف حسی کی کیفیات سے شاعر ادراک کے طرفوں کو کھولنے کا عمل انجام دیتا ہے ۔

ہستی کے بالمقابل فنا، یعنی وجود اور عدم کو گفتگو کا حصہ بنا کر شاعر نے بیانیہ کو اس کائناتی وقوعے کے دو انتہائی سروں تک کھینچ کر لامتناہیت کی کیفیت پیدا کر دی ہے، گویا جو کچھ اس حوالے سے سامع کے دائرہ ادراک میں ہے وہ سب کی سب کیفیات، وہ تمام تر حسی ارتعاشات اب اس گفتگو میں در آئے ہیں۔

'تقدیر' 'عمر' اور 'قضا' تینوں ہی نامعلوم ہیں، جن کی دریافت نے بیان میں ماورائیت پیدا کر دی ہے، اور پھر دوزخ کا پتہ فوجِ جفا پوچھ رہی ہے' کہکر فوج جفا کے مہلک ومہیب ترین انجام کی جانب اشارہ کر دیا گیا ہے، ایک ایسا مہیب انجام جس کا تصور فکر کی دسترس سے ماورا ہے۔ اس طرح دبیرؔ سامع کو ایسے تباہ کن انجام کا مشاہدہ کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں جہاں تک پہنچانے میں تباہی و بربادی کے بڑے سے بڑے منظر نامے بھی معاون و مددگار نہیں ثابت ہو سکتے، لیکن یہاں محض مجرد حوالوں نے اظہار میں شدت اور لامتناہیت کی ایک بیکرانی سمودی ہے۔

دبیرؔ کی شعریات میں ماورائی فضا کے حوالے سے اپنی مختصر لیکن عمدہ گفتگو میں جناب عابد حسین حیدری لکھتے ہیں:

'اس ماورائی فضا کی تشکیل میں تشبیہات، تمثیلات، محاکات، تلمیحات، اور استعارات کا جو مربوط نظام دبیرؔ کے یہاں ہے وہ کئی سطحوں پر متحرک نظر آتا ہے۔ یہیں پر دبیرؔ نے تشکیل اور ردتشکیل، تشبیہ اور ردتشبیہ اور انکار معانی سے بہت بڑا کام لیا ہے' (ایضاً صفحہ ۲۰۶)

چونکہ مراثی کا پیش منظر بہت حد تک طے شدہ ہے، لہٰذا کلام میں لامتناہیت پیدا کرنے کا عمل دبیرؔ پس منظر کی تشکیل سے کرتے ہیں، جہاں مجرد صفات کی تجسیم، اور زمان ومکان کی لامحدود وسعتوں کو تصرف میں لیکر بڑے بڑے کام انجام دیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دبیرؔ کے مرثیوں کا کینوس ارض وسما کی وسعتوں میں پھیلتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

النشر کا ہنگامہ ہے اس وقت حشر میں الصور کا آوازہ ہے اب جنّ و بشر میں
الہجر کا ہے تذکرہ باہم تن و سر میں الوصل کا ہے غل سقر و اہلِ سقر میں
الحشر جو مردے نہ پکاریں تو غضب ہے الموت زبان ملک الموت پہ اب ہے

مکمل منظر تخیلاتی وتصوراتی ہے، شاعر کے تخیل کے تعاقب میں قاری کا تصور ہفت افلاک سے زیر زمیں تک گردش کر رہا ہے، اسکی نظریں شاعر کے سجائے ہوئے منظر ناموں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہیں، ایک مستقل سفر ہے، سرعت و رفتار کا ایک عمل ہے، ایک حرّکی کیفیت ہے جس میں شاعر نے سامع کی فکر کو مسلسل مبتلا کر رکھا ہے، اور اس طرح میدان کارزار کے حرّکی تجربات کے مشاہدے میں شاعر اپنے سامعین کو

عملی طور پر بھی شامل کر لیتا ہے۔ یہاں یکے بعد دیگرے جن ماورائی مقامات سے شاعر اپنے سامع کو تیزی کے ساتھ گزارتا چلا جاتا ہے ان میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جنوں کی ماورائی بستیاں بھی ہیں، اور میدان کارزار بھی۔۔۔ جہاں اس وقت سپاہیوں کے درمیان تن وسر کی جدائی کا چرچہ ہے، لیکن ان سب کے درمیان اپنی کیفیت کے اعتبار سے سقر سب سے اہم ہے، ان مقامات سے گزرنے کے بعد سامع زیر زمیں مردوں سے بھی مل آتا ہے جو زمین کے تہہ وبالا ہونے سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ روز حشر آ پہنچا۔

ملاحظہ کیجیے کس طرح دبیرؔ سرعت ورفتار کا پس منظر ترتیب دینے میں سرگرم عمل ہیں، جبکہ پیش منظر ابھی تک اپنے مقام سے ذرہ برابر بھی آگے نہیں بڑھا ہے، یعنی شمشیر بکف حیدرؑ کا پسر ابھی صرف وارد دشت کارزار ہوا ہے۔۔۔ ابھی رزم کی منزل دور ہے، صرف آمد کی ایسی ہیبت ہے کہ عرش تا زیر زمیں عالم تہہ وبالا ہے۔ اس طرح کے پس منظر کی تشکیل سے شاعر اپنے سامع کی فکر کو ایک لامتناہی تخیلی وسعت عطا کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے، تاکہ اس کا سامع آئندہ پیش آنے والے رزمیہ واقعات کو اپنے ذاتی خروش کے سبب زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرے۔

دبیرؔ کے اکثر مرثیوں کے پس منظر آسمان کے متعلقات سے ترتیب پاتے ہیں، فطرت کی تبدل پزیر کیفیات کا استعمال ان منظر ناموں میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، لیکن شاعر کا حسنِ بیان اور اسکی تخیل طرازی ان مناظر و کیفیات میں ایک الگ ہی گہما گہمی اور جوش وخروش سمو دیتی ہے۔ مثلاً شب کی رخصت اور آمدِ صبح کا یہ منظر دیکھیئے:

جب ماہ نے نوافلِ شب کو ادا کیا سر قبلہ رو جھکا دیا ذکرِ خدا کیا
بڑھ کر صفِ نجوم نے بھی اقتدا کیا سجدے میں شکرِ خالقِ ارض و سما کیا
در کھل گئے عبادت ربِّ غفور کے خورشید نے وضو کیا چشمے سے نور کے

احساس پر مرتعش اس بیان میں نمی اور تراوٹ کی کیفیات کے ساتھ ساتھ وہ الوہی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جسے آخر شب میں بیدار ہونے والے تہجد گزار اچھی طرح پہچانتے ہیں، مکمل منظر نامہ ایک نیم غنودہ کیفیت کا حامل ہے، چونکہ خورشید نے چشمۂ نور سے وضو کر لیا ہے لہٰذا نور کے چھینٹے ادھر ادھر بھی بکھرے ضرور ہیں۔۔۔ لیکن منظر ابھی بھی مکمل طور پر واضح نہیں ہوا ہے، بلکہ ہلکی ہلکی دھند میں لپٹا ہوا سا محسوس ہوتا ہے:

گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے اسپند مشک شب کو کیا نور صبح نے

حورِ صبح نے گلگونۂ شفق ملا، اور اب وہ دھندلا منظر زیادہ روشن ہو گیا۔۔۔ کیونکہ سیاہی شب دانوں کی صورت سمٹ کر رخصت ہوئی، اسی کے ساتھ ساتھ صبح کی کافوری ٹھنڈک کا احساس بھی سورج کے مکمل طور پر نکل آنے کے سبب زائل ہو گیا:

گرمی دکھائی روشنیٔ طورِ صبح نے ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافورِ صبح نے

لیکن سورج تازہ تازہ نکلا ہے، لہٰذا ابھی اس کی روشنی میں ایک پھیکا پن برقرار ہے، چمک نہیں ہے، اس منظر کو شاعر نے لیلائے شب کے حسن کی دولت کے لٹ جانے کی خبر دیکر مکمل کر دیا ہے:

لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لٹ گئی افشاں جبیں سے نجمِ درخشاں کی چھٹ گئی

اب شاعر نے صبح کے منظر نامے کو زیادہ روشن اور واضح انداز میں پیش کرنے کے لئے ایک نئے کینوس پر لفظوں کا چھڑکاؤ شروع کر دیا ہے:

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح معبود کا وہ ذکر وہ لطفِ اذانِ صبح

باندھا عمامہ نور کا پہنی کتانِ صبح چرخِ چہارمی پہ گیا خطبہ خوانِ صبح
منھ سب کے سوئے قبلہ امید ہوگئے سر گرمِ سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

یہ تمہید ہے جس سے ایک نئے احساس کی جانب فکر گامزن ہوتی ہے، چنانچہ لفظی استعاروں کی کیفیت میں جہاں ابتک لطافت تھی وہاں اب ایک طرح کا جاہ وجلال اور تمکنت ظاہر ہونے لگی ہے، طلعت نشاں، خطبہ خواں، شہ گیتی نشاں، جیسی اصطلاحات ایک مسلسل خط فکر بناتی چلی جارہی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی مطلق العنان بادشاہ کا جلوس فلک پر جلوہ افروز ہورہا ہے:

آیا عروج پر شہِ گیتی ستان مہر لی روز نے پناہ بزیرِ نشان مہر
پرچم کشا ہوا علم زر فشان مہر ظاہر ہوئی زمانے پہ تاب و توانِ مہر
نیزہ کرن کا دیدہ گردوں میں ڈال کے مغرب میں پھینکی رات کی پتلی نکال کے
جلّادِ چرخ نے رخِ آفاق فق کیا بدلا جہاں کا رنگ جو خونِ شفق کیا
اس دور نے قمر کو الٹ کر رمق کیا سورج کو جب عروج ملا شکرِ حق کیا

اللہ اکبر۔۔۔مہر کا کیا رعب ودبدبہ قائم کیا گیا ہے، کیا ہیبت سینے میں بٹھائی گئی ہے، ایک مکمل ڈرامائی صورتحال ہے جس میں چرخ پر مہر کی سطوت شاہی کا سکہ چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور دیگر تمام اجرام فلکی اسکے آگے ہیچ محسوس ہونے لگتے ہیں۔

شہ گیتی نشان مہر کو جب عروج حاصل ہوا، اور اسکے (فوجی) نشان کا پرچم زریں کشادہ ہوا، تو 'روز' نے فی الفور زیر پرچم پناہ حاصل کی، جبکہ 'شب' نے انحراف کیا اور نتیجے کے طور پر عتاب مہر کا شکار ہوئی، چنانچہ کرن کا نیزہ دیدۂ گردوں میں گاڑ کر رات کی پتلی نکال پھینکی گئی۔ اسکے فوراً بعد جلّادِ چرخ نے شفق کا بھی خون کیا اور رنگِ جہان ہی بدل ڈالا، گردشِ دوراں نے قمر کو معزول کر کے اس تمام اختیارات سلب کر لیئے، جبکہ سورج کو عروج حاصل ہوا، اور اس نے شکر حق کیا۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک نہایت عام اور روزمرہ کے معمولی تجربے کو شاعر کی جدت فکر اور تخیل طرازی نے کیسا اسطوری رنگ عطا کر دیا ہے۔ بیان مبنی بر حقیقت ہے، کوئی مبالغہ بھی نہیں، بس نقطۂ نظر تبدیل کر دیا گیا ہے، گویا منظر وہی ہے بس عینک بدل دی گئی ہے، اور اب سامع کے لیے تمام اجرامِ فلکی زندہ ہو کر قصے کے کرداروں کی صورت مصروف حرکت وعمل نظر آتے ہیں، اگرچہ ان کے اعمال روائتی ہیں مگر انکی توضیح میں ایک ندرت ہے، ان اعمال کا سیاق وسباق تبدیل کر کے شاعر نے ایک جابر بادشاہ کے دربار کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے، اور سامع یوں حیران نظروں سے ان مناظر کو دیکھتا ہے گویا پہلے پہل دیکھا ہو۔ بھلا اس بیان سے رثائی شاعری کے کون سے تقاضے ادا ہو رہے ہیں؟ اس گفتگو کا اس ذکر سے کیا تعلق جو رونے رلانے کے لیے کیا جاتا ہے؟ البتہ یہاں ڈرامائیت اور سریت ضرور موجود ہے، بیان میں ایک زور ہے اور وہ خاص قسم کا جوش خروش بھی ہے جو بڑے سے بڑے مجمع کی مکمل توجہ اور دلچسپی کسب کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ مرثیے کے ان بندوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک منظر داستانِ امیر حمزہ کا یاد آ گیا۔۔۔آپ بھی دیکھ لیجیئے:

'جب شاہِ خاور تخت فلک پر جلوہ افروز ہوا اور شعاع نورانی سے میدان زمین پر نیزہ بازی کرنے لگا، نعمان اپنے لشکر کو لیکر میدان میں نکلا، پہلوان صف شکن، دبیلان تہمتنیں کا پرا جمائے عرصہ وغا میں آ پہنچا، سلطانِ ذی وقار، صاحبِ قرانِ روزگار، امیرِ باوقار، یعنی حمزہ نامدار، خود برسر، زرہ دربر، شمشیر درکمر، مسلح ہو کر سیاہ قیطاس پر سوار ہوئے، نیزہ ہاتھ میں لیا، جلو

میں اصحاب ورفیق وجانثار ہوئے ،طوق بن جراں نے علم کا سایہ صاحبقراں پر کیا، ہمائے اوج سعادت اپنے دام میں لیا'
(داستانِ امیر حمزہ لکھنوی نسخہ، ماخوز از ہماری داستانیں، سید وقار عظیم، صفحہ ۲۱۳)

نظم ونثر کے فرق کے علاوہ ادب وشاعری کی ان دو مختلف اصناف سے پیش کیئے جانے والے ان الگ الگ منظر ناموں میں بہت زیادہ فرق شاید آپ نے بھی محسوس نہ کیا ہو، اب اگلے بند کو دیکھیئے جہاں سورج کو سلطانِ شرق کا لقب عطا کیا گیا ہے:

مغرب میں جبکہ غرق جہازِ قمر ہوا سلطانِ شرق راکبِ کشتیٔ زر ہوا

اس طرح آفتاب کو یکے بعد دیگرے شاہانہ القابات سے موسوم کر کے شاعر نے اسے چرخ پر ایک ایسے جابر اور مطلق العنان بادشاہ کی صورت عطا کر دی ہے جس کی ہیبت تمام ساکنان عرش کے دلوں پر چھائی ہوئی ہے، اس منظر میں جلاّدِ چرخ بھی ایک ہیبت ناک اور توانا کردار ہے، جبکہ کئی کردار ضمناً آئے ہیں مثلاً:

بڑھ کر نقیبِ نور پکارا سحر سحر لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر
برقع جو اٹھ گیا تھا رُخِ ماہتاب کا پردہ تھا فاش صبحِ ملمع نقاب کا

نور، سحر، ماہتاب، صبح ملمع نقاب، قضا اور منشئ تقدیر سب کے سب انسانی کیفیات کے حامل ہیں، لیکن ان کرداروں میں کوئی خاص بات قابل گفتگو نہیں، شاعر ان کی تزئین پر زیادہ توجہ صرف کیئے بغیر صرف پس منظر کی دھوم دھام کو مرکزی خیال کی صورت پیش کرتا ہے۔ بعد از آں پیش منظر کی جانب متوجہ ہو کر دو گروہوں کو سرگرم عمل دکھاتا ہے:

ریتی پہ اتقیا تھے ترائی میں اشقیا فکرِ وضو میں قبلۂ دیں نورِ کبریا

یہاں ہماری چشم تصور دو مختلف المزاج گروہوں کو دیکھتی ہے۔ ایک گروہ میں ایک بزرگ تر، برگزیدہ تر، نورانی ہستی ہے۔ جس کے لیئے قبلۂ دیں نورِ کبریا جیسے القابات استعمال کر کے شاعر نے اسکی عظمت مستحکم کر دی ہے، اب اسی بزرگ کی بے کسی و بے بسی اور بے نیازی کی کیفیت پیش کرتے ہیں، اور پھر اس عالم بے کسی میں اس کے صاحب اختیار ہونے کا بھی اشارہ کرتے ہیں، ظاہر ہے اتنی متضاد کیفیات بہ ایں ہمہ گفتگو میں سمیٹ لینا ایک دشوار عمل ہے، مگر اسکے لیئے نہیں جس نے داستانوں کی فضا میں تربیت پائی ہو:

پانی کے لانے سے تھا جو مجبور آفتاب حاضر تھا آفتابہ لیئے دور آفتاب

حسینؑ بظاہر بیکس و بے بس ہیں وضو تو درکنار پینے کے لیئے قطرۂ آب میسر نہیں ہے۔۔۔ یہ مظلومیت کی انتہا کا اظہار ہے مگر وہی آفتاب جسکے شاہانہ جاہ وجلال کا دبدبہ شاعر ابھی ابھی اپنے سامعین کے دلوں پر قائم کر چکا ہے، اب اسے ایک غلام کی صورت پیش کرتا ہے، جو اگرچہ قضا وقدر سے مجبور ہے، مگر دور سے ہی خدمتِ امامؑ کا متمنی نظر آتا ہے، اور ایک آفتاب پر ہی موقوف نہیں کائنات کی برگزیدہ ترین ہستیاں بھی مشتاق خدمت امام نظر آتی ہیں:

آئی صدائے خضر کہ لبیک یا امامؑ لے آؤں بھر کے مشک میں آبِ بقا تمام

اظہار کو انتہائی کیفیات عطا کرتے ہوئے دبیر اتنی ہی گفتگو پر قصہ مختصر نہیں کرتے بلکہ ایک ماورائی مقام یعنی فردوس کو بھی ایک بظاہر بے بس وبیکس کے زیر نگیں قرار دینا ضروری سمجھتے ہیں:

کوثر پکارا زیر قدم میں کروں قیام باراں نے دی صدا کہ برسنے لگے غلام

اس طرح عرش وفرش کی وسعت پر تصرف کی ایک انتہائی کیفیت پیش کرنے کے بعد اب شاعر کا یہ بیان کہ:

شہؑ بولے اپنے خوں سے وضو اب کریں گے ہم پانی کا ذکر جانے دو پیاسے مریں گے ہم

وجودِ انسانی کے حوالے سے معرکہ جبر واختیار کا ایسا بلیغ اظہار ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔ اب اگر غور کیجیے تو بیان کے اس زور کا مکمل دارومدار پس منظر کی اسی اسطوری تشکیل میں پوشیدہ ہے جسکا براہ راست صنفِ مرثیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اب فیصلہ کیجیے کیا ایسی گفتگو کو محض مبالغہ پسندی پر محمول کیا جانا درست ہے؟ کیا ایسے محیطِ بیکراں کی تشکیل کے لیئے کوئی اور طریقہ گفتگو زیادہ مفید و کارگر ثابت ہوسکتا تھا؟ غور کرنے کی بات ہے کہ پس منظر کی تفصیلی تشکیل کے نتیجہ میں ہی یہ ممکن ہوا کہ عرصۂ قدیم سے زیرِ بحث ایک لاینحل فلسفیانہ مسئلہ انتہائی اختصار اور صفائی کے ساتھ پیش منظر کے چند مصرعوں میں سمیٹ لیا گیا، اور مزے کی بات یہ ہے کہ گفتگو دقیق فلسفیانہ مباحث کے بجائے ایسے اسطوری عناصر سے ترتیب دی گئی کہ عام ذہنی استعداد رکھنے والے سامعین کے ذوق سماعت کی تسکین کا سبب قرار پائی۔ اس طرح شاعر اپنے سامعین کی قصہ پسند طبیعت سے کام نکالنا خوب جانتا ہے اور دقیق مسائل کا سہل ترین بیان پر لطف انداز میں کرتا چلا جاتا ہے۔

دبیرؔ بعض مقامات پر مجرد صفات انسانی یا اجرام فلکی کا بیان دلچسپ انسانی کرداروں کی صورت میں کرتے ہیں، مثلاً ایک مقام پر صبح کو 'فصاد' کی صفات سے مشخص کرتے ہیں اور علت کے طور پر شفق کو ایک عارضہ جوش خوں میں مبتلا مریض کی صورت عطا کرتے ہیں، مرثیہ ہے جب سرنگوں ہوا علم کہکشان شب:

فصادِ صبح آیا لیے نشتر و طبق تھی جوشِ خوں کے عارضے میں مبتلا شفق

جبکہ 'قضا' کو ایک محرر یا منشی کے کردار میں پیش کرتے ہیں:

خونِ شفق میں سرخ قضا نے قلم کیا اور خطّ و خالِ روزِ شہادت رقم کیا

منشی نے قاعدے کے مطابق دفتری امور انجام دئے:

صرفِ نگاہ داشت ہوا شاہِ خوش نہاد دفتر کشا نے کھول دیا دفترِ مراد
چہرہ پہ صبح کے جو کیا آب زر سے صاد کافور ہوگئی شبِ تاریک کی مداد
البتہ سرفراز کیا ماہتاب کو عہدہ ہراولی کا دیا آفتاب کو

اور روز کو 'طغرا نویس' اور خورشید کو 'ہراولِ فوجِ سحر' کا کردار عطا کیا گیا ہے:

طغرا نویسِ روز نے پھر جس قدر لکھا وہ حرف حرف موجبِ حکمِ قدر لکھا
خورشید کو ہراولِ فوجِ سحر لکھا حرؑ کو ہراولِ شہؑ والا گہر لکھا

جبکہ 'سحر' کو خسرو کہکر اسے مصروفِ دارو گیر دکھایا گیا ہے:

مصروفِ دارو گیر میں تھا خسروِ سحر دریا کے بندوبست میں تھی فوجِ بد گہر

یہاں پس منظر اور پیش منظر ساتھ ساتھ ترتیب دیا جارہا ہے۔ ان منظر ناموں میں حرکت وعمل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے ہر منظر متحرک محسوس ہوتا ہے، یہاں تک کہ حباب اور دریا بھی سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں جس کے ذریعے بیانیے کے مرکزی تاثر کو تقویت حاصل ہوتی ہے:

ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام غم سے الٹ دیئے تھے حبابوں نے اپنے جام

دریا جو دور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے منھ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

بعض مواقع ایسے بھی ہیں جہاں شاعر لفظوں میں صبح ہونے کے منظر کی ایک حرکی تجسیم پیش کرتا ہے:

نکلا افق سے عابد روشن ضمیر صبح کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیر صبح
سلطان صبح نے کیا قصد اذان صبح باندھا عمامہ نور کا پہنی کتان صبح
یونس دہان ماہی شب سے عیاں ہوا
لو آئی صبح زیور جنگی سنوار کے شب نے زرہ ستاروں کی رکھدی اتار کے

ان حرکی تصویروں میں کہیں کہیں اعلیٰ نظم ونسق کی وہ کیفیت محسوس ہوتی جو ایک منظم فوجی دستے کا تاثر پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے:

خورشید نے برہم جو کیا دفترِ انجم سالار قمر لیکے چلا لشکرِ انجم
منشیِ سحر مہر سے لے کر قلمِ زر لکھنے لگا معزولی و منصوبی لشکر

بعض کرداروں کی تزئین میں شخصی جزئیات مخصوص کیفیات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں مثلاً مریخِ فلک کی ہیبت قائم کرنے کے مقصد سے شاعر نے جو تفصیلات بہم پہنچائی ہیں خاصی دلچسپ ہیں:

مریخِ فلک مہر کا روکش ہوا ناگاہ توسن فلک اور اسلحہِ جنگ بھی دل خواہ

اسلحوں کی تفصیل بھی غور طلب ہے، کہ نیزہ عقرب ہے، ماہ کی سپر ہے، اور توسن خود فلک ہے:

انجم کی زرہ ، نیزہ عقرب ، سپر ماہ

ایک دلچسپ دیومالائی کردار ابھر کر سامنے آتا ہے جسے اچھا خاصا مہیب بنا کر پیش کیا گیا ہے، لیکن دوسرے ہی مصرعے میں خورشید کے بالمقابل اسکا ردعمل نہ صرف یہ کہ اس کردار کی سطحیت کی جانب اشارہ کرتا ہے بلکہ اس کے مدمقابل یعنی 'خورشید' کی ہیبت قلب پر مرتسم کرنے کا سبب بھی بنتا ہے:

پر خنجر خورشید نے کیا جلوہ کیا واہ جلادِ فلک قرصِ قمر چھوڑ کے بھاگا
خورشید کی دہشت سے سپر چھوڑ کے بھاگا

یہاں ایکبار پھر دبیرؔ اپنا آزمودہ طریقہ اختیار کرتے ہیں اور بیان میں تخالف حسی پیدا کرتے ہوئے ایک تیز رفتار حرکی منظر کی تکمیل کرتے ہیں جس میں 'چھوڑ کے بھاگا' کی تکرار ایک مخصوص صورتحال ہی نہیں بلکہ ایک مخصوص ذہنیت کی بھی نشاندہی کرتی ہے، اور جلاد ملک کو ایک ایسے طبقے کا نمائندہ بنا دیتی ہے جسکے پاس ظاہری طاقت اور جاہ وحشم تو ہے، لیکن استقامت اور بردباری کا فقدان ہے۔

دبیرؔ کے مرثیوں کا مخصوص استعاراتی نظام بذات خود ایک مکمل گفتگو کا متقاضی ہے، یہاں انکے صرف ایک مرثیے 'کوفے میں بہار آئی جو گلگشت چمن کو' کے حوالے سے گفتگو پیش کی جارہی ہے، اس مرثیے میں شاعر نے خوبصورت تمثیلاتی فضا قائم کرتے ہوئے بے حد دلفریب، مدہوش کن داستانوی مناظر ترتیب دئے ہیں اور پھر ان خوشگوار و پر بہار نظاروں میں کیسی ہنرمندی سے سوز و گداز کے رنگ بھر دئے ہیں:

کوفے میں بہار آئی جو گلگشتِ چمن کو شرمانے لگا رنگِ زمیں چرخِ کہن کو
رگ رگ سے ملی نبضِ رواں گل کے بدن کو لالے نے کیا کھل کے سبک لعلِ یمن کو

ہر سرو بنا شکلِ زباں شوقِ سخن میں
فوارے در افشاں ہوئے تعریفِ چمن میں

سلطانِ بہاری نے تجمل جو دکھایا ابر آگئے نقارہ سلامی کا بجایا
ہر برگ سے گل دستِ ادب باندھ کے آیا رومال شگوفے نے غلامانہ ہلایا
بیتاب نے بوسہ جو دیا گل کی جبیں پر
تسبیح گری زاہدِ شبنم کی زمیں پر

تمام کردار اپنی اپنی مخصوص صفات کے ساتھ زندہ ہوگئے ہیں ،سلطانِ بہاری کا تجمل دکھانا،ابر کا نقارہ بجانا، پھولوں کا دستِ ادب جوڑنا،شگوفے کا رومال ہلانا، یہ تمام مناظر ہمارے جانے پہچانے ہیں،لیکن ایک مخصوص زاویہ نظر سے انکی توضیحات نے ایک سماں باندھ دیا ہے،ایک دل کشا اور مسحور کن فضا چھا گئی ہے،اور اس ماحول میں بیتاب کا صبر کھونا اور گل کی جبیں پر بوسہ دینا۔۔کیا یہ منظر ہمیں کسی داستان سے ماخوذ نہیں محسوس ہوتا؟ اب اسی ماحول میں دیگر کرداروں کی بھی آمد ہوتی ہے:

گلشن میں ہوا تخت نشیں شاہِ بہاری پوشاکِ مرصع تنِ رنگیں پہ سنواری
فرمان کیا نہر کے جاسوس پہ جاری لا بڑھ کے خبر چاہ نہیں کس کو ہماری
قبضے میں وہ ملک آئے کہ محکوم خزاں ہو سکہ اسی شاہی کا زمانے میں رواں ہو

حسبِ معمول یہاں بھی دربارِ شاہی کی کارروائی کا بیان ہے مگر اپنی کیفیت کے اعتبار سے نہر کے لیے جاسوس کا منصب متعین کرنا ایک دلچسپ پہلو ہے،اگلے بند میں بھی عام درباری کارروائی پیش کی گئی ہے،سلطانِ بہاری نے مختلف کارکنوں کی بحالی کی ،جن میں گل وسبزہ وسرو اور نرگس بیمار کا ذکر کیا جاتا ہے، یہاں تک درباری انتظامات کا بیان ہے لیکن بیت کے آخری مصرع میں سرو کو 'پیادے' اور گلوں کو 'سوار' کہکر شاعر نے اس جوش بہاری سے لبریز فضا کے تبدل کی جانب ایک قدم بڑھا دیا ہے،اور پلک کے جھپکتے ہی یہ پر لطف منظر نامہ کسی میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتا دکھائی دیتا ہے،اگرچہ پیش منظر ابھی بھی چمن کے مناظر سے ہی ماخوذ ہے صرف استعارے تبدیل کر دئے گئے ہیں:

لشکر وہ درختوں کا وہ شاخوں کی سنانیں چم خم وہ کہ دم بھرتی تھیں تیغوں کی زبانیں
نہروں سے حریفوں کی نکلنے لگیں جانیں موجیں تھیں کہیں تیر کہیں کھنچ کے کمانیں
سنبل نے بنانے کو زرہ باغ کی پائی لالے کے رسالے نے سپر داغ کی پائی

کیا تخیلاتی توضیح ہے۔۔کجا جوش گل ولالہ،سرسبز درختوں کی قطاریں،نہروں کی روانی اور کجا ساز وسامان حرب وضرب۔۔مگر ہم وہی دیکھتے چلے جاتے ہیں جو کچھ شاعر ہماری چشم تخیل کو دکھانا چاہتا ہے۔۔اور شاعر سامع کی بے بسی اور اپنے کمال دونوں سے ہی کما حقہ واقف ہے اور اسی لیئے وہ ہمارے تخیل پر کسی مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتا ہے:

ناگاہ ہوا بدلی اٹھا جنگ کو باراں کڑکیت بنا رعد صدا دی سر میداں
بجلی تھی سناں ، ابر سپر ، قطرے تھے پیکاں غصے سے ہوا سرخ رخ فوجِ گلستاں
برسا دیئے تیر اس نے جوانانِ چمن پر یاں طنطنہ یہ تھا کہ لیے سب تن و سر پر

اب جنگ کے تمام تلازمات مہیا کیے جا چکے ہیں، جنگ بھی چھڑ چکی ہے، لیکن قتال وجدال کی وہ خوں آشام کیفیت جو گذشتہ مرثیوں میں خون شفق اور شدت آفتاب سے تقویت پاتی رہی ہے اس کا پیش کیا جانا یہاں ممکن نہ تھا، میدان جنگ کی گھن گرج چمن کے اس سرسبز ولطیف پس منظر سے بس اسی قدر مطابقت رکھتی تھی کہ رعد و باراں کی شدت کو میدان جنگ میں طبل و دف بجا کر اعلان جنگ کرنے سے تعبیر دی جائے، بارش کے متواتر قطروں کو پیکان، کڑکتی بجلی کو سنانیں اور ابر کو سپر کے تصورات کے ساتھ وابستہ کیا جائے، لیکن اس سے آگے کی قتل و غارت گری کا تصور، چمن کی حالت اصلی سے کسی طور تقویت نہیں حاصل کرتا، لہٰذا منظر کے غیر اصلی اور بے اثر ہونے کے قوی امکانات تھے، لہٰذا شاعر نے بیت کے اختتام تک خورشید کو 'جج' بنا کر بھیج دیا اور اس جنگ کی صورتحال کو رفع دفع کروا دیا، اور اسطرح یہ منظر نامہ اپنے تمام تر اصلی بیان کی تخیلاتی توضیح کے ساتھ مکمل کر دیا گیا:

نیزے صف سبزہ نے جو تانے سوئے گردوں — باراں کا جگر آب ہوا جیسے کہ جیحوں
لالے کے جو پرتو کا پڑا ابر پہ شب خوں — ہر چار طرف گنبد خضرا ہوا گلگوں
باران و چمن میں رہے ساماں یہ وغا کے — خورشید پڑا فیصلے کو بیچ میں آ کے

اب جو پردہ گر کر اٹھتا ہے تو چشم تصور کو بہار کا کچھ اور ہی سماں نظر آتا ہے، بارش برس کر کھل چکی ہے، چمن کی زمیں شدت روئیدگی سے سبز سبز ہے، جبکہ آسمان شفق کی گلگونی میں نہاں ہے:

وہ جشن وہ سبزے کا نیا فرش لبِ نہر — تھا صحنِ گلستاں کہ حسینوں کا بسا شہر
وہ حسنِ زمیں جس پہ شجر کھائے ہوئے زہر — وہ جوش گلوں کا وہ بہارِ چمنِ دہر
پیدا نہ زمیں تھی نہ کہیں چرخ عیاں تھا — سبزے میں وہ پنہاں تھی، شفق میں یہ نہاں تھا

اس بند کے بعد بلا تمہید داستان سے یہ اقتباس پیش ہے:

'ہر درخت بوقلموں فیض ہوا سے سرسبز ہے، ہرا ہے، ایک ایک شاخ اتنی اونچی ہے کہ آسمان سے باتیں کرتی ہے،۔۔۔ایک سمت لالہ اپنا جوبن دکھاتا ہے، وہ اسکا گہرا سرخ رنگ خواہ مخواہ آنکھوں میں کھپا جاتا ہے۔۔۔ہزارے کے فوارے چھوٹتے ہیں، گویا موتیوں کا مینہ برس رہا ہے۔' (ہر مزنامہ از تصدق حسین، صفحہ ۲۷۷)

اگر مقابلہ کریں تو داستان کا یہ سرسبز منظر نامہ اگرچہ دلنواز ہے مگر ساکت ہے اس میں وہ حرکی توانائی نہیں جس سے ایک منظر جی اٹھتا ہے مگر دبیرؔ اپنے مراثی کے منظر ناموں میں جامد لفظوں کو رواں دواں کر کے زندگی کی ایک لہر پیدا کر دیتے ہیں:

وہ مشک بدوش ابر کا ہر باغ میں آنا — وہ نہر چمن کا کہیں آنا کہیں جانا
قمری کا ادھر سرو کے ممبر پہ ترانہ — بلبل کا ادھر مصحفِ گل پڑھ کے سنانا

اس طرح حسب معمول شاعر بیک وقت بصارت اور سماعت دونوں کو بیحد مصروف کر کے اپنے حرکی منظر ناموں میں سامع کو سرعت و رفتار کے عمل کا شریک بنا لیتا ہے، اور پھر اپنے فن کی خود ہی داد بھی دے ڈالتا ہے:

کس رنگ کا مضمونِ ضیا بار لکھا ہے — قدرت کے قلم نے خطِ گلزار لکھا ہے

حرکی مناظر پیش کرنے میں دبیرؔ خاص ملکہ رکھتے ہیں کچھ اور تصویریں بھی دیکھیے:

مانندِ رگ و ریشہ زرہ چھپتی ہے بر میں اژدر کی طرح آگ اگلنے لگے نیزے
سہمی کمانیں دوش پہ چسپیدہ ہوگئیں تیغیں سمٹ کے قبضوں میں پوشیدہ ہوگئیں
ہو کر نڈھال ڈھال کا چہرہ بدل گیا

ان مصرعوں میں زندہ انسانی کیفیات کی حرکی تجسیم کرکے بیجان اسلحوں میں جان ڈال دی گئی ہے،لیکن ان غیرانسانی کرداروں کے علاوہ ابھی کچھ اور دلچسپ حقیقی انسانی مرقعے باقی ہیں جنکا ذکر کئے بغیر اس گفتگو کو ختم نہیں کیا جاسکتا، یہ دراصل فوج یزید کے وہ دیوہیکل پہلوان ہیں جو کسی دلچسپ اسطوری کردار کی طرح اپنی ہیئت کذائی سے ہی ہمیں متعجب وحیراں رکھتے ہیں مثلاً اس عجیب وغریب پہلوان سے ملئے جس کا باطن جس قدر تاریک ہے، ظاہر بھی اتنا ہی مہیب نظر آتا ہے:

لکّھا ہے مورخ نے کہ اک گبرِ دلاور ہفتم سے فروکش تھا میانِ صفِ لشکر
روئیں تن و سنگیں دل و بد باطن و بد بر سر کرکے مہم نیزوں پہ لایا تھا کئی سر
ہمراہِ شقی فوج تھی ، ڈنکا تھا، نشاں تھا جاگیر کے لینے کو سوئے شام رواں تھا

کیا عجیب وغریب انسان ہے، گویا انسان نہیں، بلکہ کوئی دیو ہے کہ اپنے چاروں طرف نیزہ برداروں کو لئے پھرتا ہے اور کٹے ہوئے سر ہیں، جو بہرِ تماشہ نیزوں پر چڑھے ہیں، اس پیل تن کے قدم جہاں جہاں پڑتے ہیں زمین وہاں وہاں کی دھنستی جاتی ہے:

بادل کی طرح سے وہ گرجتا ہوا نکلا جلدی میں سلح جنگ کے سجتا ہوا نکلا
ہر گام رہِ عمر کو تجتا ہوا نکلا اور سامنے نقارہ بھی بجتا ہوا نکلا
غالب تھا تہمتن کی طرح اہل جہاں پر دھنستی تھی زمیں پاؤں وہ رکھتا تھا جہاں پر

آخر اس تفصیل کے بعد شاعر خود ہی اپنے اس کردار کو دیو اور آسیب جیسے فوق البشر ناموں سے پکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کیوں نہ پکارے کہ تمام اوصاف جو یہاں یکجا کیے ہیں انکا ماخذ دراصل وہی طلسماتی کرداروں سے بھری ہوئی کائنات ہے جسے ہم داستانوں کے نام سے پکارتے ہیں:

وہ رخش پہ یا دیوِ دنی تختِ زری پر غل رن میں اٹھا کوہ چڑھا کبکِ دری پر
اس ہیئت و ہیبت سے وہ نخوت سیر آیا آسیب کو بھی سائے سے اسکے حذر آیا

اس کردار کو مزید مہیب اور حیرت انگیز بنانے کے لیئے جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان پر بھی داستانوی رنگ کی گہری چھاپ ہے:

گرد اپنے لیے نیزوں پہ کشتوں کے سر آیا

زندہ ہی پئے سیر نہ ہر صف سے بڑھے تھے سر مردوں کے نیزوں پہ تماشے کو چڑھے تھے

اللہ واکبر۔۔۔کیسا عجیب وغریب، اور کس درجہ مہیب اور حیرت انگیز نقش کھینچا ہے کہ اصل داستانوں کا رنگ بھی اس کے آگے کچھ پھیکا سا پڑ گیا ہے، ایک تصویر ملتی جلتی داستانوں کی دنیا سے بھی پیش ہے اور فیصلہ آپکے حوالے:

'دریا سے ایک دیو نکلتا ہے، کوئی ہزار نو سو گز اس کا قد ہے، دو سینگ سر پر مثل دو مینار کے ہیں، آنکھیں مثل طاس خون کے سرخ ہیں، چنگال مانند شیر کے ہیں۔۔۔منھ سے مانند اژدہائے دماں شعلہ آتش نکلتے ہیں' (ایرج نامہ، جلد سوم صفحہ ۲۸۰)

یہ کچھ نہایت مختصر حوالے ہیں جو مرثیوں سے پیش کیے گئے، ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو ابھی تک بیان نہیں کی گئیں، جن پر داستانوی طرز اظہار کی گہری چھاپ ہی نہیں نظر آتی بلکہ مرثیوں میں جو اسطوری عناصر سموئے گئے ہیں اور جس ہنرمندی کے ساتھ سموئے گئے ہیں انکی بنیاد پر یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ، تاریخی حد بندیوں کے باوجود، موضوع کی سنجیدگی اور عقیدے کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، دبیرؔ نے کہیں زیادہ ترقی یافتہ انداز سے اس فن کو اپنے مرثیوں میں برتا ہے، داستان گویوں کے یہاں ایک مصنوعی پن ہے جو اکثر و بیشتر بیان میں در آتا ہے، جبکہ دبیرؔ نے حقیقی واقعات و مشاہدات کو بیان کی بنیاد بنا کر اپنی گفتگو کو اس مصنوعی پن سے بھی محفوظ رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ انکی گفتگو بہت حد تک قرین قیاس اور ہمارے تجربات کا حصہ محسوس ہوتی ہے۔ اور اس طرح سامع کے لیے اس گفتگو سے نفسیاتی وابستگی، داستانوں کی مکمل طور پر فوق الفطری دنیا سے وابستگی کے بالمقابل زیادہ ممکن، بلکہ اکثر و بیشتر حتمی ہوتی ہے، کیونکہ اس کا ذہن اصل کے ادراک کی بنیاد پر تخیل کے ممکنات کی توضیح فراہم کر لیتا ہے۔

❁❁❁

فرہنگِ مرثیہ

زیرِ طبع

ترتیب و تدوین

اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ مونسؔ

زیرِ طبع

ترتیب و تدوین

اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ انیس و دبیرؔ

زیرِ طبع

ترتیب و تدوین

اصغر مہدی اشعر

دبیری استفہام

علی عرفان

بیاناتی استفہام (rheforical question) نظم ونثر میں ایک موثر آلۂ ابلاغ کا کام دیتا ہے۔ بیاناتی استفہام ایک ایسا سوال ہوتا ہے جو جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک ڈرامائی اثرت پیدا کرنے کے لیے یا اپنے موقف کے اظہار میں زور پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ سعادت علی خاں سرتاجؔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں: ''یہ مانی ہوئی بات ہے کہ نظم میں ہو یا نثر میں، جملۂ استفہامیہ جملۂ خبریہ سے زیادہ لطف دیتا ہے''۔ یعنی بیاناتی استفہام کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ یہ بیان کے اثر کے ساتھ ساتھ اس کے لطف میں بھی اضافہ کرتا ہے۔

ادیب اور شاعر اپنے بیان میں اگر استفہامیہ جملہ استعمال کرتے ہیں اس کی اور بھی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مثلاً

- سامع یا قاری کو چیلنج کرنا۔
- ذہنوں کو کچھ خاص موضوعات کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرنا۔
- باریک بینی کی دعوت دینا۔
- مخصوص نکات پر زور دینا۔
- موضوع سے سامعین کی دلچسپی میں اضافہ کرنا۔

دبیرؔ کے مرثیوں کو بہ نظرِ غائر دیکھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دبیرؔ rhetorical question کی افادیت سے کماحقہٗ واقف تھے۔ میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بیاناتی استفہام جتنا دبیرؔ نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اتنا اودھ کے کسی بھی شاعر نے نہیں کیا ہے۔

دبیرؔ کے جو مرثیے شروع ہی بیاناتی استفہام سے ہوتے ہیں ان کی فہرست درجِ ذیل ہے:

۱۔ آدمؑ کا داد رس بنی آدمؑ میں کون ہے
۲۔ اے مومنو کیا باعثِ ایجادِ زمیں ہے
۳۔ آتش سے سبب دشمنیٔ آب کا کیا ہے
۴۔ اے مومنو کہتے ہیں جسے عشق وہ کیا ہے
۵۔ اے مومنو کس عہد سے یہ بزمِ عزا ہے
۶۔ اے صبح کیا ہوا کہ ترا جیب چاک ہے
۷۔ اے صبحِ وفا کون ترا شمسِ ضحیٰ ہے
۱۰۔ بلقیس پاسباں ہے یہ کس کی جناب ہے
۱۱۔ فردوسِ بریں گلشنِ رخسار ہے کس کا
۱۲۔ ہر آہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا
۱۳۔ کس کا علَم حُسینؑ کے منبر کی زیب ہے
۱۴۔ کس مالکِ شمشیر کے ماتم میں سپر ہے
۱۵۔ کس کی زباں سے پیاس نے پائی ہے آبرو
۱۶۔ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

۱۷۔ کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے ۱۸۔ لولاک کا جو حاصلِ معنی ہے وہ کیا ہے
۱۹۔ پرچم ہے کس علَم کا شعاع آفتاب کی ۲۰۔ قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا
۲۱۔ رُخ جلوہ فروزِ چمنِ طور ہے کس کا ۲۲۔ وہ کون دو مظلومِ ازل ہیں دو سرا میں

ان بائیس مرثیوں میں کچھ مرثیے ایسے بھی ہیں جن میں دبیرؔ نے ایک سے زیادہ مطلعے کہے ہیں اور ہر مطلع اسفہامیہ ہے۔ نمونتاً
''اے صبح وفا کون ترا شمسِ ضحیٰ ہے'' میں دو اسفہامیہ مطلعے اور ہیں:

۔۔ اے تیغِ اجل خم ترا ابرو میں ہے کس کے
۔۔ سیفی بہ مجسم ہے زباں نام سے کس کے

ایک اور مرثیہ ''کس کا علَم حُسینؑ کے منبر کی زیب ہے'' میں تو چھ اور استفہامیہ مطلعے دبیرؔ نے رکھ دیے ہیں:

کس کے علَم کے سائے میں طوبیٰ نہال ہے درگاہ کس جناب کی عالم پناہ ہے
کیوں عرشِ ذوالجلال کا سرتاجِ عین ہے کیوں حرفِ عین افسرِ عرشِ جلیل ہے
عرشِ بریں غبار ہے کس بارگاہ کا کس کے علَم کے پنجے سے خورشید زرد ہے

'ہر آہ علَم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا'' میں پانچ استفہامیہ مطلعے ہیں۔

آمد ہے علیؑ کی یہ عزا خانہ ہے کس کا کس کے درِ دولت کے گدا شاہ و گدا ہیں
سردار شجاعوں کا علمدار ہے کس کا اے عقل بتا اوج پہ تقدیر ہے کس کی

''کس مالکِ شمشیر کے ماتم میں سپر ہے''، اس مرثیے میں ایک اور مطلع ہے: ''کس آئینہ رو سے ہے اجل دست و گریباں''
''رُخ جلوہ فروزِ چمنِ طور ہے کس کا'' مرثیے میں بھی دو مطلعے ہیں۔ دوسرے مطلعے کا پہلا مصرع ہے:
''مالک نے طہارت کو مصلّا کیا کس کا''
مرثیہ ''وہ کون دو مظلومِ ازل ہیں دوسرا میں'' میں دوسرا مطلع ہے ''وہ کون دو یوسفؑ ہیں کہ آوارہ وطن ہیں''
مرثیہ: ''قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا'' میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ پورے نو (۹) استفہامیہ مطلعے ہیں۔
اس طرح دبیرؔ کے مرثیوں میں تقریباً پچاس استفہامیہ مطلعے ملتے ہیں۔
مطلعوں کے علاوہ دبیرؔ کے کلام میں درمیانِ مرثیہ بھی استفہامیہ بند ملتے ہیں، مثلاً
مرثیہ: ''اے صبح کیا ہوا کہ ترا جیب چاک ہے'' کے بند رقم چار اور پانچ استفہامیہ ہیں:

اے چرخ تیری شرم و حیا آج کیا ہوئی زینبؑ سے یہ تو پوچھ رِدا آج کیا ہوئی
کل کیا ستم ہوا تھا جفا آج کیا ہوئی بھیجی تھی جو خدا نے عبا آج کیا ہوئی
بلوے میں گاہ پھرتی ہو گاہ قید ہوتی ہو زینبؑ کہو حُسینؑ کو کس وقت روتی ہو

بے رحم لے گئے سرِ سرورؑ کہاں کہاں تم کو پھرایا شمر نے در در کہاں کہاں
اب تک پھریں حضور کھلے سر کہاں کہاں رستے میں کی عزائے برادر کہاں کہاں
حافظ نبیؐ کے پھولوں کا جنگل میں کون ہے سر تو یہاں ہیں لاشوں پہ مقتل میں کون ہے

اب دیکھتے ہیں دبیرؔ نے استفہامیہ اندازِ بیان سے کس کس طرح فائدے اُٹھائے ہیں۔

استفہامیہ اثر آفرینی کی مثال کے طور پر یہ مطلع دیکھیے۔

پرچم ہے کس علَم کا شعاع آفتاب کی پانی ہے کس پھریرے سے ہمّت سحاب کی
یہ شان ہے نشانِ رسالتؐ مآب کی چوبِ علَم کلید ہے جنّت کے باب کی
نقشہ علَم کے پنجے میں اللہ کا ملا بندوں کو اس نشان سے شانِ خدا ملا

دبیرؔ نے اس بند میں ابتدائی دو مصرعوں میں استفہام کے ذریعے سامع کی توجہ کو ایک خاص علَم کی طرف مبذول کیا اور تیسرے مصرعے ہی سے استفہام کو ختم کر دیا کیونکہ یہاں اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ دبیرؔ بڑی آسانی سے اس بند کو خبریہ انداز میں پیش کر سکتے تھے۔ صرف پہلے دو مصرعوں میں ''کس'' کی جگہ ''اس'' کا استعمال کرنا تھا۔ نہ مصرعوں کے معانی میں فرق آتا نہ روانی میں۔ مگر کوئی انصاف سے بتائے کہ کیا اثر آفرینی وہی رہتی جواب ہے؟

دبیرؔ کے استفہام میں کم از کم چار ذرائع ملتے ہیں جن کی وساطت سے دبیرؔ قاری یا سامع کے ذہن کو چند خاص شخصیتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ چار چیزیں ہیں مقام، ماحول، کوئی شئے یا کوئی اور شخص دبیرؔ کے ان چار وسیلوں کی ایک ایک مثال یہاں پیش کرتا ہوں۔

(۱) مقام:

ہر آہ علَم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا سب ہیں ہمہ تن گوش یہ افسانہ ہے کس کا
دل سینے میں جلتا ہے یہ پروانہ ہے کس کا بو خلد کی آتی ہے یہ کاشانہ ہے کس کا

ان چار مصرعوں میں دبیرؔ عزا خانہ اور عزا خانے کی فضا کی تصویر کھینچتے ہیں اور پہلے ہی مصرعے میں آہ کو علَم سے تشبیہ دے کر قاری کے ذہن کو مرثیے کے مرکز کی طرف موڑ دیتے ہیں اور پھر بیت میں شخصیت کو واضح کرتے ہیں استفہام ہی کے ذریعے۔

کیوں شیعہ اُٹھاتے ہیں علَم رنج و الم سے
کیا دستِ علمدار کٹے تیغِ ستم سے

(۲) ماحول:

کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے کیوں مثلِ زمیں زلزلے میں چرخِ بریں ہے
کیوں سورہ پہ لرزاں پرِ جبریلِ امیں ہے کیوں سہم کے جلّادِ فلک گوشہ نشیں ہے

کیا معرکے میں خسروِ ذی شاں کی ہے آمد شبیرؑ ہزبرِ شہِؐ مرداں کی ہے آمد

چار مصرعوں گردوں، زمیں، سدرہ اور فلک کے ماحول کو بیان کرنے کے بعد، پچھلی مثال ہی کی طرح بیت میں اس شخصیت کو استفہامیہ سامنے لاتے ہیں جس کی طرف چار مصرعوں میں اشارہ کر چکے تھے۔

(۳)۔ شئے:

کس کا علَم حُسینؑ کے منبر کی زیب ہے کس جنّتی کی مشک سے کوثر کی زیب ہے
لشکر ہے اِس کی زیب وہ لشکر کی زیب ہے چہرے کی فرد مالکِ دفتر کی زیب ہے
رفعت علَم کی کہتی ہے ہر عقل مند سے سقے پہ پڑھ درود صدائے بلند سے

یہاں دو اشیاء، علم اور مشک کے ذریعے شخصیت کو پیش کیا گیا ہے۔

(۴) دیگر شخصیت:

آدمؑ کا داد رس بنی آدمؑ میں کون ہے یکتا خدا کے بعد دو عالم میں کون ہے
ذبحِ عظیم مصحفِ اعظم میں کون ہے ہر گھر کا چاند ماہِ محرم میں کون ہے
جس کی خزاں بہار ہے وہ پھول کون ہے جس کی دِیَت خدا ہے وہ مقتول کون ہے

بات آدمؑ سے شروع ہوئی اور حُسینؑ تک پہنچی۔

دبیری استفہام کے ذیل میں بات آخری مراحل تک آ گئی ہے۔ موضوع کے اختتامی نتائج اخذ کرنے کے لیے مجھے دبیرؔ کے اُس مرثیے کا سہارا لینا ہے جس کا پہلا مصرع ہے:

''قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا''

اس مرثیے کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں اس نکتے کے ساتھ کہ دبیرؔ نے جتنے استفہامیہ مطلع اس مرثیے میں شامل کئے اتنے کسی اور مرثیے میں نہیں ہیں۔ ان مطلعوں کے علاوہ بھی یہ مرثیہ دبیرؔ کے مرثیوں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ فکر کے جس عروج پر اس مرثیے میں مدح ہے اتنے عروج پر مدح دبیرؔ کے دیگر مرثیوں میں مشکل سے ملے گی۔

جس طرح کہا گیا ہے کہ انیسؔ کا ایک مصرع۔ ''آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے'' میں پورا مرثیہ پوشیدہ ہے۔ اُسی طرح بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ دبیرؔ کے مصرعے، ''قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا'' میں ایک مکمل قصیدہ سمایا ہوا ہے۔

دبیرؔ کے استفہامیہ اندازِ بیان کی توانائی کو محسوس کرنے اور مدح کی بلندیوں کا لطف لینے کے لیے اس مرثیے کے سارے مطلعوں پر نظر کرنا بہت ضروری ہے۔

قرآنِ مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا اور عرشِ بریں منبرِ نُہ پایہ ہے کس کا
خورشید جو بے سایہ ہے یہ سایہ ہے کس کا فیضانِ ازل بحرِ گراں مایہ ہے کس کا

وہ کون سا بندہ ہے جو ہم نامِ خدا ہے
ممکن ہے مگر عالمِ امکاں سے جُدا ہے

وہ کس کا ہے مولد کہ خلیلؑ اس کا ہے معمار
یوسفؑ جہاں شرمندہ ہے وہ کس کا ہے بازار
ہے کون مسیحاؑ کہ خضرؑ جس کا ہے عطّار
لیتے ہیں شفا کو عوضِ ادویہ بیمار
وہ کون ہے جو فخر ہوا حکمتِ رب کا
عیسیٰؑ بھی ہے اک نسخہ نویس اس کے مطب کا

کس کی سرِ رہ فرش ملائک کو جبیں ہے
نعلینِ ہر اک دیدۂ جبریلؑ امیں ہے
نقشِ کفِ پا کس کا چراغِ رہِ دیں ہے
خوف اس کی گذرگاہ میں پیرو کو نہیں ہے
گر خاک ہے تو کُحلِ جواہر کی خوشی ہے
گر خار ہے تو میل پئے سُرمہ کُشی ہے

ہے چشمِ خدا کون میں اس چشم کے قرباں
گِرد اس کے رسولوں کی صفیں صورتِ مژگاں
وہ شمعِ حرم کون ہے پروانۂ یزداں
فانوس نمط ہفت فلک جس کے نگہباں
ہر خاصِ الٰہی پہ کرم عام ہے کس کا
کونین نوالہ خورِ انعام ہے کس کا

وہ نام ہے کس کا کہ ہے نقشِ پرِ جبریلؑ
انگشت بکف صور سے حیراں ہے سرافیل
عیسیٰؑ پہ عیاں کس نے کیئے معنیٔ انجیل
موسیٰؑ نے بھی توریت کو کس سے کیا تحصیل
وہ کون ہے ازبر جسے کل مصحفِ رب ہے
بچپن میں الف با کی طرح ورد میں سب ہے

کس نے یہ مجزّی کیے سیپارۂ ایّام
کس نے یہ مصفّا کیئے رخسارۂ اسلام
مجموعہ یہ کس نے کیا شیرازۂ احرام
مرفوع یہ کس سے ہوا آوازۂ انعام
کس نور سے آدمؑ کا شرف خاک نے پایا
کس طور سے اوجِ ابر افلاک نے پایا

کس کے شجرِ عشق کا پھل جنّتِ آدمؑ
کِس کے شررِ بغض کا مرجع ہے جہنّم
ہے کون کہ بے پردہ رُخِ حق ہوا جس دم
ہے اس کے نہ ہمراز ہوا کوئی نہ محرم
ہے کون کہ جز نورِ خدا غیر نہ دیکھا
موجود کوئی اس کے سِوا غیر نہ دیکھا

وہ کون ہے جس نے کیا فاقے پہ فاقہ
پر فاقے کے غم سے دیا سائل کو افاقہ
سب مومنوں کا کس کو خدا نے کیا آقا
دنیا کے علاقے سے نہ تھا اُس کو علاقہ
رتبے میں تو برتر تھا پیمبرؐ کے برابر
کھاتا تھا غذا بیٹھ کے قنبرؑ کے برابر

وہ کون ہے جو خالقِ کونین کا ہے ہات — اور آسیہ گرداں بھی رہا فاطمہؑ کے سات
اک ضرب نہ اس کی نہ دو عالم کی عبادات — گردن کے بھی بندھنے پہ نہ شکوہ کیا ہیہات
دشمن پہ نہ کچھ گر ہوا جلنے سے گھر کے — وہ کیا تھا مگر رہ گیا اللہ سے ڈر کے

یہ بند استفہامیہ بیان کا شاہکار ہے۔ جتنے متنوع اور مختلف پہلوؤں سے استفہام کو استعمال کیا گیا ہے اور جس اوجِ فکر پر مدح ہے اس کی مثال ملنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔

ان استفہامیہ بندوں کے بعد دبیرؔ نے جو بند رکھا ہے وہ خاص توجہ کا متقاضی ہے۔

ممدوح کو گو جان گئے ہیں ذوالافہام — احسن ہے کیا یہ نہیں تصریح کا کچھ کام
بے نام لیے اب مرے دل کو نہیں آرام — لو صلِ علیٰ پڑھنے لگو لیتا ہوں نہیں نام
پوچھے جو کوئی کون وہ خالق کا ولی ہے — قرآں بھی حدیثیں بھی پکاریں کہ علیؑ ہے

استفہامی اشارے ایسے ہیں قاری کا ذہن ممدوح تک یقیناً پہنچ گیا ہے۔ نام لینے کی ضرورت نہیں مگر نام ایسا ہے کہ لیے بغیر دل کو چین بھی نہیں آ سکتا۔ قاری سے صلوات پڑھوا کر دبیرؔ ممدوح کا نام پیش کرتے ہیں ''کہ علیؑ ہے''۔ اس بند کے دوسرے مصرعے پر ایک بار پھر غور کیا جائے۔ ''احسن ہے کنایہ نہیں تصریح کا کچھ کام''

صاف ظاہر ہے کہ دبیرؔ نے اپنے مرثیوں میں استفہام کو جو استعمال کیا ہے وہ at random نہیں بلکہ دانستہ تھا کیونکہ دبیرؔ اس طرزِ بیان کی توانائی اور فعالیت سے بہ خوبی واقف تھے۔ اس مضمون میں پیش کیے گئے شواہد کا نتیجہ صاف ہے کہ دبیریؔ استفہام انفرادیت کی شان لیے ہوئے ہے اور استفہامیہ طرزِ بیان کی حد تک دبیرؔ دیگر شعرا سے بہت آگے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

❁❁❁❁

فروغِ مرثیہ
ایک نئے عزم کی ابتدا
مصنف
اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ جوشؔ
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ دبیرؔ
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

رثائی ادب کا دبیرؔ نمبر

شہابؔ صفدر

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی عصرِ حاضر میں اردو مرثیے کی تخلیق و تحقیق کا بڑا نام ہے ان کی ہنرمندی کا ایک ثبوت رثائی ادب کا دبیرؔ نمبر بھی ہے۔۔۔ جو ۲۰۱۳ء میں دوصد سالہ یادگارِ دبیر کے طور پر شائع ہوا اس کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں ہونا تھی لیکن مدیر کی علالت اور کچھ دیگر مسائل کے سبب دس سال کی تاخیر ہوگئی۔۔۔ بارہ سو صفحات پر محیط یہ رسالہ دبیرؔ شناسی میں ایک اہم ترین قدم ہے۔۔۔ اس کا انتساب کیا زبردست ہے

میر انیسؔ کے نام

تخلیقی آدمی کی ہر کاوش کوئی نیا پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے ہلالؔ صاحب نے انیسؔ کی وفات پر دبیرؔ کا تاریخی شعر لکھنے کے بعد بجا ارشاد فرمایا:

''نہ صرف یہ کہ دبیرؔ کی جانب سے معاصرانہ چشمک کے ہر منفی رجحان کو رد کرتا ہے بلکہ یہ ان کے زاویہء نظر کی ایک شعری دستاویز بھی ہے''

موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ کے ضمن میں ان کے اداریے کا آغاز بھی کمال ہے۔۔۔۔ دبیرؔ پر زیادہ کام نہ ہونے کی ایک وجہ بقول فراقؔ یہ بھی ہے کہ عام پڑھنے والے اس بحرِ ذخار کی پیرا کی نہیں کر سکتے

اگر اس شمارے کی صرف فہرست ہی بیان کی جائے تو چھ سات بڑی سائز کے صفحات پر چلی جائے گی۔۔۔۔ بہر حال اسی سے اندازہ کیجیے کہ پروفیسر کرّار حسین، اکبر حیدری، احسن فاروقی سے لے کر تقی عابدی تک ستر کے قریب نمائندہ لکھاریوں کے مضامین۔۔۔ گزشتہ ادوار میں دبیرؔ کے حوالے سے لکھی گئی اہم تحریروں میں سے انتخاب الگ۔۔۔ پھر مرثیوں اور رباعیات کا جامع انتخاب۔۔۔۔ لکھاریوں کا مختصر مگر جامع تعارف اس کے علاوہ دبیرؔ کے عکسِ تحریر کے نمونے واقعی حیران کن پیش کش ہے

''مرزا دبیرؔ۔۔۔ از سرِ نو مطالعہ کرنے کی ضرورت'' کرّار حسین کے قلم کا مرقومہ ہے... اس مضمون میں کرّار صاحب نے سبعِ مثانی کے پہلے مرثیے ''کوفے میں بہار آئی جو گلگشتِ چمن کو'' سے بڑی عمدہ مثالیں دی ہیں۔۔۔ یہ مرثیہ حضرت مسلمؑ کے حال پر بہاریہ تمہید ہے پھر گلشن اور ابر کی لڑائی دکھائی گئی ہے ادھر۔ رعد کی کڑکیت اور بجلی کی سناں اور بارش کے تیر ہیں ادھر۔ لالہ کی ڈھالیں سنبل کی زرہ اور سبزے کے نیزے ہیں۔۔۔ الغرض کرّار صاحب نے بڑی مہارت سے مرثیے کا تجزیہ کیا ہے بہت خوبصورت اور بہترین نکات کی نشاندہی کی ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کا مضمون ''مرزا دبیر کا تحقیقی مطالعہ۔۔۔ ۱۹۷۷ء میں کتاب نما دہلی کے دبیرؔ نمبر میں چھپا تھا لیکن ان کی خواہش پر اسے دوبارہ رثائی ادب کے اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔۔۔ یہ مضمون حوالہ جات کے ساتھ عہدِ دبیرؔ کے مختلف ایسے واقعات سے بھرا ہوا ہے جن سے دبیرؔ کے مستند ہونے کی گواہی ملتی ہے۔

''مرزا دبیرؔ کا منفرد ادراک'' ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی تحریر ہے.... فاروقی صاحب بھی مولانا شبلیؔ کی ناانصافی کا سخت نوٹس لیا ہے اور کہا کہ مرزا دبیر کی شاعری الگ اہمیت رکھتی ہے۔۔ یہ ایک مخصوص ادراک کا، جسے مابعد الطبیعاتی ادراک کہتے ہیں، کمال ہے۔۔۔

''لسانی تشکیلات میں دبیرؔ کا کردار'' آغا سہیل کا مضمون ہے جو مختصر ہے مگر اردو زبان کے پس منظر اور عربی و فارسی کے اثرات کو بیان کرتا

ہے جن کا سلسلہ کلام دبیرؔ تک آتا ہے۔

ڈاکٹر عقیل رضوی نے ''لکھنؤ کے شاہی لوازمات کے پس منظر میں'' مطالعۂ دبیرؔ پیش کیا ہے۔۔مراثی دبیرؔ سے شاندار مثالیں ان کے مؤقف کو مضبوط کرتی ہیں۔۔۔۔دبیرؔ کے ساتھ ساتھ توضیح میں کلام انیسؔ سے بھی اشعار شامل تحریر کیے گئے ہیں

''دبیرؔ کے مرثیوں میں بیانیہ'' شمس الرحمان فاروقی کا نتیجۂ فکر ہے۔۔جس کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ اگر دبیرؔ کو کسی اعلیٰ مرثیہ خواں سے پڑھوایا جائے تو ان کی بیانیہ خوبیاں اور بھی واضح ہوں گی''

فاروقی صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ مرزا دبیرؔ بڑے شاعر نہ تھے ان کے خیال میں دبیرؔ کا کلام طرح طرح کے اسقام سے مملو نظر آتا ہے فاروقی صاحب یہاں شبلیؔ کے ہم خیال دکھائی دیتے ہیں۔اس لیے وہ کلام دبیرؔ کو مرثیہ خوانی کا محتاج سمجھتے ہیں آگے چل کر ان کے اپنے جملے دبیرؔ کی ہنرمندی مرعوبیت کا تاثر دیتے ہیں لیکن چونکہ وہ انیسؔ کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں اس لیے دبیرؔ ان کو چھوٹے لگتے ہیں بہرحال اس مضمون کا تفصیلی محاکمہ ضروری ہے

ڈاکٹر سلیم اختر دبیرؔ کو تیغِ سخن اور قفلِ ابجد سے تعبیر کرتے ہیں بات انھوں نے بھی شبلیؔ کے فیصلے پر گرفت سے شروع کی ہے وہ سمجھتے ہیں:

''مولانا شبلیؔ کی مشرقی شعریات کے اس تصور سے conditioning تھی جس کی اساس ذوقِ سلیم پر استوار تھی اور جس کی تشکیل میں اسلوب کی جمالیات اساسی کردار ادا کرتی تھیں۔۔۔''

آگے چل کر وہ نفسیاتی بنیادوں پر شبلیؔ کی فکر کا تجزیہ کرتے ہیں دبیرؔ کی حمایت میں انھوں نے شبلیؔ کے استدلال کو رد کیا ہے

مشکور حسین یاد نے ''مرزا دبیرؔ کی زبان کے جہات'' امیر امام حُر نے ''تین ہم عصر۔۔۔غالبؔ، دبیرؔ، انیسؔ'' ڈاکٹر سید جعفر رضا نے ''دبیرؔ اور ان کے ہم عصر۔۔عصری اور تہذیبی پس منظر میں'' پر مدلّل انداز میں تفصیل سے لکھا ہے تینوں لکھاریوں کی مرثیے اور دبیرؔ سے گہری وابستگی جھلکتی ہے بالخصوص دبیرؔ کی زبان دانی کے وہ معترف ہیں۔

سحرؔ انصاری کا دبیرؔ شناسی ایک تاثراتی مضمون ہے جب کہ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے فیضانِ دبیرؔ پر جم کے لکھا ہے کاظمی صاحب نے فاروقی کے متذکرہ بالا مضمون پر بھی بات کی ہے۔

ڈاکٹر مسعود رضا خاکیؔ نے ''مرزا دبیرؔ خیال کے چند گوشے'' کے عنوان سے مختصر اظہاریہ قلم بند کیا ہے شبلیؔ کے تذکرے سے وہ بھی دامن نہیں بچا سکے۔۔اظہار کاظمی نے ''اردو مرثیے کا طلسم ہوش ربا'' میں مرثیے میں در آنے والے ماورائی اور داستانوی عناصر کو موضوع بنایا ہے اختصار نے بات کو تشنہ رکھا ہے وہ اگر ایک کے بجائے دیگر مراثی کو بھی سامنے رکھتے تو مزا دوبالا ہو جاتا۔۔۔

''مرزا دبیرؔ: مختصر جائزہ'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کوئی طویل تحریر نہیں تاہم یہاں مرثیوں کے صرف مطلعوں کا حوالہ دے کر بات مکمل کی گئی ہے جس سے مضمون نگار کی مجموعی رائے ابھر کر سامنے آتی ہے۔

''دبیرؔ کے مرثیے میں اعلام و القاب'' ڈاکٹر سید حامد حسین کے ایک طویل مقالے کا جزو ہے جسے مدیر نے ایک نوٹ کے ساتھ درجِ رسالہ کیا ہے۔۔۔دبیرؔ کے مرثیوں میں استعمال ہونے والے نام کنیتیں القاب اور خطابات کی انھوں نے خوب وضاحت کی ہے۔

فضل فتح پوری کے مختصر تریں اظہاریے میں دبیرؔ کی فصاحت و بلاغت کی تحسین کی ہے اسی طرح مرزا امیر علی جون پوری ''مرزا دبیرؔ کے بارے میں'' رقم طراز ہیں... پروفیسر مجتبیٰ حسین کا ''مرزا دبیرؔ کی وفات کے سو سال'' اور ڈاکٹر صفدر حسین کا ''مرزا سلامت علی دبیرؔ'' پرانے

سہی لیکن دبیرؔ فہمی میں بہت اہم ہیں مشکور حسین یاد کے ایک مضمون کا ذکر اوپر ہو چکا چار مزید مضمون ان کے ''جلالت معنی کا تصور۔۔۔مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کے حوالے سے'' بلاغت ومقتضائے حال۔۔۔کلامِ دبیرؔ کے حوالے سے'' مرزا دبیرؔ کا استقبالیہ ''اور موازنہ شبلیؔ کی بخیہ گری'' دبیرؔ سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہیں۔عباس علی رضوی، جمال نقوی، سیدہ پروین کاظمی، ڈاکٹر نعیم تقوی، شیدا حسن زیدی کی مختصر تحریریں کلامِ دبیرؔ کے مجموعی تاثر کے حوالے سے ہیں۔۔۔اوسلو میں یومِ دبیرؔ کی روداد سید حیدر حسن نے قلم بند کی ہے۔۔۔مولانا شمشاد حسین رضوی نے بھی یومِ دبیرؔ کو عہد و پیمان کا دن قرار دیتے ہوئے ان کی یاد تازہ کی ہے۔۔۔یادوں کے حوالے سے اور بھی مضامین ہیں۔۔۔دوصد سالہ یادگارِ دبیرؔ نمبر کے لیے ڈاکٹر ہلالؔ نقوی نے مختلف مضامین سے موازنے پر مختلف اہلِ قلم کی آرا کو یکجا کر کے خاصے کی چیز بنا دیا ہے ان معتبر نقادوں کے نام حامد حسن قادری، ڈاکٹر احسن فاروقی، مالک رام، عابد علی عابد، فرمان فتح پوری، عبادت بریلوی، اکبر حیدری، محمد زماں آزردہ، مظفر حسن ملک اور تنویر احمد علوی شامل ہیں۔

موازنے سے انتخاب پھر اس کے جواب میں لکھی گئی کتابوں سے انتخابِ انیسؔ و دبیرؔ کی معرکہ آرائی پر مسعود حسن رضوی کی مفصل رائے عام قاری کو ایک عہد کے تحرک سے پوری طرح آشنا کرانے کی بھرپور کوشش ہے۔

دیگر مضامین میں سر رضا علی، پروفیسر احتشام حسین، حامد حسن قادری، ابواللیث صدیقی، عابد علی عابد کی کی یادگاریں ہیں جو اگرچہ بار بار کی اشاعت شدہ ہیں تاہم دبیرؔ نمبر میں ان کی شمولیت مطالعے کے لیے ایک نیا پہلو رکھتی ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر محمد علی صدیقی، نیرؔ مسعود کے رشحاتِ قلم تبرک کا درجہ رکھتے ہیں۔۔۔نیرؔ مسعود کو بجا طور پر تقریباً پچاسی صفحات دیے گئے ہیں انیسؔ و دبیرؔ کے معرکوں اور لکھنؤ کے ادبی و مجلسی ماحول کو سمجھنے کے لیے اسے پڑھنا بہت ضروری ہے اس پر ان کا جاندار اسلوب اور مرثیے کے فن سے کمال جُڑت نے اپنا رنگ جمایا ہے۔

''ہم انیسیؔ بھی ہیں اور دبیریؔ بھی'' رضا علی عابدی کا دعویٰ ہے لیکن عبارت سے صرف انیسیؔ ہی لگتے ہیں دبیرؔ کے بارے میں ان کے جملے کہیں کہیں سخت ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام نے موازنے کو ایک غیر محتاط تقابل کی مثال قرار دیا ہے ڈاکٹر اسد اریب نے بھی موازنے کے حوالے سے مرزا دبیرؔ کا تذکرہ کیا ہے اپنی تحریر سے قبل ان کا نوٹ گویا ان کے مافی الضمیر کا ترجمان ہے:

موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ توہینِ فکر کا ایک ایسا مظہر ہے کہ اگر دبیرؔ زندہ ہوتے تو مولانا شبلیؔ پر ہتکِ عزت کا دعویٰ ضرور کرتے اور دبیرؔ کے ساتھ یہ ناانصافی اس شخص نے کی جو اسلامی اخلاق کا مؤرخ سمجھا جاتا ہے۔

نصیرؔ ترابی نے جدید موازنہ انیسؔ و دبیرؔ میں کچھ خاص نکات اٹھائے ہیں جن سے انیسؔ و دبیرؔ کے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔صفدرؔ ہمدانی تو موازنے کو ایک سازش کا نام دیتے ہیں۔۔ان کا کہنا ہے کہ شبلیؔ نے موازنہ فکری غنودگی کے عالم میں لکھا۔۔موازنے کے حوالے سے اپنی بات اپنے رنگ میں عبدالرؤف عروجؔ نے لکھی ہے۔۔ڈاکٹر سید طاہر حسین نے دبیرؔ و انیسؔ کو بیک وقت خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔محمد علی صدیقی کے خیال میں انیسؔ و دبیرؔ کی جنگ ابھی جاری ہے۔۔۔

مرزا کاظم علی خان کا مضمون دبیرؔ کی ایک الگ جہت ۔۔۔غزل گوئی کو موضوع بناتا ہے۔اسی طرح سید وقار عظیم دبیرؔ کی عظمت کے دوسرے پہلو رباعی گوئی کو نمایاں کرتے ہیں اس مضمون میں ایک حیرت ناک غلطی درآئی ہے معلوم نہیں وقار عظیم صاحب جیسے مستند استاد اور ناقدِ انیسؔ کی رباعی کو دبیرؔ کے کھاتے میں کیوں ڈال رہے ہیں پھر مزید حیرت کہ مدیر کی نظر سے یہ بھُول کیسے ہوگئی

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے دل میں وہ فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتا ہے تہی دست ثنا آپ اپنی جو ظرف کہ خالی ہو صدا دیتا ہے

ہلالؔ صاحب کو فون پر اس کی نشاندہی کی وہ سخت متعجب تھے کہ یہ چُوک کیسے ہوگئی بہرحال عام قاری یہاں گمراہی کا شکار ہوسکتا ہے

تقی عابدی نے دبیرؔ کو بجا طور پر میدانِ رباعی کا شہسوار قرار دیا ہے۔۔۔رباعیاتِ دبیرؔ کے حوالے سے ان کا دیارِ نجف کا مطالعہ بھی کمال ہے۔۔۔صنعتوں کا ذکر بہت معلومات افزا ہے

دبیرؔ کی مثنویات کو کاظم علی خان نے جگر کاوی سے پرکھا ہے سلام نگاری پر بھی قلم تقی عابدی نے اٹھایا یوں مرثیے کے علاوہ بھی دبیرؔ کی عظمت کے دیگر رخ کھل کر سامنے آئے ہیں۔

صنفِ نوحہ کے حوالے سے نسرین عباس رضوی اور تاریخ گوئی کے ضمن میں ساحرؔ لکھنوی کا کام انفرادیت لیے ہوئے ہے۔

محمد زمان آزردہ کے پیشِ نظر دبیرؔ کا نثری کارنامہ ''ابواب المصائب'' ہے جس کے ایک ایک باب پر انھوں نے باریک بینی سے گفتگو کی ہے۔اکبر حیدری نے بھی اس تصنیف کا تعارف کرایا ہے۔آزردہ صاحب نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی نثر نگاری پر بھی خوب لکھا۔۔۔

ظفر اکبر نے مرزا دبیرؔ پر پی ٹی وی کے ایک مذکرے کو مرتب کیا ہے جس کے میزبان فراست رضوی اور شرکاء میں انتظار حسین۔۔۔اسلم فرخی۔۔۔افتخار عارف۔۔اور ہلالؔ نقوی تھے یہ مذاکرہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

اس کے بعد علی جواد زیدی۔۔۔پروفیسر مجتبیٰ حسین۔۔۔طاہر تونسوی کی دیگر تحریریں ہیں جو دبیرؔ کے اساتذہ اور لکھنؤ کی فضا کو قاری سے مکمل متعارف کراتی ہیں۔

دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے کو ڈاکٹر طارق عزیز نے نکتہ نکتہ کھولا ہے شیداؔ حسن زیدی نے ایک اور غیر منقوط مرثیے کو دریافت کیا ہے۔

*[1] ہم طالع ہما مرا وہم رسا ہوا

ڈاکٹر نفیس فاطمہ نے ناسخؔ، آتشؔ، غالبؔ کے اعترافِ دبیرؔ کو رقم کیا ہے۔۔۔دبیرؔ کے مرثیوں میں حمد و نعت اور منقبت قیصر نجفی کی تحریر ہے جو کہ دراصل ان کی کتاب کا ایک باب ہے یہ کتاب اردو مرثیے میں حمد و نعت و منقبت کے نام سے شائع ہوئی ہے۔۔۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے دبیرؔ کے حوالے سے چند حقائق کو زیبِ قرطاس کیا۔۔صفی حیدر دانش کا ''مقامِ دبیرؔ'' ڈاکٹر فاطمہ کا ''مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں روایت نگاری'' سید جاوید حسن کا ''عالمِ تصور میں میر انیسؔ سے ایک مکالمہ بحوالۂ دبیرؔ'' رئیس احمر کا '' کچھ دبیرؔ کے متعلق کچھ عہد جدید کے متعلق'' نئے مضامین ہیں۔۔۔جب کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ''اسلوبیاتِ انیسؔ کے ذیل میں دبیرؔ پر ایک نظر'' ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کا ''مرزا دبیرؔ اور

---

[1] نوٹ: یہ مرثیہ دراصل نواب محمد نقی خاں صاحب اخترؔ کا تصنیف کردہ ہے۔(ایڈیٹر)

میر انیسؔ۔۔۔ایک تقابلی مطالعہ''، خبیرؔ لکھنوی کا ''مرزا صاحب کے ۱۴ مرثیوں کی تصحیح واشاعت'' جو کہ سبع مثانی مطبوعہ ۱۳۴۹ھ کا دیباچہ ہے افضل حسین ثابتؔ کا'' دفترِ پریشاں سے دفترِ ماتم تک'' مہذبؔ لکھنوی کا مرزا دبیرؔ کے چند نادر وغیر مطبوعہ مرثیے (دیباچہ، شعارِ دبیرؔ، مطبوعہ ۱۹۵۱ء) اکبر حیدری کا ''مرزا دبیرؔ کے ۲۲ مرثیوں کی تفصیلات''، مرتضیٰ حسین فاضل کا ''دبیر کے ۱۴ مرثیے۔۔۔جواہرِ دبیرؔ'' پرانے مضامین ہیں لیکن ان کے انتخاب نے ''رثائی ادب'' کے دبیرؔ نمبر کو وقیع بنا دیا ہے۔

لکھنؤ کے کاظم علی خان کی اردو مرثیے میں خصوصی دلچسپی ہے ان کے مضامین کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے فہرست میں یہاں ان کا مضمون مرزا دبیرؔ کے غیر مطبوعہ مراثی، بعض غلط فہمیوں کا ازالہ' اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے مجلس ترقیٔ ادب کے لیے دبیرؔ کے بیس مرثیے مرتب کیے تھے اس کا پیش لفظ ایک مبسوط مقالہ ہے اس کو بھی دبیرؔ نمبر کا حصہ بنایا گیا ہے یہ بہت محنت اور دقت سے لکھا گیا مقدمہ ہے

ڈاکٹر ہلال نقوی نے ۲۵ مرثیوں کا مجموعہ۔۔۔دفتر دبیر جلد اول۔۔۔۱۹۹۵ء میں شائع کیا تھا اس کا پیش لفظ بھی ایک شہکار ہے یہاں اس کا اندراج بھی برمحل ہے۔

افسر صدیقی امروہوی نے آبِ حیات میں ذکرِ دبیرؔ پر شذرہ قلم بند کیا ہے سفارش حسین رضوی نے ''دبیرؔ کے رنگِ سخن کے کچھ پہلو' اجاگر کیے ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ''دبستانِ دبیرؔ'' کے عنوان سے جامع تذکرہ مرتب کیا وہ رقم طراز ہیں۔

''دبستانِ دبیرؔ کی تکمیل آسان نہیں تھی یہ بڑے کوہ کندن کاہ برآوردن کا کام تھا''

افضل حسین ثابتؔ کا ''دبیرؔ اور ملٹن میں مماثلتیں''، قندِ مکرر سہی لیکن بتقاضائے عصر ہے ڈاکٹر انیس اشفاق نے بھی نادر کاوش کی ہے ''مرزا دبیرؔ کے ایک مرثیے کا واقعاتی اور لفظیاتی نظام''

جب ماہ نے نوافلِ شب کو ادا کیا

اسی طرح فضلؔ فتح پوری نے

یا رب مجھے مرقّعِ خلدِ بریں دکھا

کا تجزیہ سپردِ قلم کیا ہے۔۔

کتابوں اور رسالوں میں دبیرؔ پر مقالات کی فہرست عبدالقوی دسنوی کی مرتب کردہ ہے۔۔دبیرؔ اور دبیریاتؔ کو سمجھنے کے لیے ضمیر اختر نقوی کا اشاریہ ایک نعمت سے کم نہیں۔

یہ کام کاظم علی خاں نے بھی بڑی تندہی سے انجام دیا ہے شادؔ عظیم آبادی کی یادداشت ''مرزا دبیرؔ کا عہدِ شباب''، تقی عابدی کی ''مرزا دبیر کی بائیوگرافی''، دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے دبیرؔ کی وفات پر قطعاتِ تاریخ کو اکبر حیدری نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے آخر میں دبیرؔ کے نو مراثی درج ہیں بارہ سو صفحات کی یہ دستاویز کہنے کو تو ایک شمارہ ہے لیکن یہ کئی کتابوں کا نچوڑ اور سینکڑوں صفحات کا مواد اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ایسا بھرپور اور وقیع کام ڈاکٹر ہلالؔ نقوی جیسے مخلص محنتی اور ادب کے لیے وقف شخصیات ہی انجام دے سکتی ہیں انیسؔ و دبیرؔ کی ڈیڑھ سو سالہ برسیوں پر اصغر مہدی اشعر بھی ڈاکٹر ہلال نقوی کی طرح مستعد اور پُرعزم ہیں یقیناً ان کا کام بھی اسی طرح خراج حاصل کرے گا۔

❁❁❁❁

مرزا دبیرؔ اور عزائی شاعری

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود واقعہ کربلا آج بھی ہمارے ذہنوں میں اسی طرح تروتازہ ہے کہ جیسے یہ کل کی بات ہو۔اور یہ بی بی زینبؑ کی تاسی ہے کہ مجلس ومنبر سے اس واقعے کی بازگشت اب بھی دلوں کو سوگوار اور آنکھوں کو اشکبار کررہی ہے۔ بلاشبہ یہ غمِ حسینؑ کا ادب پہ احسان ہے کہ بزم عزا کے فروغ نے اردو کی ترقی وترویج میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔بعض اصنافِ شاعری مثلاً مرثیہ،سلام،سوز، رباعی اور نوحے امامِ مظلوم کے غم سے اس طرح منسلک ہوئے کہ اب اس کی پہچان ہی بن گئے ہیں۔قلی قطب شاہ سے مرثیہ کا سفر شروع ہوکر انیسؔ و دبیرؔ کے دور میں بامِ عروج پر پہنچ گیا۔عہد جدید میں مرثیہ نئی راہوں پر اب بھی گامزن ہے۔عزاداری کے فروغ کے سبب نوحے کی صنف نے بھی بہت ترقی کی کہ رسمِ عزاداری میں ماتمی جلوس اس کے بغیر نامکمل ہیں۔سوزخوانی اور مرثیہ خوانی بھی مجالس کے اٹوٹ انگ رہے ہیں۔اردو کی ناقدری کے اس دور میں بھی یہ تمام اصناف نئی نسل کا اردو سے ناطہ جوڑنے میں کچھ نہ کچھ کامیاب نظر آتی ہیں۔لہٰذا انگریزی اسکولوں کے بچے بھی کہ جن کے نصاب میں اسلامیات بھی انگلش میں پڑھائی جاتی ہے جب مجلسوں میں آتے ہیں تو دین کے ساتھ ساتھ زبان سیکھنے کے عمل سے بھی گزرتے رہتے ہیں۔بیرونِ ملک مقیم بے شمار بچے بھی مجلسوں سے یونہی استفادہ حاصل کررہے ہیں۔لہٰذا مجلس عزا کی جہاں دینی حیثیت ہے وہیں اسکی سماجی اور ثقافتی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔

یوں تو اردو ادب سے منسلک تمام شعراء نے واقعہ کربلا سے جڑی بہت سی اصناف سخن پر قلم اُٹھایا ہے مگر جس طرح مرثیے کا فروغ ہوا وہ کسی اور صنف کے مقدر میں نہیں آیا اور پھر مرثیے کے باب میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ یک جان دو قالب کی صورت میں اس درجہ اثر انداز ہوئے کہ رثائی ادب کی دوسری اصناف سخن دب سی گئیں۔مگر مجلسِ عزا میں کیونکہ تمام رثائی اصناف اپنا اپنا مقام اور مرتبہ رکھتی ہیں،لہٰذا ایک عزادار کی ان تمام اصناف ادب سے پہلی ہی مجلس میں شناسائی ہوجاتی ہے۔مجلسِ عزا میں ابتدا میں صرف مصائب کا ہی تذکرہ ہوا کرتا تھا۔یہ مصائب نظم ونثر دونوں میں بیان کیے جاتے تھے۔نظم میں بیانِ مصائب کی ابتدا روضہ خوانی سے ہوئی جو بعد میں سوزخوانی میں تبدیل گئی۔عزائی ادب میں شعری سرمایہ ذاکری کے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔اول ''چوکی کی ذاکری'' جسے سوزخوانی کہا جاتا تھا،دوسرے ''منبر کی ذاکری'' جس میں تحت اللفظ مرثیے پڑھے جاتے تھے جب کہ تیسری ''ماتمی حلقے کی ذاکری'' تھی جس میں نوحہ خوانی کی جاتی تھی۔ جدید دور میں تحت اللفظ مرثیہ خوانی کے بجائے تقریر یا حدیث مجلس عزا میں زیادہ نمایاں ہوگئی ہے،البتہ اب تحت اللفظ خوانی پھر نئی کروٹیں لے کر تازہ دم ہورہی ہے۔یوں یہ تمام لوازمات کسی نہ کسی حیثیت سے مجلسِ عزا کا حصہ ہیں۔

اردو زبان وادب کی تاریخ میں مرزا سلامت علی دبیرؔ وہ تنہا شاعر ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ یعنی ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد اشعار کہے ہیں،آج جب ہم ان کا ڈیڑھ سو سالواں یوم وفات منا رہے ہیں۔اس موقع پر یہ مضمون مختصراً مجالس عزا میں ذاکری سے نوحہ گری تک مرزا دبیرؔ کے حصے کا احاطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔مجلس عزا کی اہمیت پر مرزا دبیرؔ یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل خورشیدِ یداللہ کی منزل ہے یہ محفل
روشن ہے کہ برجِ مہِ کامل ہے یہ محفل دربانیِ جبریلؑ کے قابل ہے یہ محفل
ہر ذرہ چراغِ حرمِ لم یزلی ہے حقا کہ یہ درگاہِ حسین ابنِ علیؑ ہے

مرزا دبیرؔ کی رثائی شاعری کی ایک بڑی شناخت تاریخی حوالے اور روایتوں کی نظم بندی بھی ہے۔ ذرا دیکھیے کہ وہ مجلس عزا کے پہلے بانی ظہریؔ کی شان میں کس طرح مدح سرا ہوتے ہیں۔

اے مومنو کس عہد سے یہ بزمِ عزا ہے وہ کون ہے اس بزم کا بانی جو ہوا ہے
ظہریؔ وہ عزادارِ امامِ دو سرا ہے دنیا میں اسی کو یہ شرف پہلے ملا ہے
اس بزم کا بانی وہ سعید ازلی ہے اب خلد میں ہم بزم حسینؑ ابن علیؑ ہے

مرزا دبیرؔ صرف مستند شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک عالم فاضل مجتہد بھی تھے۔ دبیرؔ کی غم پسند طبیعت نے ان کو ابواب المصائب جیسی تصنیف لکھنے پر ابھارا۔ اور یوں انہوں نے نثر نگاری میں ایک نیا باب رقم کیا۔ اور صرف ۲۷ برس کی قلیل عمر اور فقط ایک ہفتے میں ابواب المصائب مکمل کی۔ رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کے بعد اردو میں یہ دوسری نثری تصنیف ہے۔ جس میں سورہ یوسفؑ میں بیان کردہ واقعے کی تفاصیل کو واقعہ کربلا کے سانحات سے جوڑا گیا ہے۔ یہ موازنہ واقعاتی ہے، اس کی زبان سلیس اور لہجہ سادہ ہے تا کہ مجلس میں تمام سامعین تک بات با آسانی پہنچ سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی کی آنکھ سے آنسو نکلوانا کارِ دشوار ہے۔ مرزا دبیرؔ نے تمام اقسامِ ذاکری کے لیے مصائب لکھے۔ انکے اشعار میں مصائب کا بیان ان کے انکسار، رقیق القلبی اور صوفیانہ طبیعت کے آئنہ دار ہیں۔ انہیں مصائب میں المیہ، حزنیہ بکائیہ اور بینیہ بند لکھنے پہ قدرتِ کاملہ حاصل تھی۔ بقول ڈاکٹر صفدر حسین ''دبیرؔ نے اردو شاعری کو سب سے زیادہ عزا یہ سرمایہ مہیا کیا تھا اور ہر پہلو سے تبلیغِ واقعاتِ اہل بیتؑ کا حق ادا کر دیا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں مرزا صاحب کا کلام ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا اور اس نے تقریباً ایک صدی تک ہر مقام پر سوز خوانی، نوحہ خوانی اور مرثیہ خوانی کی ضروریات کو بدرجۂ اتم پورا کیا''۔ دبیرؔ کی تمام شاعری کسی نہ کسی صورت میں فرشِ عزا کا حصہ بنی رہی ہے اور یوں وہ مجلس کے تمام عناصر میں اپنی موجودگی کا بہت گہرا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا مجالسِ عزا میں سوز خوانی، جس میں میں رباعی، قطعہ سوز، سلام اور مرثیہ شامل ہیں ان کے کلام سے آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔ انہوں نے زندگی کو ایک مجسم عزادار کی حیثیت سے گزارا۔ اُن کا یہ نظریہ اِن اشعار میں صاف نظر آتا ہے۔

یارو غمِ شہؑ کے لیے اعضائے بشر ہیں سر ہائے محبانِ علیؑ خاک بسر ہیں
اور اشک بہانے کے لیے دیدۂ تر ہیں یہ ہونٹ پئے ذکرِ شہؑ تشنہ جگر ہیں
گویا ہے زباں بھی اسی تقریر کی خاطر ہیں گوش ، حدیثِ غم شبیرؑ کی خاطر

مرزا دبیرؔ کے نزدیک زندگی کا مقصد عزاداری حسینؑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ لہٰذا جب بھی عزا اور عزاداری کو گزند پہنچی آپ نے اپنا قلم بطور تلوار اٹھالیا۔ مرزا دبیرؔ کے دور میں ایک شخص نے شدت سے تعزیہ داری کی مخالفت کی تو مرزا دبیرؔ نے اس کا جواب ایک مرثیہ میں لکھا، جس کا مطلع ہے

اے شمعِ قلم انجمن افروز رقم ہو

اسی طرح ان کے دور میں جب ترکوں نے کربلا میں تقریباً بائیس ہزار زائرین کا قتل عام کیا تو اس پر بھی ان کا قلم چپ نہیں رہا اور انہوں نے ایک مرثیہ میں اس پر بھی صدائے احتجاج بلند کی۔

سوز خوانی:

ڈاکٹر نیّر مسعود اپنی کتاب ''سوز خوانی حرف وصوت'' میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں ''واقعہ کربلا کے بیان کے لیے مرثیے نے عرب میں، روضہ خوانی نے ایران میں اور سوز خوانی نے ہندوستان میں فروغ پایا۔ ابتدا میں اس فن کو مرثیہ خوانی ہی کہا جاتا تھا لیکن اس کے بالمقابل میر ضمیرؔ، میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے تحت اللفظ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یہ خوانندگی لحن والی خوانندگی سے بہت زیادہ مقبول اور مروج ہوگئی اور اس کو بھی مرثیہ خوانی کہا جانے لگا لہٰذا اشتباہ سے بچنے کے لیے لحن والی مرثیہ خوانی کو سوز خوانی کا نام دے دیا گیا''۔ سوز خوانی مجالس عزا کا ایک اہم حصہ ہے اس میں رباعی، قطعہ، سوز، سلام اور مرثیہ پڑھا جاتا ہے لیکن مجلس میں وقت کی قلت وکشادگی کے باعث ان عناصر میں کمی اور زیادتی کی جاتی رہتی ہے۔

رباعی:

یوں تو مرزا دبیرؔ نے بلا مبالغہ سینکڑوں رباعیاں لکھیں اور ڈاکٹر تقی عابدی کے بقول اب تک اُن کی دستیاب رباعیاں ۱۳۵۰ کے لگ بھگ ہیں جو اردو شاعری میں ایک ریکارڈ ہے۔ ان رباعیات میں مضامین کا تنوع، معنی آفرینی، اور الفاظ کی صنعت گری کے جوہر دبیرؔ کے خلاق ذہن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سوز خوانوں کے بستوں میں مرزا دبیرؔ کی سینکڑوں رباعیاں دیکھی جاسکتی ہیں جو وہ موقع ومحل کے حساب سے مجالس عزا میں پڑھتے رہتے ہیں۔ ترحیمی مجالس میں مرزا دبیرؔ کا یہ قطعہ جو اُن کے اولین قطعوں میں شامل ہے اکثر سننے کو مل جاتا ہے۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے — کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر — کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

مجلس کے آغاز میں نوآموز بچے اکثر پیش خوانی کے لیے یہ رباعیاں پڑھتے نظر آتے ہیں اور اکثر لوگ نہیں جانتے کہ یہ کلام مرزا دبیرؔ کا ہے

پتھر پہ علم دین کا گاڑا کس نے — للکار کے مرحب کو پچھاڑا کس نے
اصحابِ پیمبرؐ تو سبھی تھے موجود — بولو درِ خیبر کو اکھاڑا کس نے

اور

عین سے عینِ عبادت کا سر انجام ہوا — لام وہ لام کے جس لام سے اسلام ہوا
ی سے یاور ہوئے مشکل میں ہر اک بندے کی — صدقے اس نام کے کیا خوب علیؑ نام ہوا

سوز:

سوز حقیقت میں مسدس یا مرثیہ کے ایک سے تین بند پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض اوقات شعرا کے مرثیوں سے بند منتخب کر کے انہیں سوز کی صورت میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رباعیاں اور قطعات بھی بشکل سوز پڑھے جاتے ہیں۔ ممتاز شاعر اور سوز خوان سبط جعفر زیدی اپنی کتاب ''صوتی علوم وفنون اسلامی'' میں لکھتے ہیں، ''سوز میں زیادہ تر کلام مسکی اور بینیہ یعنی مصائب پر مشتمل ہوتا ہے سوز خوانی میں اسے اتنی اہمیت اور کلیدی حیثیت حاصل ہے کہ سوز خواں اگرچہ قطعہ، رباعی، سلام اور مرثیہ سبھی کچھ پڑھتا ہے مگر کہلاتا سوز خوان ہے اور کسی

سوزخوان کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ سوز ہی ہوتا ہے''۔مرزا دبیرؔ سوزخوانوں کی فرمائش پر اکثر کسی شہید کے حوالے سے انہیں سوز لکھ کر دے دیتے تھے۔اس کے علاوہ بہت سے سوزخوانوں نے ازخود مراثی دبیرؔ کے بندوں کو سوزخوانی کے قالب میں ڈھال کر مجالس عزا کا حصہ بنا دیا۔ روز عاشور کی اکثر مجالس کا آغاز مزاد بیرؔ کے اس سوز سے ہوتا ہے۔

حسینؑ جب کہ چلے بعد دوپہر رن کو — نہ کوئی تھا کہ جو تھامے رکاب توسن کو
سکینہؑ جھاڑ رہی تھی عبا کے دامن کو — حسینؑ چپکے کھڑے تھے جھکائے گردن کو
نہ آسرا تھا کوئی شاہِؑ کربلائی کو — فقط بہن نے کیا تھا سوار بھائی کو

سلام:

سوزخوانی کی ترتیب میں رباعی اور قطعہ کے بعد اور مرثیے سے پہلے سلام بھی پڑھا جاتا ہے۔ڈاکٹر عقیل عباس جعفری اپنی کتاب'' سوزخوانی کے فن'' میں سبطِ جعفر زیدی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔''سلام میں فضائل ومصائب دونوں ہی ہوتے ہیں اس لیے اس کی بندش میں دونوں انداز ادائی ہیں یعنی اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ بندش ایسی ہو کہ جو فضائل ومصائب میں مدحیہ، بہاریہ، المیہ ہر طرح کی ادائی کا حق ادکر سکے۔ن میں چار سے دس اشعار تک پڑھے جاسکتے ہیں''

مرزا دبیرؔ کے سلام بھی ان کے مرثیوں کی طرح بے مثال اور لاجواب ہیں۔سلام میں طویل قطعہ بند تخلیق کرنے کا آغاز بھی دبیرؔ ہی کی اختراع ہے۔دبیرؔ سلام میں ایک اور تبدیلی یہ لائے کہ ہر شعر میں سلام، السلام، یا سلام علیک کی ردیف نہ برتی گئی، بلکہ صرف مطلع میں سلامی، مجرا یا مجرائی کا استعمال کیا گیا۔انہوں نے تین سو سے زائد سلام لکھے بقول ڈاکٹر تقی عابدی ان سلاموں کے اشعار کی تعداد ۳۱۲۳ ہے۔دبیرؔ کے چند مشہور سلاموں کے مطلع جو اکثر مجالس عزا کی زینت بنتے ہیں دیکھئے:

۱۔ جو کہ مصروف سلامِ شہدا رہتا ہے — گو وہ رہتا نہیں پر نام سدا رہتا ہے
۲۔ سلامی ذرہ نہ دوں آفتاب کے بدلے — نہ لوں میں عرش در بوتراب کے بدلے
۳۔ سلامی نجف کو عناں کھینچتے ہیں — ہمیں بخت سوئے جناں کھینچتے ہیں
۴۔ در آلِؑ عبا ہے اور میں ہوں — سلامی یہ غذا ہے اور میں ہوں
۵۔ مثلِ گل چاک ہے مجرائی کفن زہراؑ کا — کٹ گیا فصلِ بہاری میں چمن زہراؑ کا
۶۔ جب کہ چڑھا شاہؑ کا سر نیزے پر — آفتاب آیا قیامت کا نظر نیزے پر

مرثیہ:

سوزخوانی کا آخری جزو لحن سے مرثیہ پڑھنے کا ہوتا ہے اور اس میں صرف مصائب ہی پڑھے جاتے ہیں۔لہذا سوزخوان حضرات ایسے مراثی پڑھتے ہیں جو سامعین پر بہت زیادہ گریہ اور رقت طاری کریں۔مرزا دبیر اردو مرثیے کے اس اعتبار سے واحد شاعر ہیں جن کے مراثی برصغیر میں سوزخوانوں کے بستوں کی زینت بنے، اور مجالس کا بنیادی حصہ بن کر ابھرے۔اس کے علاوہ مرزا دبیر کی زود گوئی کے سبب ان کے ہاں ہر شہادت پر مرثیے مصائب کی فراوانی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔مرزا دبیر اپنے پہلے ہی مرثیے کا آغاز نہایت حزنیہ اور

دل گداز مطلع سے کرتے ہیں

بانوؑ پچھلے پہر اصغرؑ کے لیے روتی ہے ایک وہ جاگتی ہے خلق خدا روتی ہے

سوزخوانی، مرثیہ کے بغیر ممکن نہیں، مگر مرثیے کی طوالت اسے مجلس عزا کا حصہ بنانے میں آڑے آتی ہے۔ دبیرؔ کو بہت سے مرثیہ نگاروں سے اس بات پر بھی فوقیت رہی ہے کہ انہوں نے بہت سے مختصر مرثیے بھی لکھے۔ مرزا دبیرؔ کے بیٹے مرزا اوجؔ کا کہنا ہے کہ نواب نادر فیض آبادی نے مرزا صاحب سے چودہ معصومین کے احوال پہ مختصر مرثیے لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تا کہ وہ مجالس میں پڑھے جاسکیں جس کی تکمیل مرزا صاحب نے کی اور راستے میں کہے گئے تمام مراثی نواب کے مصاحبین کو سونپ دیئے۔ ان میں سے کچھ مرثیوں کے مطلع درج ذیل ہیں۔

؎ کیا خلق حسن تھا حسنؑ سبز قبا میں ؎ بیمارِ کربلا کا بھی کیا فیضِ عام ہے
؎ ہے قصد کچھ فضائلِ باقرؑ رقم کروں ؎ جعفرؑ صادق کا رتبہ خلق میں مشہور ہے
؎ کیا موسیٰ کاظمؑ کے فضائل کا بیاں ہو ؎ کیا شاہِ خراساں کی زیارت کا شرف ہے
؎ شہرہ جہان میں حسنِ عسکریؑ کا ہے

مجالس عزا میں لحن سے پڑھے جانے والے مرزا دبیرؔ کے یہ مرثیے مقبول خاص و عام ہیں۔

؎ قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے ؎ روانہ نہرِ لبن کو جو شیر خوار ہوا
؎ زنداں میں جب کہ دخترِ شبیرؑ مرگئی ؎ مومنو بے کس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ
؎ چہلم جو کربلا میں بہتّر کا ہوگیا ؎ بانوؑ کے شیرخوار کو ہفتم سے پیاس ہے
؎ مسافرانِ مصیبت وطن میں آتے ہیں ؎ جب کہ زنداں میں نبیؐ زادیوں کو رات ہوئی

تحت اللفظ مرثیہ خوانی:

اب سے سوڈیڑھ سو برس پہلے مجالس میں سوزخوانی کے بعد مرثیہ تحت اللفظ پڑھنے کے ساتھ ہی مجلس کا اختتام ہوجایا کرتا تھا۔ مرثیہ گو اپنی گرج دار آواز میں مرثیہ اس انداز سے پڑھتے تھے کہ لوگ محو ہوجاتے تھے۔ دبیرؔ کے استاد جناب میر ضمیرؔ نہ صرف بہت اچھے مرثیہ گو تھے بلکہ بلند پایہ تحت اللفظ خوان بھی تھے اور یہ خوبی ان کے بعد میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ اور دوسرے شعرا میں بھی دکھائی دی۔ ماضی قریب میں جوشؔ، آلِ رضاؔ، اور نسیمؔ امروہوی بھی اپنا کلام خوبصورت تحت اللفظ کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں اس کے علاوہ مرثیۂ نو تصنیف کی مجالس میں تمام شعراء تحت اللفظ ہی میں اپنا کلام پڑھتے ہیں مگر عام لوگوں کا اس طرف کم رجحان ہے۔ علامہ رشید ترابی، ضیا محی الدین، اور زیڈ اے بخاری سے لے کر حسان جونپوری، آغا شاعر قزلباش، سید جاوید حسن، اور سبط حسن انجم نے اپنے اپنے انداز میں اس طرز خوانندگی کے چراغ کو جلائے رکھا۔ جب کہ حالیہ دور میں اصغر مہدی اشعر، فرحان رضا، کاظم ناصری اور دیگر اس فن میں دوبارہ زندگی کی نئی روح پھونک رہے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کے چند مقبولِ عام مرثیے جنہیں تحت اللفظ خوانوں نے اپنے بستوں کی زینت بنایا ہے اور انہیں مجلسوں میں کثرت سے پڑھتے ہیں کے مطالع درج ذیل ہیں۔

؎ جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے ؎ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
؎ سیفی کا نمونہ مری شمشیر زباں ہے ؎ مریمؑ سے بھی بتولؑ کو رتبہ سوا ملا

؎ جب داغِ بے کسی نہ سکینہؑ اُٹھا سکی ؎ کس کا علم حسینؑ کے منبر کی زیب ہے

نوحے

نوحہ خوانی مجلس کے اختتام کا ہمیشہ سے مضبوط اور مقبول حصہ رہا ہے۔لغوی اعتبار سے کسی کی وفات پر بین کرنا نوحہ کہا جاتا ہے۔مہذبؔ لکھنوی کی مہذبؔ اللغات کے مطابق نوحہ ایک صنف شاعری ہے جس میں امام حسینؑ یا شہدائے کربلا کے مصائب نظم کئے جائیں اور پورا نوحہ ایک ہی شہید کے بارے میں ہو اور کسی ایک کی زبان میں ہو۔اگرچہ مرزا دبیرؔ کے ہاں مشکل پسندی کا رجحان ملتا ہے اور انہیں ادق لفظیات، اور صنائع بدائع کے بے جا استعمال پر مطعون بھی کیا جاتا ہے مگر وہ جب نوحے جیسی نازک اور حساس صنف کو لکھتے ہیں تو اپنی زبان دانی اور طوالت، جو اُن کے مراثی کا خاصہ ہے کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔مرزا دبیرؔ کے نوحوں میں سوز و گداز اور حزن و ملال کی وہی کیفیت پائی جاتی ہے جو ان کے مراثی سے مخصوص ہے۔نوحوں میں وہ انسانی جذبات غم اور حفظ مراتب کا بہت خیال رکھتے ہیں، بیٹے کی لاش پر غمزدہ ماں کا نوحہ، دولہا کی لاش پر دلھن کی بکا، بھائی کی لاش پر بھائی کا گریہ، سامع کے دل پر ایسے چوٹ لگاتے ہیں کہ آنکھوں سے آنسو خود بخود رواں ہو جاتے ہیں۔

کرتی تھی بانوؑ یہ بین شیر جواں مرگیا ہوگئے بیکس حسینؑ شیر جواں مرگیا
نوحہ نہ پڑھ اے دبیرؔ حال ہے سب کا تغیر کہتے ہیں خرد و کلاں شیر جواں مرگیا

مرزا دبیرؔ کے مصائب میں سوگوارانہ الفاظ اور فریاد آفریں تشبیہات و استعارات پائے جاتے ہیں۔ پیارے مرے بابا، واحسرت و دردا، ہائے حسین غریب جیسے ردیف انتہائی غم انگیز کیفیت کے اظہار کا باعث بنتے ہیں جو مجلس عزا کی حزنیہ فضا کو اور بھی المناک بنا دیتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کے نوحے دفتر ماتم کی بیسوئیں جلد میں محفوظ ہیں۔اُن میں سے چند نوحوں کے مطلع درج ذیل ہیں

؎ جب شمر نے تن سے سرِ شبیرؑ اُتارا وا حسرت و دردا ؎ کرتی تھی سکینہؑ یہ بیاں لاشۂ شہ پر پیارے مرے بابا
؎ کہا بانوؑ نے میں قرباں مرے نامراد اکبرؑ ؎ یہ رن میں کہتی تھی زہراؑ حسینؑ من حسینِؑ من
؎ کہتی تھی شہؑ کی بہن ہائے حسینؑ غریب لپٹ کے روٗو ضریح حسینؑ سے یارو

اگرچہ مرثیہ نگاروں نے نوحے بھی لکھے مگر وہ ان کی مرثیہ نگاری کے سائے میں چھپ گئے، مرزا دبیرؔ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے بہت سے مرثیے نوحے کی شکل میں بھی پڑھے جاتے رہے ہیں۔اسی عہد کے معروف نوحہ خوان جعفر بھائی کی نوحہ خوانی کی ایک بہت بڑی پہچان دبیرؔ کے یہ مرثیے تھے خصوصاً:

؎ حضرت کو ہوا ماہِ محرم جو سفر میں ؎ تنہا شب فرقت میں بکا کرتی تھی صغریٰ

ریحانؔ اعظمی نے مرزا دبیرؔ کے بہت سے مرثیوں کے حصے اپنے نوحوں کے آغاز میں اس طرح شامل کیے کہ وہ ان کا ہی کلام لگتے ہیں اختتام عزا پہ سوگ بڑھاتے ہوئے مرزا دبیرؔ کا یہ نوحہ تو کوئی بھلا ہی نہیں سکتا۔

اربعیں کے سوگوارو الوداع آخری مجلس ہے یارو الوداع
خاتمہ بالخیر چہلم کا ہوا الوداع اے اشک بارو الوداع
قبر سے آواز دیتے ہیں حسینؑ لو بہن زینبؑ سدھارو الوداع
مومنو اب تم بھی مانند دبیرؔ روو پیٹو اور پکارو الوداع

مرزا دبیرؔ بحیثیت مثنوی نگار

ڈاکٹر منتظر مہدی

مرزا دبیرؔ نے جہاں مرثیہ، سلام، رباعی اور غزل کے اصناف میں طبع آزمائی کی ہے وہیں مثنوی کے صنف میں بھی انہوں نے سخن طرازی کی ہے۔ لیکن بہت سے دبیرؔ شناسوں اور تنقید نگاروں نے دبیرؔ کے مراثی اور رباعیات پر توجہ صرف کی لیکن ان کی مثنوی نگاری پر سیر حاصل بحث سے گریز کیا۔ اس لیے ان کی مثنویاں بہت عرصہ تک عدم توجہ کا شکار رہی ہیں۔ امداد امام اثرؔ نے تو دبیرؔ کی مثنوی نگاری سے سرے سے انکار کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ظاہراً اردو میں میر انیسؔ یا مرزا دبیرؔ کے سوا کوئی شاعر بھی فردوسیؔ یا نظامیؔ کی فکر و قابلیت کا نہیں مگر ان بزرگ وار نے مثنوی نگاری کی طرف کبھی اپنی توجہ مبذول نہیں فرمائی۔'' (کاشف الحقائق، جلد دوم۔ امداد امام اثرؔ صفحہ ۳۲۴) امداد امام اثرؔ کے اس قول پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید انہوں نے دفترِ ماتم کی ساری جلدوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ بعد کے بھی کچھ محققین نے بھی جیسے جلال الدین احمد، عبدالقادر سرمدی، ابر احمد علوی اور ابو اللیث صدیقی وغیرہ نے بھی دبیرؔ کو مثنوی نگاروں کی فہرست میں شامل کرنے سے گریز کیا ہے۔ کچھ ایسے ناقدین ہیں جنہوں نے مرزا دبیرؔ کی ایک یا دو مثنویوں کا ذکر کیا ہے ان ناقدین میں سید محمد عقیل رضوی، افضل حسین، ثابتؔ لکھنوی، ذاکر حسین فاروقی، گیان چند جین، سید سلیمان حسین اور اکبر حیدری کاشمیری کے نام شامل ہیں جنھوں نے مرزا دبیرؔ کی مثنوی ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کاظم علی خان نے دبیرؔ کی ایک تیسری مثنوی جس کا عنوان ''فضائلِ چہاردہ معصومین علیہم السلام'' ہے دریافت کی ہے۔

عصرِ حاضر کے نامور محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مرزا دبیرؔ کی مثنویوں کو تلاش بسیار کے بعد ''مثنویاتِ دبیرؔ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اور اس میں انہوں نے مرزا دبیرؔ کی آٹھ مثنویاں شامل کی ہیں۔ پہلی مثنوی ''احسن القصص'' ہے۔ یہ مرزا دبیرؔ کی ایک طویل مثنوی ہے جس میں تین ہزار سے زائد اشعار ہیں موضوع کے لحاظ سے یہ ایک مذہبی مثنوی ہے جس میں مرزا دبیرؔ نے چودہ معصومین علیہم السلام کی ولادت کے حالات، معجزات اور ان کے فضائل و مناقب کو بیان کیا ہے۔ مذہبی موضوع ہونے کے باوجود بھی مثنوی میں دبیرؔ کا تخیلی اسلوب، تشبیہات و استعارات اور مبالغہ وغیرہ کی مثالیں جا بہ جا موجود ہیں۔ مثنوی کا پہلا شعر ملاحظہ ہو۔

جسے حق نے بخشی ہے قدرِ رفیع وہ برحق یہ پہلا ہے ماہِ ربیع

اس مثنوی میں نعت پاک کے اشعار بھی پوری فنکاری کے ساتھ نظم کیے گئے ہیں کچھ نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کرم ہے نبیؐ کا عجب واہ واہ گنہ ہم کریں اور وہ عذر خواہ

کوئی بے مثال ایسا آیا نہیں کہیں جسمِ انور میں سایا نہیں

نہ کیوں ساتھ سائے کا ہو ناگوار — کہ فضلِ خدا ساتھ ہے سایہ دار
یہ سائے کی مدحت ہے عیب و گناہ — وہ ہے نور صاف اور پتلی سیاہ
دھواں پہنچے کب شعلۂ طور کو — یہ اندھیر ظلمت کہا نور کو
سبزاوار سائے کی ہے یہ ثنا — کہ نورِ نگاہِ رسولاں بنا
نظر پر یہ مضمون بھی کم چڑھا — سبق وحی کا عقل کل سے پڑھا
کہ سایہ یہ ہونے کی ہے یہ دلیل — وحید الولا ہیں رسولؐ جلیل
یہ ہیں عاشقِ وحدہٗ لاشریک — نہیں عشق میں کوئی ان کا شریک
نہ تہلیل و تحمید میں ایک ہیں — یہ اصحابِ توحید میں ایک ہیں
نہیں شرکت سایہ اس راہ سے — جدا ہیں نبیؐ ماسوا اللہ سے
دبیرؔ اب کمیتِ قلم روک لے — نظامیؔ کو اس نظم میں ٹوک لے

حضور پاکؐ کے حال کے ۱۲۱۰ اشعار دبیرؔ نے رقم کیے ہیں نمونے کے طور پر اور کچھ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ان اشعار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ دبیرؔ کو اپنے موضوع پر پوری دسترس حاصل ہے نعت گوئی ایک مکمل صنف ہے۔مثنوی میں اس طرح سے نعتیہ اشعار کا مدغم کر دینا ایک شاعرانہ کمال ہے۔اور یہ کمال مرزا دبیرؔ نے اس مثنوی میں بخوبی دکھایا ہے۔حضورؐ کے حال کے ۱۲۱۰ اشعار کے بعد دبیرؔ نے حضرت ابوطالبؑ کا خواب نقل کیا ہے اور اس خواب کے بعد جناب ابوطالبؑ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے اور وہ کعبہ کی طرف کس انداز میں جاتے ہیں اور کاہن سے کیا سوال و جواب کرتے ہیں اس کو بھرپور شعری محاسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے نمونہ کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کدھر ہے تو اے ساقیِ ماہ رو — شرابِ مسرت سے بھر دے سبو
عیاں بست و ہفتم رجب کی ہوئی — مہیا مراد آج سب کی ہوئی
خوشی کی ہمیں آج تاکید ہے — ارے عید ہے عید ہے عید ہے
مئے عیش سے مست ہیں حیدریؑ — نبیؐ کو ملی آج پیغمبری

اس کے بعد مرزا دبیرؔ نے حالاتِ ولادت باسعادت حضرت فاطمہ زہراؑ کے عنوان سے جناب فاطمہ زہراؑ کی ولادت کا حال رقم کیا ہے۔ یہ حصہ ۱۲۱۵ اشعار پر مشتمل ہے اس حصے میں دبیرؔ نے حضرت صدیقہ طاہرہؑ کے فضائل و کمالات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اس حصے سے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

شرف میں ہیں یہ مثلِ خیرؐ الوریٰ — وہ خیرؐ البشر ہیں یہ خیرالنساؑ
خدا کی ہے قدرت کا ان سے ظہور — ہوا نورِ خالق سے مشتق یہ نور

ہوا ان کا دنیا میں جس دم ظہور ہوئی ظلمتِ کفر ایماں سے دور

اس حصے کا اختتام درج ذیل شعر پر ہوتا ہے۔

ہر اک شیعہ سے ہوں میں امیدوار کہ آئیں کہیں بے ریا ایک بار

مثنوی کا تیسرا حصہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولادت باسعادت اور فضائل وکمالات سے متعلق ہے۔مثنوی کا یہ حصہ سب سے طویل ہے اس حصے میں ۱۸۱۹ اشعار نظم کیے گئے ہیں۔اس حصے میں مرزا دبیرؔ نے عیدِ نوروز، عیدِ غدیر اور عیدِ مباہلہ سے متعلق واقعات کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے شاید اس لیے یہ حصہ کچھ طویل ہو گیا ہے۔اس حصہ کا آخری شعر بڑا معنی خیز ہے ملاحظہ کیجیے۔

ہر اک سال جب تک ہو تحویلِ مہر رہے اس پہ بارہ اماموں کی مہر

مرزا دبیرؔ کی یہ پوری مثنوی چہاردہ معصومین علیہم السلام کی ولادت باسعادت ان کے معجزات وکمالات اور ان کے فضائل ومناقب سے متعلق ہے۔دبیرؔ نے مثنوی میں جس واقعے کو بھی پیش کیا ہے وہ واقعہ نگاری کے معیار پر پورا اترتا ہے۔حضرت علیؑ کے فضائل ومناقب کے بعد حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام محمد باقرؑ، حضرت امام موسیٰ کاظمؑ، حضرت امام علی رضاؑ، حضرت امام محمد تقیؑ، حضرت امام علی نقیؑ، حضرت امام حسن عسکریؑ اور آخر میں حضرت امام مہدی علیہم السلام کے حالات کو پیش کیا ہے۔مثنوی کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے علامہ شبلیؔ نعمانی نے جو معیار معیّن کیا ہے اس معیار پر یہ مثنوی پوری اترتی ہے جیسا کہ علامہ شبلیؔ نے چار عناصر کو مثنوی نگاری کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔(۱) حسنِ ترتیب (۲) کیریکٹر (۳) کیریکٹر کا اتحاد (۴) واقعہ نگاری۔

علامہ شبلیؔ کے پہلے معیار کو اگر سامنے رکھا جائے یعنی حسنِ ترتیب اس کے تحت جس واقعے کو مثنوی میں نقل کیا جائے اس کی ترتیب اتنی مناسب ہو کہ کہیں بھی قاری کو واقعات کا تسلسل منقطع ہوتا نظر نہ آئے۔شبلیؔ کے اس پیمانے پر دبیرؔ کی یہ مثنوی اس لیے پوری اترتی ہے کہ مرزا دبیرؔ ایک بڑے مرثیہ نگار تھے اور مرثیے میں بھی کسی نہ کسی واقعہ کو موضوع بنایا جاتا ہے اور اس واقعے کا تسلسل کے ساتھ اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ واقعہ کی ساری جزئیات کا احاطہ کیا جا سکے اور دبیرؔ کے مراثی میں یہ حسنِ ترتیب بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔جب ایک صنف میں بھی وہ اس کو بہ آسانی پیش کر سکتا ہے اسی لیے مرزا دبیرؔ اس مثنوی میں حسنِ ترتیب کو برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں کسی مثنوی کی کامیابی کا دوسرا عنصر جو علامہ شبلیؔ نے بیان کیا ہے۔وہ کیریکٹر ہے۔مرزا دبیرؔ نے اس مثنوی میں جو کیریکٹر پیش کیا ہے۔وہ اعجاز نما کیریکٹر تھے۔شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر کیریکٹر کی انفرادیت کو شعری محاسن کے ساتھ پیش کرے مرزا دبیرؔ نے اس مثنوی میں ہر کیریکٹر کی امتیازی خصوصیات کو قائم رکھا ہے۔

شبلیؔ نے تیسرا پیمانہ جو مقرر کیا ہے وہ ہے کیریکٹر کا اتحاد اگر اسی پیمانے پر بھی دبیرؔ کی اس مثنوی کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دبیرؔ جو بھی کیریکٹر پیش کیا ہے اس میں بدرجہ اتم اتحاد موجود ہے۔چہاردہ معصومین علیہم السلام کے کیریکٹر میں کہیں سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں تھی لہٰذا اس معیار پر بھی دبیرؔ کی مثنوی پوری اترتی ہے۔مثنوی نگاری کا سب سے اہم عنصر بقول علامہ شبلی واقعہ نگاری ہے اس واقعہ نگاری کے ضمن میں علامہ شبلیؔ نے کچھ شقیں بھی بیان کی ہیں۔(۱) دقیق اور نازک باتوں کا مفصل بیان (۲) اور ہر چھوٹے بڑے واقعے کی تفصیل تاکہ مثنوی

کو سمجھنے میں آسانی ہو(۳) اگر ناممکنات بھی نظم کیے جائیں تو کچھ اس طرح کہ پڑھنے والا اس کے جادو میں گم ہو کر صحیح سمجھنے لگے۔اس مثنوی میں یہ ساری خصوصیات بھرپور طریقے سے پائی جاتی ہیں۔مرزا دبیرؔ کی واقعہ نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لکھا ہے۔

''جہاں تک میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی شاعری کا تعلق ہے اس بات کو تو ہر شخص مانتا ہے کہ دونوں شاعر واقعہ نگاری کے شہنشاہ تھے۔ مثنویاتِ دبیرؔ کا ہر ورق واقعہ نگاری کے کمال کی سند ہے۔''(مثنویات دبیر۔مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی صفحہ۔۔۔۔)

اس مثنوی میں واقعہ نگاری کے ضمن میں مرزا دبیرؔ نے حضورؐ پاک اور حضرت علیؑ کے جو القاب مختلف صحیفوں میں آئے ہیں ان القاب و خطابات کو دبیرؔ نے جس انداز سے مثنوی میں پیش کیا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دبیرؔ کی یہ مثنوی علامہ شبلی کے معیار پر پوری اترتی ہے۔مرزا دبیرؔ نے حضورؐ کی مشہور حدیث ''اوّل ماخلق اللہ نوری'' اس مثنوی میں جس انداز میں پیش کیا ہے وہ واقعہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے ذیل میں دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

نہ خاک و ہوا تھی نہ آتش و آب — کہ روشن تھا نورِ رسالتؐ مآب
نہ آدمؑ نہ حوا نہ غلماں نہ حور — ہزاروں برس پیشتر تھا یہ نور

اس طرح کے بہت سے واقعات کو دبیرؔ اس مثنوی میں بھرپور شعری محاسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس مثنوی کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پوری مثنوی کی زبان سلیس اور رواں ہے اور تاریخی واقعات کی بھی بہتات ہے۔چہاردہ معصومینؑ کے معجزات کو نقل کرنے میں دبیرؔ نے اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے بقول محمد زمان آزردہ ''اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنی قسم کی پہلی مثنوی ہے۔''

دفترِ ماتم کی پندرھویں جلد میں مرزا دبیرؔ کی دوسری مثنوی ''معراج نامہ'' ہے جس میں کل ۶۸۴ اشعار ہیں۔یہ مثنوی بھی مذہبی موضوع پر مشتمل ہے اس میں حضرت رسول اکرمؐ کی معراج کا حال بیان کیا گیا ہے۔اس موضوع پر اور بہت سے شاعروں نے مثنویاں لکھی ہیں جس میں میر ضمیرؔ جو مرزا دبیرؔ کے استاد تھے ان کی مثنوی ''معراج نامہ'' بہت مشہور و معروف ہے۔مرزا دبیرؔ نے اپنی مثنوی ''معراج نامہ'' میں اس عہد کے شعری مذاق کے مطابق حمد و نعت اور منقبت کے مضامین نظم کیے گئے ہیں۔دبیرؔ کے ''معراج نامہ'' میں حمد کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے۔

زہے صنعتِ ربِّ لوح و قلم — کیے بے ورق جس نے چہرے رقم
طلسماتِ قدرت ہویدا کیے — کہا کن تو کونین پیدا کیے
جو ماں باپ سے مہربان ہے سوا — خدا ہی خدا ہے خدا ہی خدا
زمین و فلک بحر و بر خشک و تر — اسی کی تجلّی سے سب جلوہ گر
ولادت سے پہلے خدائے قدیر — پئے طفل مخلوق کرتا ہے شیر
نہیں دین و دنیا میں اپنا کوئی — وہی ہے وہی ہے وہی ہے وہی
اسی جا نمازِ فلک پر مدام — کیا سجدہ خورشید نے صبح و شام

چلے اس پہ برق و ہوا کس قدر نہ جلنے کا ڈر اور نہ گرنے کا ڈر

حمد کے ان اشعار میں دبیرؔ نے آسمان، ستاروں اور احرام فلکی کا ذکر جو کیا ہے وہ دراصل حضورؐ کی معراج پر جانے کی تمہید کے طور پر کیا ہے اور اسی تمہید میں انہوں نے فنی جانکدستی سے کام لے کر ایک سازگار فضا تیار کی ہے جو دبیرؔ کے فنی شعور اور قادرالکلامی کی مظہر ہے۔

اس مثنوی میں دبیرؔ نے حضورؐ کی معراج اور معراج سے متعلق واقعات کو بڑی فنکاری اور تسلسل کے ساتھ نظم کیا ہے اور واقعہ نگاری کے سارے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ شبِ معراج کی عظمت کو واضح کرتے ہوئے دبیرؔ کہتے ہیں

یہ شب ہے عجب شب زہے قدر و جاہ محمدؐ چلے سوائے عرشِ الٰہ
یہ شب وہ کہ جس پر تصدّق ہے بدر شبِ قدر سے ہے سوا اس کی قدر
فلک سے کہو کیوں ہے سرکشتہ تو کہ حاصل ہے ہر شب کو ہر آرزو
صبا صاف جنّت کو گلشن کریں قمر ماہتابی کو روشن کریں

ان اشعار سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا دبیرؔ نے اس مثنوی میں مثنوی نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی فنی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ تمہید کے بعد آہستہ آہستہ معراج کی منزل کی طرف دبیرؔ اس طرح بڑھتے ہیں کہ قاری خود آگے کی منزل کا اندازہ لگالیتا ہے یہ مثنوی بھی علامہ شبلی نے جو پیمانہ مقرر کیا ہے اس پر پوری اترتی ہے کیونکہ حسن ترتیب، واقعہ نگاری اور بیچ بیچ میں آنے والے ضمنی واقعات کو کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ان کی قادرالکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

حکیمانِ بے عقل سلطاں خصال جو کرتے ہیں معراج میں قیل و قال
بلا لا ذرا ان کو میرے حضور بجھادوں میں ان کا چراغِ شعور
پڑھوں وہ احادیث میں متّصل فلاطون و بقراط ہوئیں خجل

اس مثنوی میں دبیرؔ نے اپنے جس فنی شعور کو پیش کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان حسین کے اس مثنوی پر جو تبصرہ کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان حسین کا اس مثنوی پر جو تبصرہ ہے اس کو مسترد کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''یہ مثنوی مرزا صاحب کی شان اور رتبے سے گری ہوئی ہے۔'' (مثنویات دبستانِ لکھنؤ۔ سیّد سلیمان حسین صفحہ ۱۶۸)

مرزا دبیرؔ کی تیسری مثنوی ''اسنادِ سورۂ الحمد'' ہے جو فضائلِ چہاردہ معصومین علیہم السلام کے عنوان سے شہرت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کو ادبی دنیا میں سب سے پہلے ڈاکٹر کاظم علی خاں نے متعارف کرایا۔ اس مثنوی کے سلسلے میں کاظم علی خاں لکھتے ہیں ''راقم کو کافی تلاش کے بعد مرزا دبیرؔ کی ایک ایسی مثنوی دستیاب ہوئی ہے تحقیق مقالوں پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حیاتِ دبیرؔ جلد اوّل بھی دبیرؔ کی اس تیسری مثنوی کے ذکر سے خالی ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتاب بھی خاموش نظر آتی ہے۔ ڈی۔ فل۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے مندرجہ بالا تمام تحقیقی مقالے احسن القصص اور معراج نامہ کے علاوہ دبیرؔ کی کسی تیسری مثنوی کا ذکر نہیں کرتے۔ ۱۹۷۵ سے

۱۹۷۷ء تک مختلف پاکستانی اور ہندوستانی رسائل کے جو دبیرؔ نمبر منظر عام پر آئے ہیں۔ ان میں تلاش کے باوجود راقم کو دبیرؔ کی بحث تیسری مثنوی پر گفتگو نہیں ملتی۔ ان میں پیامِ عمل لاہور، ماہِ نو راولپنڈی، سرفراز لکھنؤ اور کتاب نما دہلی کے دبیرؔ نمبر شامل ہیں دبیرؔ کی یہ تیسری مثنوی دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں شائع ہو چکی ہے۔ تحقیقی مقالوں میں دبیرؔ کی اس مطبوعہ مثنوی کا ذکر نہ ہونا بتاتا ہے کہ ہمارے محققین نے دفترِ ماتم کی بیسویں جلد کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے اس لیے تحقیقی مقالوں میں دبیرؔ کی جن دو عدد مثنوی کا ذکر کیا گیا ہے اس میں نہ صرف اضافہ بلکہ ترمیم و تصحیح کی بھی گنجائش محسوس ہے۔ (تلاشِ دبیرؔ، کاظم علی خاں صفحہ ۱۲۰۔۱۱۹)

مرزا دبیرؔ کی تیسری مثنوی اسنادِ سورۂ الحمد میں حمد، نعت، منقبت اور مناجات جیسے موضوعات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں مرزا دبیرؔ نے ہر مصرعے میں اپنی شاعری کا کمال پیش کیا ہے۔ اور جن موضوعات کو بھی بیان کیا گیا ہے اس کا پورا حق ادا کیا ہے مثلاً دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

ولا حمدِ معبود معراج ہے — کہ الحمد قرآن کا تاج ہے
کہاں منھ کہ جو شکر کا دم بھریں — قوی کی ثنا ناتواں کیا کریں

دبیرؔ کی اس مختصر مثنوی کا موضوع بھی مذہبی ہے اس میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کے فضائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مختصر مثنوی حیاتِ دبیرؔ کے ایک ایسے واقعے پر روشنی ڈالتی ہے جس کے سلسلے میں اکثر ناقدین خاموش نظر آتے ہیں۔ اس میں دبیرؔ نے اپنے ایک بیٹے کی علالت سے شفایابی کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہ سورہ ہر اک درد کی ہے دوا — مریضوں کی خاطر ہے بے شک شفا
کیا تجربہ میں نے الحمد کا — محل شکر کا ہے مکاں حمد کا
اثر اس کا حق نے ہویدا کیا — کہ فرزند کو چربے اچھا کیا
شفا بخشِ عالم ہے نام علیؑ — کہ قرآں میں داخل ہے الحمد بھی
میں سو جان سے صدقے اس نام کے — بنے کام ہر ایک ناکام کے
یہ ثمرہ مری التجا کا دیا — مرے پھول کو پھل شفا کا دیا

مذکورہ بالا اشعار میں مرزا دبیرؔ نے اپنے بیٹے کی بیماری سے شفایابی کا ذکر کیا ہے۔ مرزا دبیرؔ کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے مرزا محمد جعفر اوجؔ تھے اور چھوٹے بیٹے مرزا آباد حسین عطاردؔ تھے۔ مثنوی کے سنِ تالیف کو مدنظر رکھا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں دبیرؔ نے اپنے بڑے مرزا محمد جعفر اوجؔ کی صحتِ کمال اور طویل عمر کی دعا کی ہے۔

اس مثنوی میں سورۂ الحمد کے فضائل اور اثرات کو بیان کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ رسول اکرمؐ اور آئمۂ معصومین علیہم السلام کے فضائل کو رقم کیا ہے۔ منقبت کے اشعار میں حضرت علیؑ کے نام حروف اور پھر ان کے اعداد سے نئے مضامین پیدا کیے ہیں۔ اور ہر مضمون ایک دوسرے مضمون سے بلند تر ہے۔ اس مثنوی کی اہم خصوصیت اس کی زبان ہے مثنوی کے بعض اشعار سلیس اور عام فہم اردو میں ہیں تو بعض میں

فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال کیا گیا ہے لیکن وہ فارسی الفاظ وتراکیب بھی کچھ اتنے آسان ہیں کہ وہ اردو میں بھی مروج ہیں۔ اس مثنوی میں مسلسل کوئی واقعہ یا قصہ نظم نہیں کیا گیا ہے بلکہ پروردگار کی محبوب ہستیوں کے فضائل وکمالات کو پیش کیا گیا ہے اس لیے اس مثنوی کے مضامین اپنے آپ میں بڑی عظمت کے حامل ہیں مثنوی کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

محمدؐ سے لے کر محمدؐ تلک — سب اک نورِ حق ہیں نہیں اس میں شک
جنابِ حسنؑ اور جنابِ حسینؑ — گلِ قدرتِ صانعِ مشرقین
امامِ زمن قبلۂ خاص و عام — زمانے میں جن کا ہے سجادؑ نام
شہِ برجِ دیں باقرِؑ خوش خصال — پناہِ امم عاشقِ ذوالجلال
امامِ ششم صادقِؑ پاک ذات — شہِ دو جہاں مالکِ شش جہات
مروّج ہوئے جن سے احکامِ دیں — وہ کاظمؑ ہیں ہفتم امامِ مبیں
جنابِ رضاؑ قبلۂ ملکِ طوس — انیس النفوس اور شمس الشموس
تقیؑ تاج دارِ زمین و زماں — نقیؑ حافظِ جان ہر انس و جاں
وصیِ نقیؑ ہے حسن عسکریؑ — سلیماں حشم شاہِ جنّ و پری
وزیر ان کے مہدی علیہ السلام — عریضہ جن کو دیتے ہیں خاص و عام
یہی سب کے مشکل میں کام آتے ہیں — انہیں کے زبانوں پہ نام آتے ہیں

مذکورہ بالا اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا دبیرؔ نے بہت ہی اختصار کے ساتھ ہر امامؑ کی خصوصیات کو پورے فنی محاسن کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

اس مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں ''یہ مثنوی حقیقت میں مختصر سا اشعار کا مجموعہ ہے جس میں حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور مناجاتی موضوعات جمع کیے گئے ہیں اس مثنوی میں بھی تقریباً ہر شعر ہر مصرعے سے دبیرؔ کی صناعی اور مضامین کی کثرت نظر آتی ہے۔ جنھیں مصرعوں کے کوزوں میں بند کر کے ان میں تلاطم بھی پیدا کیا ہے۔ (مثنویات دبیرؔ۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی)

دبیرؔ کی مثنوی ''شہادت امیر المومنینؑ'' ہے جو دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں موجود ہے۔ یہ مثنوی بہت ہی مختصر ہے اس میں کل چودہ اشعار ہیں یہ مثنوی بہت ہی سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی میں دبیرؔ نے ادبی صناعی سے گریز کیا ہے اس میں مکی عناصر زیادہ ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ بھی ایک مذہبی مثنوی ہے۔ اس میں حضرت علیؑ کی شہادت سے متعلق مضامین کو پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد اور ان کی اولادوں کا غم اور ان کے چاہنے والوں کا رنج والم کو شعری پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یارو نہیں ہے مرتبہ پڑھنے کی احتیاج — دنیا میں انتقالِ امیرِ عرب ہے آج
مرقد میں آج احمدِؐ مختار روتے ہیں — تم سے جدا حیدرؑ کرّار ہوتے ہیں
آقا تمہارا صبح کو دنیا سے جائے گا — رو لو کہ بعد سال کے پھر دن اب آئے گا
رو کر کہو کہ حیدرؑ کرّار الوداع — اے جانشینِ احمدؐ مختار الوداع
ان کے وصی کے غم میں جو گریاں ہوئے گا — اس کا نبیؐ کی روح پہ احسان ہوئے گا
بہر خدا یہ دل میں کرو آج تم خیال — کوفے میں آج ہوئے گا کیسا غم و ملال
ہر اک طرف کو ہوئے گی آہ و فغاں کی دھوم — اہلِ حرم کا گردِ یداللہ ہے ہجوم
کھولے ہوئے ہیں زینبؑ و کلثومؑ سر کے بال — سب سے وداع ہوتا ہے وہ شیرِ ذوالجلال

مذکورہ اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مثنوی میں مرزا دبیرؔ نے کوئی شعری کمال پیش نہیں کیا ہے بلکہ شہادتِ امیرالمومنینؑ پر اپنے دلی جذبات واحساسات کو سادہ اور سلیس زبان کے ذریعہ شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں ہی مرزا دبیرؔ کی ایک مثنوی ''عزائے حیدرؑ کرار پہ غرۂ ماہِ شوال کہ روزِ عید ست'' کے عنوان سے شامل ہے اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ بھی مذہبی مثنوی کے زمرے میں آتی ہے۔ اس مثنوی میں مرزا دبیرؔ نے واقعہ نگاری اور منظر نگاری بھی پورے شاعرانہ انداز میں کی ہے۔ اس مثنوی میں بھی بینیہ عناصر زیادہ ہیں۔ پوری مثنوی روزمرہ بولی جانے والی زبان میں لکھی گئی ہے اسی لیے مثنوی کی زبان صاف اور سادہ ہے ایک عام قاری بھی اس کی زبان سے بھرپور استفادہ کرسکتا ہے اس مثنوی کی ابتدا عید کے منظر اور حضرت علیؑ کی بیوہ جناب ام البنینؑ کے بین سے اس انداز میں ہوتی ہے۔

عید کا دن ہے زمانہ شاد ہے — ہر طرف شورِ مبارک باد ہے
رختِ تحفہ پہنے ہیں خورد و کلاں — ہم بغل ہوتے ہیں سب پیر و جواں
عید کی تیاریاں ہیں جا بجا — پر نبیؐ کے گھر میں ہے ماتم بپا
حیدریؑ ہر اک طرف غش ہوتے ہیں — سب گلے مل کر علیؑ کو روتے ہیں
ہے یہ دسواں دن کہ چھوٹا ہے پدر — فاطمہؑ کی بیٹیاں ہیں ننگے سر
مادرِ عباسؑ کی ہے یہ ندا — ہائے اے والی مرے مشکل کُشا
یاد آتا ہے تمہارا عزّ و جاہ — آپ کی مسند ہے خالی گھر تباہ
کان میں ہر وقت ہے شور و بکا — نعرۂ دلدل نہ قنبرؑ کی صدا
نام بیوہ اب ہمارا ہوگیا — آج دسواں بھی تمہارا ہوگیا

ننھے بچے مرتضیٰؑ کے روتے ہیں بے کسی سے کہہ کے یہ غش ہوتے ہیں
نائبِ خیرؐ البشر مارے گئے کس سے عیدی لیں پدر مارے گئے

اس مثنوی میں کل ۱۱۶ اشعار ہیں۔اور ہر شعر میں بھرپور مبکی عناصر پائے جاتے ہیں۔مرزا دبیرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیت ادق الفاظ نادر تشبیہات واستعارات اور عربی وفارسی کے الفاظ کا استعمال اور نئی نئی ترکیبات کا لانا ہے لیکن یہ مثنوی ان تمام خصوصیات سے عاری ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مرزا دبیرؔ نے اپنی شاعرانہ قدرت کے اظہار کے لیے یہ اشعار نہیں کہے ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی محبوب ہستی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہ اشعار کہے ہیں۔اس لیے دبیرؔ نے اس میں اپنی شاعرانہ خصوصیات کو پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔

دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں ہی مرزا دبیرؔ کی ایک مثنوی ''تواریخ ولادت ووفاتِ حضرتِ چہاردہ معصومینؑ'' کے عنوان سے موجود ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ بھی ایک مذہبی مثنوی ہے اس مثنوی میں کل ۲۸ اشعار ہیں۔اس مثنوی میں مرزا دبیرؔ نے چودہ معصومین کی تاریخِ ولادت، تیرہ معصومین کی تاریخِ شہادت اور کچھ معصومینؑ کا سببِ شہادت اور قاتلوں کے نام کو پیش کیا گیا ہے۔اس مثنوی میں دبیرؔ نے حسن ترتیب کا بھرپور خیال رکھا ہے اور اشعار کی ترتیب معصومینؑ کی ترتیب کے اعتبار سے رکھی ہے۔اس مثنوی کے سلسلے میں تقی عابدی لکھتے ہیں ''مثنوی میں فارسی الفاظِ بندشیں اور اضافات کے ساتھ ساتھ زبان برتنے کے رواں دواں اثرات، دبیرؔ کی لفظوں پر گرفت اور تسلط کا عمدہ نمونہ ہیں۔مثنوی پڑھتے ہوئے ایسا احساس ہوتا ہے کہ دستِ داؤدی سے لفظوں کے آہن اور سختی کو نرم کر کے انہیں ہم آہنگ اور بزم کر دیا گیا ہے۔یعنی لفظوں کی شاخِ آہن کو لوہے کی زنجیریں تبدیل کر کے جیسی چاہیے شکل دی گئی ہے۔(مثنویاتِ دبیرؔ۔ڈاکٹر سید تقی عابدی) نمونہ کے طور پر مثنوی کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جمعہ تھا ہفدہم ماہ ربیع الاولا صبحِ صادق کی طرح سے ہوئے صادق پیدا
آہ تھی پانزدہم ماہِ رجب ہیہات کہ زمانے سے ہوتی جعفرؑ صادق کی وفات
ہفتم ماہِ صفر کو ہوئی دنیا روشن حضرت موسیٰ کاظمؑ ہوئے پرتو افگن
زہر ہارون نے خرموں میں دیا واویلا بست و پنجم کو رجب کی ہوئے آخر مولا
ہشتم ماہِ خوش انجام ربیع الاول یہی تاریخ شہادت میں ہے قولِ فیصل
سوم ماہ رجب کو ہوا برپا ماتم قصر فردوس میں داخل ہوئے شاہِ امم
چوتھی تاریخ تھی اور ماہ ربیع الثانی کہ ہوا خلق زمانے میں حسنؑ کا ثانی
کون وہ مہدیؑ دیں مہرِ عرب ماہِ عجم سببِ رونقِ آفاق ہوا جس کا قدم

مرزا دبیرؔ نے چہاردہ معصومین علیہم السلام کی ولادت وشہادت کی تاریخوں کو شعری پیرائے میں پیش کیا۔اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی

ہوسکتا ہے جن چیزوں کو نثر میں یاد کرنا مشکل ہوتا ہے ان کو اگر نظم میں پیش کر دیا جائے تو ان کو آسانی سے یاد کیا جا سکتا ہے لہٰذا دبیرؔ نے آئمہ معصومینؑ کی تاریخِ ولادت وشہادت کو لوگوں کو بہ آسانی یاد کرانے کے بھی یہ مثنوی لکھی ہے۔

دفترِ ماتم کی بیسویں جلد میں دبیرؔ کی ایک مثنوی ''واقعۂ شہادتِ حضرت علی اکبرؑ'' موجود ہے جس کو ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دریافت کیا ہے۔ طوالت کے اعتبار سے یہ دبیرؔ کی چوتھی طویل مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں کل ۱۶۱ اشعار ہیں موضوع کے اعتبار سے یہ بھی ایک مذہبی مثنوی ہے جس کی ابتدا میں سات اشعار فارسی زبان میں ہیں۔ یہ مثنوی واقعۂ کربلا کے اہم کردار امام حسینؑ کے بیٹے شبیہ پیغمبرؐ جناب علی اکبرؑ کے حال پر کہی گئی ہے اس مثنوی میں مرزا دبیرؔ حضرت علی اکبرؑ کا سراپا پیش کیا ہے اس میں نادر تشبیہات واستعارات کی بہتات ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مصوّرانِ شبیہ شکوہ و جاہ و جلال — محرّرانِ حدیثِ عزا و رنج و ملال
شبیہ کھینچتے ہیں ہم شبیہ احمدؐ کی — وفات لکھتے ہیں ہم صورتِ محمدؐ کی

حضرت علی اکبرؑ کے سراپا سے متعلق یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

پکارتے ہوئے یہ پیک برملا آئے — با ہوش باش کہ محبوبِؐ کبریا آئے
کہا کسی نے کہ لاریب یہ پیمبرؐ ہے — کوئی پکارا کہ یہ دبدبے میں حیدرؑ ہے
کہا کسی نے کہ نورِ خدا مجسم ہے — یہ افتخارِ سلیمانؑ و نوحؑ و آدمؑ ہے
یہ وصف کرتے تھے اکبرؑ کا سب صغیر و کبیر — حیا سے سر بہ گریباں تھی میان میں شمشیر

حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد جنابِ زینبؑ جنہوں نے علی اکبرؑ کو اٹھارہ سال پالا تھا ان کے جذبات واحساسات کیا ہیں ملاحظہ کیجیے۔

مجھے امید تھی جس دم مروں گی اے پیارے — وصی تمہیں کو میں اپنا کروں گی اے پیارے
سرہانے بیٹھ کے میرے پڑھو گے تم یٰسین — پھوپھی کے شانے ہلاؤ گے تم دمِ تلقیں
پر آہ آج کے دن کی نہ تھی خبر مجھ کو — کہ اپنے غم میں پھراؤ گے ننگے سر مجھ کو
میں کہتی تھی مجھے تم قبر میں اتارو گے — نہ یہ خبر تھی کہ پہلے تمہیں سدھارو گے

اس مثنوی کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی لکھتے ہیں ''اس مثنوی میں دبیرؔ نے کھل کر قادرالکلامی دکھائی ہے۔ منظر کشی ہو یا سراپا حضرت علی اکبرؑ شوکتِ الفاظ طمطراق سے لبریز ہے لیکن میں ان کے اشعار میں پھر وہی سادگی اور سلاست نظر آتی ہے۔ سراپا حضرت علی اکبرؑ میں استعارات، تشبیہات اور نادر مضامین کی فراوانی ہے ایسی مختصر اور جامع مثنوی جو مضامین کے نادرات سے لبریز ہو اردو ادب میں خال خال ہے۔ (مثنویات دبیر۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی)

مرزا دبیرؔ کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی ہے جس کا کوئی عنوان نہیں ہے اس کو سب سے پہلے دریافت کرنے کا سہرا پروفیسر محمد زمان آزردہ کے سر

ہے مرزا دبیرؔ کی یہ مثنوی ایک تاریخی مثنوی ہے جس میں دہلی کے تاریخی حالات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

وہ ٹیڑھی کلاہ اور ترچھی نگہ — یہ چاہا کہ سیدھا کروں اب چغہ
نظر کی سوئے افسرانِ سپاہ — کہ دیکھوں انہیں کیا ہے حدِّ نگہ
نگہ افسروں نے بھی کی تند و تیز — سروہی چلے جیسے وقتِ ستیز
نگہ لوں سبوں کی تھی گویا زباں — کیا عین مطلب یہ فر فر بیان
کہ سیدھا کرے گا جفہ کو اگر — تو پھر یہ جفہ ہے نہ تو ہے نہ سر
یہاں ہم ہیں جتنے صغار و کبار — ہیں اولاد شاہِ صفی پر نثار

اس مثنوی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے پروفیسر محمد زمان آزردہ لکھتے ہیں۔

''یہ ایک عجیب وغریب مثنوی ہے اگر چہ اس سے یہ ظاہر ہے کہ مرزا دبیرؔ نے اسے اپنی شاعری کے ابتدائی ایام میں نظم کیا ہوگا مگر اس سے جس تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا دبیرؔ کو نہ صرف اسلامی تاریخ اور اس کے واقعات سے دلچسپی تھی بلکہ عام سیاسی تاریخ سے بھی انہیں دلچسپی تھی، چنانچہ اس مثنوی میں دہلی کے تاریخی حالات ملتے ہیں۔ شیر شاہ کا غلبہ، ہمایوں کی جلاوطنی اس کا شاہ ایران سے مدد طلب کرنا، نادر شاہ کا دہلی آنا، عہدِ محمد شاہ کے حالات، شہنشاہِ دہلی اور شہنشاہ ایران میں خط و کتابت وغیرہ کے حالات معلوم ہوتے ہیں، راقم یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو تاریخی حالات اور واقعات اس میں نظم ہوئے ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں البتہ مرزا دبیرؔ کی تاریخ سے دلچسپی کا اس سے ضرور پتہ چلتا ہے قرین قیاس ہے کہ یہ کسی نثری قصہ کو نظم کی صورت دی گئی ہے یا کسی منظوم مثنوی کا ترجمہ ہے۔ اغلب ہے کہ یہ ماخذ کوئی فارسی کی کتاب رہی ہوگی۔'' (مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے، محمد زمان آزردہ۔ صفحہ ۲۰۵) اس مثنوی میں نادر شاہ کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ زبان و بیان میں سلاست اور شگفتگی بھی موجود ہے۔ نمونہ کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

پڑھا نامہ نادر نے جو ایک بار — بڑھا اور اس خط سے دل کا غبار
نگاہِ غضب سطروں میں گڑ گئی — جبین پر شکن قہر کی پڑ گئی
سوئے ہند فی الفور راہی ہوا — نزولِ عتابِ الٰہی ہوا

مثنوی میں سلطنت کا نقشہ پورے تاریخی مناظر میں کھینچا گیا ہے محمد شاہ رنگیلا کے بارے میں تاریخ میں ملتا ہے کہ وہ ہمیشہ لہو ولعب میں پڑا رہتا تھا حکومت کی طرف اس کی توجہ کم تھی اس لیے اس کے جان نثار بے دست و پا ہو رہے تھے اور جب نادر شاہ کا حملہ ہوا تو دلی میں ایسا حشر برپا ہوا جو آج بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ مقالاً کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

لکّھا یہ ہے تشویش بے حد ہوئی — خبردار نادر کی آمد ہوئی
سمجھ کر کچھ ارشاد فرمایئے — کمک کے لیے فوج بھجوایئے

لڑوں گا میں حضرت کے اقبال سے بھگاؤں گا اس کو برے حال سے
نہ تھا عیش سے بادشاہ کو فراغ جوابِ عرائض کا کس کو دماغ
عجب حشر دلّی میں برپا ہوا شہِ ہند چونکا ارے کیا ہوا

مثنوی کے اختتام کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

ہوئے شاہزادوں سے وہ ہمکنار کیا اس نے والد کی طرح سے پیار
کرم سے دیا ہاتھ میں اس کے ہاتھ چلا چاہ سے بحر قطرے کے ساتھ
درِ خیمہ پر جلد حاضر ہوا بغل گیر شرما کے نادر ہوا
دو چنداں ہوئی چشم کی آب و تاب کہ اک برج میں آئے دو آفتاب

ان اشعار کے مطالعے سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا دبیرؔ کا اول شعور کے ساتھ ساتھ تاریخی شعور بھی پوری طرح سے پختہ تھا۔ اور واقعات کو انہوں نے جس تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے وہ حسنِ ترتیب کا بہترین نمونہ ہے مرزا دبیرؔ نے واقعات وجذبات کی مصوری کی مدد سے بعض کرداروں کو بہت دلچسپ اور جاندار بنا دیا ہے۔

مرزا دبیرؔ نے اپنی مثنویوں میں اختصار وایجاز کا فن جس حسنِ خوبی سے برتا ہے اردو شاعری میں اس کی مثال کم نظر آتی ہے۔ ایجاز واختصار کے لیے استعارات، کنایات، تلمیحات اور بعض صنائع کا استعمال ناگزیر ہے۔ ان کے بغیر کلام کو طبع اور مختصر بنانا مشکل امر ہے۔ ان تمام چیزوں کو کلام میں خوبصورتی کے ساتھ برتنے کا سلیقہ سب میں نہیں ہوتا لیکن مرزا دبیرؔ میں جو کچھ تشبیہات واستعارات، کنایات وتمثیلات اور صنائع وبدائع کے استعمال کا خاص سلیقہ تھا اس لیے ان کی مثنویاں ایجاز واختصار کی حاصل ہوتے ہوئے بھی حسن واثر سے عاری نہیں ہیں۔

مرزا دبیرؔ نے تشبیہات واستعارات کی جادوگری سے مصورانہ شاعری کا کمال دکھایا ہے۔ مرزا دبیرؔ تشبیہات واستعارات سے وہی کام لیتے ہیں جو ایک مصور مختلف رنگوں سے لیتا ہے اور ایک ماہر مصور کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے خطوط منتخب کرے اور ان کو اس طرح ترتیب دے کہ تصویر اصل کا ایک تخیلی پیکر بن جائے اسی طرح ایک ماہر شاعر کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ الفاظ، تشبیہات واستعارات اور ان کے مجموعی آہنگ ایسے اختیار کرے کہ بیان کی ہوئی چیز اصل چیز سے کہیں زیادہ دلکش ہو لیکن مرزا دبیرؔ نے جو مثنویاں کہی ہیں وہ مذہبی موضوعات سے متعلق ہیں اس لیے انہوں نے اس طرح کی صناعی نہیں دکھائی ہے پھر بھی مرزا دبیر کو یہ فن قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ اسی لیے ان کی تشبیہات واستعارات میں بے ساختگی اور سادگی کے باوجود قدرت دکھائی دیتی ہے۔

مجموعی اعتبار سے مرزا دبیرؔ کی مثنوی نگاری کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مرثیہ نگاری کے میدان میں جو منزلِ کمال حاصل کیا تھا وہ منزلِ کمال مثنوی نگاری میں ان کو حاصل نہ ہوسکا لیکن ان کی مثنویاں بھی مثنوی نگاری کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اور دبستانِ لکھنؤ کی مثنوی نگاری کے فروغ میں مرزا دبیرؔ کی مثنویوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں مثنوی نگاری کے فروغ کی کوئی بحث بھی مرزا دبیرؔ کی مثنویوں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

❁❁❁❁

صنف نوحہ نگاری اور مرزا دبیرؔ کے نوحے

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی ہلوری

مرثیہ اور نوحہ دو الگ اصناف ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرثیہ کو بطور صنفِ سخن، ادب میں ایک بلند مقام حاصل ہے جبکہ نوحہ کو ابھی تک، بطور علیحدہ صنف سخن کا درجہ نہیں ملا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقریباً اردو کے ہر بڑے شاعر نے نوحے تخلیق کیے ہیں بالخصوص واقعات کربلا سے متعلق بے شمار نوحے لکھے گئے ہیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ محققین و ناقدین کی نظریں یا تو ان پر پڑی نہیں یا انہیں ان میں وہ فنی محاسن نظر نہیں آئے کہ ان پر سیر حاصل بحث کی جائے۔

اردو زبان میں شائع ہونے والے بیشتر مذہبی اور ادبی رسائل میں اردو کی دیگر اصناف سخن سے متعلق کثرت سے مضامین لکھے جا رہے ہیں کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں لیکن رثائی ادب میں صنف نوحہ سے متعلق بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جریدۂ ''اشارہ'' نے ضرور پہل کی اور نوحہ سے متعلق ناقدین کو متوجہ کیا لیکن اس جریدہ کے بعد پھر خامشی۔ نوحہ کثرت سے لکھے جاتے ہیں اور پڑھے بھی جاتے ہیں لیکن صنف نوحہ نگاری کو کیوں فراموش کیا گیا اس پر سر حاصل بحث کیوں نہیں کی گئی۔ پروفیسر نیر مسعود رضوی لکھتے ہیں کہ ''نوحہ رثائی ادب کی ایک اہم صنف ہے لیکن اب تک اس صنف پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔'' اسی طرح پروفیسر ولی الحق انصاری لکھتے ہیں کہ ''ہر اندوہناک حادثہ پر اظہار غم ایک فطری جذبہ ہوتا ہے جس کے اظہار کے مختلف طریقے ہوتے ہیں واقعہ کربلا کے سلسلے میں بھی تمام زبانوں میں ایسا ہی حزنیہ ادب ظہور میں آیا۔ مراثی کے علاوہ اس قسم کی ایک دوسری صنف ادب نوحہ کی شکل میں وجود میں آئی۔ مرثیوں کے برخلاف نوحہ عموماً صرف جذبات دلی کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اس حیثیت سے وہ زیادہ پُرتاثیر ہوتے ہیں۔'' ہلال نقوی بڑی بے باکی سے کہتے ہیں:

''اردو اصناف سخن میں غزل پر اردو تنقید نے اپنی توجہات اتنی مرکوز رکھیں کہ دوسری شعری اصناف خصوصاً وہ اصناف جو مذہبیات کے محور پر سفر کر رہی تھیں وہ ادبیات کے تنقیدی مباحث میں نظر انداز ہوتی چلی گئیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تعصّبات اور ادبی بددیانتی کے سبب رثائی اصناف کی طرف سے اکثر تنقید نگار نے منھ پھیر لیا۔'' موصوف آگے لکھتے ہیں کہ: ''مرثیے اور قصیدے کا معاملہ تو یہ ہے کہ مضامین کی وسعت اور خیال کی نیرنگیاں فکر و خیال کے نئے دریچے کھولتی رہتی ہیں لیکن نوحہ تو نوحہ ہی ہے، بین و بکا اور نالہ و فریاد میں لپٹا ہوا وہی نوحے کا تعارف ہے، نوحہ رزمیہ، بزمیہ گزرگاہوں سے ذرا فاصلے پر ایک کومل، نازک اور خاموش درد کی داستان رقم کرتا ہے۔ اس پر لکھنے کے لیے کلیجہ چاہیے۔'' پروفیسر انیس اشفاق نوحے سے متعلق لکھتے ہیں کہ: ''اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایک مستقل صنف کے طور پر مستحکم ہو جانے کے باوجود نوحہ کو مرثیہ اور سلام کی سی ادبی حیثیت کیوں حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بین و بکا کے موضوع سے مخصوص ہو جانے کی بنا پر نوحے میں نکتہ آفرینوں اور شاعرانہ موشگافیوں کی گنجائش نہیں تھی اس کے برعکس مرثیہ اور سلام میں شاعر کو بہت ہی آزادیاں حاصل

ہیں۔۔۔۔لیکن ایسا بھی نہیں کہ نوحے کی صنف میں شاعرانہ کمالات کا مظاہرہ نہیں کیا جاسکتا۔ضرور کیا جاسکتا ہے شرط ہے کہ شاعر اس مظاہرے کی صلاحیت رکھتا ہو۔لفظوں کے ذریعہ ایسے حزنیہ مرقع تیار کرنا جنہیں سن کے سامع خود حزن کا مرقع بن جائے آسان نہیں ہے۔ ایسا وہی شاعر کرسکتا ہے جو لفظوں کی اس نوع کی تاثیر سے پوری طرح واقف ہو۔۔۔۔۔رثائی ادب میں ایسے نوحے جابجا نظر آتے ہیں جنہیں پڑھنے اور سننے کو بار بار جی چاہتا ہے۔ایسے تمام نوحوں میں بین بین وہ خوبیاں موجود ہیں جو بینیہ شاعری کو ادبی حسن عطا کرتی ہے۔ اس لیے نوحے کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ بین و بکا سے مخصوص ہے۔نوحے ہر دور میں تخلیق کیے گئے اور عصر حاضر کے شعراء بے شمار نوحے تخلیق کر رہے ہیں۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اس کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے اسکالر نوحہ سے متعلق تحقیق میں جُٹ گئے ہیں۔

نوحہ کی ابتدا سے متعلق طرح طرح کی تاویلیں پیش کی جاتی ہیں بعض حضرات کا ماننا ہے کہ نوحہ کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوا۔انہوں نے اتنا گریہ اور نوحہ کیا کہ ان کا نام ہی نوح پڑ گیا۔بعض حضرات اس کا آغاز ''دعائے ناحیہ'' سے منسوب کرتے ہیں۔نوحہ کے لغوی معنی ہیں گریہ وزاری کرنا، کسی کی موت پر آنسو بہانا اور مرنے والے کو یاد کر کے رونا وغیرہ۔صنف سخن نوحہ جس میں شاعر، آلؑ رسولؐ کی زبان سے، امامؑ یا ان کے کسی عزیز کی موت پر ماتم کرتا ہے۔نوحہ میں خود آلِ رسولؐ کے مختلف افراد کے جذبات نظم کیے جاتے ہیں۔مرثیہ کی طرح نوحہ بھی زیادہ تر واقعاتِ کربلا سے منسوب ہو گیا۔شخصی مرثیے یا شخصی نوحوں کی تعداد بہت کم ہے۔نوحے کی روایت دراصل عرب سے ایران ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی۔ہندوستان میں مرثیہ کی طرح نوحہ کا آغاز بھی دکن سے ہوا۔جو مرثیہ خوانی یا روضہ خوانی کے بعد پڑھا جاتا تھا۔تقریباً دکن کے ہر بڑے شاعر نے واقعات کربلا، امام حسینؑ اور ان کے اہل وعیال اور اصحاب کے مصائب کو اپنے اپنے انداز میں ''نوحہ'' کی شکل میں پیش کیا۔قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، عبداللہ قطب شاہ، افضل، شاہی، کاظم اور مرزا کے نوحہ جلوس عزاداری میں پڑھے جاتے تھے۔دکن میں بحیثیت نوحہ نگار سب سے پہلا نام قلی قطب شاہ کا ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ سلطان نے دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ مرثیے اور نوحے بھی موزوں کیے تھے۔ان کے ایک نوحہ کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

''جگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے تن روں کی لکڑیاں جال کر جاتی ہیں خواری وائے وائے
ساتوں گگن آٹھو جنت، ساتو دریا، ساتو دھرت ایکس تھے ایک آپس میں آپ دکہ کرتے کاری وائے وائے

دکن کا دوسرا نوحہ نگاری شاعر ملا وجہی ہے ان کے ایک نوحہ کا شعر دیکھئے:

حسنؑ کا غم کرو عزیزاں انجو نین سو جھروں عزیزاں
بنا جو اول ہے غم کا عرشِ گگن ہوردھرت ہلایا

اسی دور کا تیسرا نوحہ نگاری غواصی ہے۔ان کے نوحہ کا ایک شعر دیکھئے:

دستانیں کروں کیا ، وہ بیان کربلا کا پھرتا ہوں زارہوں میں حیوانِ کربلا کا

اسی طرح نصرتی بیجاپوری کے نوحہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اے وائے ظالم کیوں دکھا ایسے جگر گوشیاں کیوں تس جگ جگ جوانی پر غضب واجب کہا قہار کا

ہاشم علی برہانپوری کے نوحہ کا یہ شعر:

آج پرخوں کفن ترا اصغرؑ آج سوکھا دہن تیرا اصغرؑ

ادب کے ارتقائی سفر کے ساتھ ہی نوحہ نگاری کی روایت دہلی پہنچی جہاں خدائے سخن میر تقی میر، سوداؔ، غالبؔ، مصحفیؔ، انشاءاور جرأتؔ وغیرہ نے بھی نوحے لکھے۔ میرؔ کے نوحے کا شعر ملاحظہ ہو:

کلثومؑ یوں تھی لاش پہ بھائی کی حرف زن سر کیا ہوا کہ خاک میں پامال ہے بدن

پھر وجہ کیا کہ اب نہیں ملتا تجھے کفن اے بادشاہ، بے سر و سامانِ کربلا

مرزا محمد رفیع سوداؔ کے نوحے کا یہ مختلف آہنگ ملاحظہ ہو:

نہیں ہلالِ فلک پر مہِ محرم کا چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا

جدھر کرے گی خوشی نہ تو یوں کہے گا غم ادھر نہ آئیو ہرگز یہ گھر ہے ماتم کا

ذوقؔ یوں نوحہ کہتے ہیں:

بانوؑ نے کہا پیٹ کے یوں نعشِ پسر پر، ہے ہے علی اکبرؑ تم مرگئے اور جیتی رہی ہائے یہ مادر، ہے ہے علی اکبرؑ

کیا سوتے ہو واری گئی ماں کی خبر ہے، ننگا میرا سر ہے ان ظالموں نے چھین لی سر سے میرے چادر، ہے ہے علی اکبرؑ

مرزا غالبؔ نے فارسی زبان میں بہت سارے نوحے تخلیق کیے ان کے ایک نوحے کا ایک شعر پیش خدمت ہے۔

غالبؔ جگری خون کن واز دیدہِ فردبار گرَروی شناس غمِ شاہؑ شہدائی

جس کا اردو ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔

برساتے رہو خون کے اشک سے غالبؔ روتے ہی رہو ، تم غمِ شاہؑ شہداء پر

اشرف علی خاں فغاںؔ کے نوحوں میں بکائیہ لہجہ کی بازگشت محسوس کی جاسکتی ہے۔ جرأت کے نوحوں میں لکھنؤ اور دہلی کی زبان کا امتزاج نظر آتا ہے۔ متینؔ سہارنپوری، انیسؔ و دبیرؔ کے ہم عصر بھی ہوتے تھے۔ حزنیہ کیفیت ان کے نوحے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مرثیہ نگاری کے فن کے ساتھ ہی ساتھ جب نوحہ نگاری کا فن اودھ کی راجدھانی فیض آباد پہنچا تو وہاں میر حسنؔ، حیدریؔ، گدا فصیحؔ اور دلگیرؔ نے بھی نوحے لکھے۔

پھر اودھ کی راجدھانی فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو یہاں نوحہ نگاری کا فن مرثیہ کے ساتھ ہی ساتھ ترقی کی منزلوں پر گام زن ہوا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے بے شمار نوحے بھی کہے اور پھر یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

میر انیسؔ نے جہاں اردو مرثیے کو بلندی تک پہنچایا وہیں انہوں نے دلخراش نوحے بھی قلمبند کیے۔ جناب علی اکبرؑ کی شہادت سے متعلق ایک نوحہ کے چند اشعار پیش ہیں۔

شبیرؑ نے یہ خیمے کی ڈیوڑھی سے پکارا، مارے گئے اکبرؑ — گھر لٹ گیا اے بانوئے ناشاد تمہارا، مارے گئے اکبرؑ
اٹھارہ برس کی ہوئی دولت مری برباد، فریاد ہے فریاد — تنہا ہوا اب حیدرِؑ کرار کا پیارا، مارے گئے اکبرؑ
اب ذبح کریں گے ہمیں خنجر سے ستم گار، اے بانوئےؑ ناچار — لاشہ بھی اٹھائے گا نہیں کوئی ہمارا ، مارے گئے اکبرؑ
غل ہوتا تھا خیمے میں انیسؔ آہ وبکا کا، ساماں تھا عزا کا — جب کہتا تھا رو کر اسداللہ کا پیارا ، مارے گئے اکبرؑ

آیئے اب مرزا دبیرؔ کے نوحوں کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔ دبیرؔ سے قبل اور دبیرؔ کے ہمعصر شعرا نے شہیدانِ کربلا اور اسیرانِ کربلا کی زبان مبارک سے ایسے فقرے ادا کرتے نظر آتے ہیں جو بہت ہی کرب ناک اور مُبکی ہوتے ہیں لیکن مرزا دبیرؔ کا یہ وصف ہے کہ انہوں نے دردناک اور کربناک فقروں کو مقاتل اور تاریخی شواہد کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ دوسرے نوحہ نگاروں نے جذبات، احساسات اور کیفیات کی ترجمانی تو کرتے ہیں لیکن استدلال سے وابستگی نہیں پیش کر پاتے ہیں۔ اس طرح دبیرؔ کے نوحوں میں جو خوبیاں اور ندرت نظر آتی ہیں وہ ان کے ہمعصر نوحہ نگاروں کے یہاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے نوحوں کی روح گریہ کی کیفیات کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ بقول ڈاکٹر ریحان حسن: ''انہوں نے نوحے کے عناصر ترکیبی کو بروئے کار لا کر مرثیے کے مثل صنفِ نوحہ کو بھی اس منزل کمال تک پہنچایا ہے کہ جب تک شاعر ان کے نوحوں کے غواصی نہیں کر لیتا، ایک اچھا نوحہ گو نہیں بن سکتا۔'' دبیرؔ اگر مرثیہ کے آفتاب ہیں تو بلاشبہ نوحوں کے ماہتاب کہے جانے کے مستحق ہیں۔ یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری ہے کہ جس طرح دبیرؔ کے مرثیوں پر ناقدین کی نظریں، اس طرح نہیں گئیں جس طرح ان کی عظمت اور فنی صلاحیت کا جائزہ ہونا چاہیے ٹھیک اسی طرح ان کے نوحوں پر بھی غور وخوض نہیں کیا گیا۔ دبیرؔ کے نوحوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان میں وہ ساری خوبیاں جلوہ گر ہیں جو نوحے کا وصف قرار پاتا ہے۔ درد، کرب، آہ وبکا، بین اجاگر کرنے کے لیے جس سلاست اور روانی کا ثبوت دیا ہے کہ انہیں پڑھنے اور سننے کے بعد از خود آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کی ایک بیاض ''نوحہ جاتِ دبیرؔ'' شائع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے۔ راقم الحروف کو ان کے نوحوں کا ایک مجموعہ ''دبیرِؔ کربلا'' مرتبہ خبیرؔ رضوی لکھنوی، ناشر کتب خانہ اکبری دروازہ چوک لکھنؤ، مطبوعہ سرفراز قومی پریس دستیاب ہوا۔ ان نوحوں کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مرزا دبیرؔ نے نوحوں میں روانیِ کلام کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ بین بھی بے مثل اسی لیے ان کے نوحے بھی خالص بینیہ ہیں۔ ثانیِ زہراؑ جناب زینبؑ کی زبانی اس نوحے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ دبیرؔ نے جو رنج وغم کی کیفیت بیان کی ہے ذہن فوراً میدانِ کربلا تک پہنچ جاتا ہے۔

کہتی تھی شہؑ کی بہن ، ہائے حسینؑ غریب — بے کفن و بے وطن ہائے حسینؑ غریب
سینے پہ شمرِ لعیں ، حلق پہ شمشیرِ کیں — تجھ پہ رنج و محن ، ہائے حسینؑ غریب
بھائی ترا گھر جلا ، بھائی مرا سر کھلا — بچے ہیں عریاں بدن ، ہائے حسینؑ غریب
کس کی میں ہو کر رہوں ، کون ہے کس سے کہوں — چُھٹ گئے بھائی بہن ، ہائے حسینؑ غریب

یہ نوحہ ۱۸ رشعروں پر مشتمل ہے۔ اس کا مقطع دیکھئے:

آگے کہے کیا دبیرؔ، ہلتا ہے عرش قدیر — کہتی ہے شہؑ کی بہن ، ہائے حسینؑ غریب

جنابِ سیّدہ کی زبانی یہ نوحہ جس میں آغوش کے پالے کا نوحہ کرتی ہوئی ایک ماں کا دلخراش بین:

یہ رن میں کہتی ہیں زہراؑ ، حسینؑ من حسینؑ من — میرے بیکس مرے تنہا ، حسینؑ من حسینؑ من
غریب و بے وطن مرے ، یتیم و بے وطن مرے — شہید وخستہ تن میرے ، حسینؑ من حسینؑ من
یہ ماں رونے کو آئی ہے ، نبیؐ کو ساتھ لائی ہے — دہائی ہے دہائی ہے، حسینؑ من حسینؑ من
چڑھا جلاد سینہ پر ، پڑا حلقوم پر خنجر — ہوا تو ظلم سے بے سر ، حسینؑ من حسینؑ من
قضا پردیس میں آئی ، نہ تم نے قبر بھی پائی — یہ مظلومی ، یہ تنہائی ، حسینؑ من حسینؑ من
دبیرؔ آگے کہوں کیا میں قیامت رن میں تھی برپا — یہی سمجھاتی تھی زہرا ، حسینؑ من حسینؑ من

ماں کے دلخراش بین کو دبیرؔ نے اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا ہے کہ سنگ دل بھی نوحہ سننے یا پڑھنے پر اشک بار ہوجاتا ہے۔ انہوں نے بینیہ اور روانی کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ دبیرؔ کے نوحوں کا یہ خاص وصف ہے کہ انہوں نے ان لوگوں کے حال کا ہی نوحہ تخلیق کیا ہے جن سے اہل حرم کو زیادہ الفت و چاہت تھی۔ چنانچہ امامِ عالی مقام کے فرزند حضرت علی اکبرؑ سے اہل حرم کو امام حسینؑ کے بعد جو الفت وعقیدت تھی دوسرے سے نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ صرف امام حسینؑ کے بیٹے ہی نہیں بلکہ شبیہ رسولؐ بھی تھے۔ اس لحاظ سے وہ سب کے آنکھوں کا تارا تھے۔ مرزا دبیرؔ نے بیٹے کے تئیں ماں کی مامتا کو جس پیرائے میں نظم کیا ہے وہ قاری کو فرط الم میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس نوحے کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

کہا بانوؑ نے میں قربان، میرے نامراد اکبرؑ — جوانی میں ہوئے بے جان، میرے نامراد اکبرؑ
جبیں پُر خون انگوٹھی میں پھل برچھی کا سینے میں — نہ بھولے گی کبھی یہ شان ، میرے نامراد اکبرؑ
بھلے چنگے گئے گھر سے اور آئے مر کے باہر سے — پدر ششدر ہے ، ماں حیران ، میرے نامراد اکبرؑ
جگر پر ہاتھ دھرتے ہو ، تڑپ کر آہ بھرتے ہو — یہاں برچھی ہے یا پیکان ، میرے نامراد اکبرؑ
دبیرؔ اک حشر برپا ، یہی بانوؑ کی زاری تھی — مرے غازی، میرے ذیشان میرے نامراد اکبرؑ

مرزا دبیرؔ نے جس انداز سے ماں کے تاثرات پیش کیے ہیں اس سے قاری خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ماں کی زبانی اس واقعے کے جانکاہ مناظر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

حضرت امام حسینؑ اپنی دختر جناب سکینہؑ کو کس قدر محبت کرتے تھے تاریخ گواہ ہے جناب سکینہ کی زبانی مرزا دبیرؔ نے جو نوحہ نظم کیا ہے وہ آہ و بکا اور غم کے ایسے تاثر پیدا کر دیتا ہے کہ انسان رنج والم میں ڈوب جاتا ہے۔ جناب سکینہؑ کے جذبات واحساسات اور حالتِ زار کو دبیرؔ نے اس نوحے میں اس طرح قلم بند کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ اس نوحے کے چند اشعار۔

کرتی تھی سکینہؑ یہ بیاں لاشۂ شہؑ پر، پیارے مرے بابا — بعد آپ کے کیا کیا نہ ستم ہوگئے مجھ پر، پیارے مرے بابا
تم جیتے جو ہوتے تو طمانچے نہ میں کھاتی اور قید نہ ہوتی — تم ہوتے سلامت تو نہ چھنتے مرے گوہر، پیارے مرے بابا

اس ننھی سی گردن میں رسن باندھی تھی بابا، بے رحموں نے افسوس باندھا تھا مرے ہاتھوں کو بھی شمر نے کس کر، پیارے مرے بابا
اس زور سے دُر کھینچے مرے کان سے بابا، جو کان ہیں زخمی سر ننگے پھرایا مجھے بازاروں میں در در، پیارے مرے بابا
رستے میں اگر دیکھ کے میں روتی تھی بابا، سرنیزے پہ تیرا ہر جا پہ گھرکتا تھا مجھے شمر ستمگر ، پیارے مرے بابا
تم کو تو قضا لے گئی اب کون سلائے، سینہ پہ مجھے آہ اب کون مجھے بیٹی کہے گود میں لے کر، پیارے مرے بابا

۱۴ رشعروں پر مشتمل یہ نوحہ سنتے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے اور بے شمار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح ان کے بہت سے نوحے ہیں جن سب کا تذکرہ کرنا یہاں ممکن نہیں۔ شیریں کی زبانی نوحہ امام حسینؑ:

شیریں نے کہا یہ سر شبیرؑ سے رو کر، ہے ہے مرے آقا افسوس پھر ا آپ کے حلقوم پہ خنجر، ہے ہے مرے آقا

جناب علی اصغرؑ کے حال کے نوحہ جو ۱۹ شعروں پر مشتمل ہے اس کے چند اشعر ملاحظہ ہوں۔

گہوارے میں گھر جاکے جو میّت کو لٹایا ماں بولی کہ اب ضبط کا پارا نہیں اصغرؑ
میت کو بھی چھاتی سے لگائے ہوئے رکھوں پر زندوں میں مردے کا گذارا نہیں اصغرؑ
تھا درد پہ بانوؑ کا دبیرؔ جگر افگار تم مر گئے ، اب کوئی ہمارا نہیں اصغرؑ

ان نوحوں کے علاوہ الوداع عشرہ ماہ محرم، الوداع روز چہلم، الوداع شاہ خراساں اور بہت سارے الوداعی نوحے بھی دبیرؔ نے تخلیق کیے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کے نوحوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بلا خوف وجھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ دبیرؔ کے نوحے صنفِ نوحہ نگاری کے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں ان کے تخلیق کیے گئے نوحے ہی دراصل نوحے کہے جانے کے مستحق بھی ہیں۔ ان کے سارے نوحوں میں سوز والم اور بینیہ اس انداز میں ملتا ہے جو دراصل نوحے کا جز ولاینفک معلوم ہوتے ہیں۔

❁❁❁❁

جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں پر مشتمل

''فرہنگِ جوشؔ'' شائع ہوگئی ہے

(جس میں جوشؔ صاحب کے ۹ مرثیوں سے ۱۲۰۰ سے زائد الفاظ منتخب کیے گئے ہیں)

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

دبیرؔ، مغزِ متفکّر

عادلؔ مختار

ایک بڑے شاعر کے لیے صرف تخلیق کار یعنی موجود مواد سے کچھ نیا بنانے والا، ہونا کافی نہیں بلکہ اسلوب اور مضامین کے حوالے سے مؤجد ہونا اور موجود مواد اور روایت کا بھرپور شعور اور احساس رکھنے کے باوجود ایجاد سے متعلق فلسفیانہ فکر کا پیرائے شعری میں اظہار ضروری ہے۔ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا بھی ایک کمال ہوسکتا ہے مگر ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ میں باندھنے کی بجائے اگر پھول کے علاوہ سو مضامین ایجاد کیے جائیں اور ان پر فکری تعمّل کے بعد اگر انہیں مستقل بنیادیں فراہم کر دی جائیں تو اس قسم کی ایجاد اور ان کے ایجاب کو عمومی سطح تک لے آنا یہ یقیناً ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھنے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

ایک تخلیق کار اور مؤجد کے درمیان فرق ''تسلسل'' اور ''تبدیلی'' کے درمیان تناؤ سے ظاہر ہوتا ہے۔ تخلیق کار روایت کی قدر کا اظہار کرتے ہوئے، موجودہ شکلوں کو محفوظ کرتے ہوئے پروان چڑھاتا ہے۔ جبکہ ایک ایجاد کار جدّت پسند ترقی کی قدر کو پیش کرتے ہوئے، حدود کو آگے بڑھاتا ہے اور نئے امکانات پیدا کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں ہمیں مذکورہ فکری جدوجہد اور اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والی ایجادات، جدّت اور ندرت کے باوجود مرثیے ایسی حساس صنف میں بھی عمومی سطح پر، ان کی قبولیت کی اہلیت نظر آتی ہے۔ مرزا صاحب کے حوالے سے جہاں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی تکلّف کا مظاہرہ کرتے ہیں وہاں اکثر مواقع پر وہ اسی تفکّرِ ایجاد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ایسا ممکن نہیں کہ دبیرؔ جس مقام پر ہمیں اپنے تئیں تضاد یا اشکال کا شکار نظر آئیں وہاں اسے تکلّف سے تعبیر کیا جائے بلکہ ایسے مواقع پر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ دبیرؔ ایک مغزِ متفکّر ہیں اور ان کی مشکلات اور تکلفات عمومی نہیں ہیں بلکہ خصوصی ہیں کہ جن کو ان کی اجتہادی اور مؤجدانہ روش کو نظر انداز کر کے ہرگز حل نہیں کیا جاسکتا۔

دبیرؔ کی مشکلات اور تکلفّات کو حل کرنے سے پہلے یہ بہرحال ماننا پڑے گا کہ وہ ایک صحّت مند بلکہ توانا فکر کے حامل شاعر ہیں۔ لہٰذا ان پر فکر کی کجی کا الزام لگانا خود مشکل امر ہے اور اس قسم کے الزام کو ثابت کرنا مشکل تر۔ ایسا بھی ممکن نظر نہیں آتا کہ مجتہدِ نظم کسی خیال کو اپنے کلام میں تہذیب و تخلیص کے بغیر جگہ دیں۔

فکرِ ایجاد میں گم ہوں مجھے غافل نہ سمجھ اپنے انداز پہ ایجاد کروں گا تجھ کو

(جونؔ)

اگر مذکورہ امور پیشِ نظر رہیں تو ایک صورتِ حل جو بہت واضح ہے وہ یہی ہے کہ دبیرؔ کی نظم کردہ روایات، مضامین اور ان کے اسلوب کو ان کی طبعِ ایجاد پر محمول کیا جائے اور اس حوالے سے ایک ''بڑا تخلیق کار'' جس توجہ، احترام اور داد کا مستحق ہوتا ہے اسے دبیرؔ کے حق میں بھی روا رکھا جائے۔ دبیرؔ کی شاعری کئی حوالوں سے عظیم شاعری ہے اور اس کا مشکل ہونا اس کی عظمت ہی کے جوہر میں مضمر ہے: ناقابلِ فہم تجربات کی تخلیقِ مکرّر کی کوشش، ''ان کہے'' ہوئے کو کہنے کی سعی اور انسانی اظہار کی حدود کو چیلنج کرنے کا عزم، یہ مشکلات ہی وہ عوامل ہیں جو دراصل

عظیم شاعری کو اتنا طاقتور اور پائیدار بناتے ہیں۔

دبیرؔ اپنے مرثیوں میں محض فکری بُعد ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی محض جذباتی عوامل کو بروئے کار لاتے ہیں بلکہ وہ ان ''دونوں ہاتھوں'' سے بیک وقت کارہائے اختراع و ایجاد کو انجام دیتے ہیں۔ دبیرؔ ان دونوں عناصر کی باریکی، پیچیدگی اور دقّت کے ساتھ آمیزش سے تہہ دار نظمیں تخلیق کرتے ہیں جن میں فکر اور احساس آپس میں جڑے ہوتے ہیں اور اسی آمیزش کے نتیجے میں تخلیق ہونے والا مرثیہ سطحی جذبات سے ورا رثائی احساس کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ انسانی تجربے کے علمی، تعقلاتی، نفسیاتی اور ذوق سے متعلق جہتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ معرفت، مصائب، عقائد اور تہذیب کی پیچیدگیوں کے بارے میں گہری بصیرت پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کا کہنا ہے:

''مرزا صاحب کے مراثی کی گریہ خیزی کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ نفسیات کے بڑے ماہر تھے''

اور اگر دبیرؔ کی دقّت پسندی کی عظمت کی شہادت درکار ہو تو پروفیسر صفی حیدر فرماتے ہیں:

''دبیرؔ نے مرثیے کے فکری معیار کو بلند کیا ان کے مرثیے کا اندازہ ان کے جدت پسندی، خلاّقی و معنی آفرینی، پرشکوہ طرزِ سخن، عالمانہ زبان، علم بیان اور بدیع کے ماہرانہ استعمال سے کیا جاسکتا ہے جنہوں نے مل کر ان کے فن کی تشکیل کی ہے''

مگر یہ نفسیات کا علم ہو یا دیگر ابعاد، کیا مشکل پسندی دبیر کے ہاں بالارادہ کارفرما تھی یا بے ساختہ؟ کیونکہ اگر یہ بے ساختہ ہے تو فنِ دبیرؔ کے حوالے سے تجزیہ، تبصرہ اور تنقید کا ایک مخصوص زاویہ ہوگا اور اگر یہ بالارادہ ہوں تو تجزیہ، تبصرہ، اور تنقید کے لیے زاویہ مختلف ہوگا۔

اس سلسلے میں مہذبؔ لکھنوی دبیرؔ کے فن و فکر پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صنائع بدائع کی حشر سامانی کے ساتھ ساتھ ان کے خیال کا تلاطم جب انگڑائیاں لیتا ہوا تراکیب اور لفظیات کی پیچیدہ چٹانوں سے ٹکراتا ہے تو قوت متخیلہ کی شوریدہ سری تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ یہاں ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ مرزا صاحب مغفور نے طبیعت کو خود اس طرزِ نظم پر مجبور کر کے آمادہ کیا۔''

اس مقام پر مہذبؔ لکھنوی صاحب نے دبیرؔ کی جس ''مجبور آمادگی'' کی طرف پرتکلف انداز میں اشارہ فرمایا ہے اسی ''مجبور آمادگی'' کو ہم بلاتکلف مرزا صاحب کی جدّت، ندرت اور ایجاد سے متعلق فکر اور رغبت قرار دے سکتے ہیں جس سے مرزا صاحب کے مرثیوں کے تجزیے تبصرے اور تنقید کے لیے صحیح زاویہ فکر قائم ہوسکتا ہے۔

دبیرؔ مرثیے میں ''مؤجد طرزِ جدید'' ہونے کی بنا پر ایجاد اور جدّت پسند فنکار کے جملہ صفات سے متصف نظر آتا ہے جو کسی دریافت کرنے والے کی طرح نامعلوم علاقوں میں قدم رکھتا ہے، قائم کردہ اصولوں اور روایات کو چیلنج کرتا ہے۔ وہ مؤجد جو نمود کا حامی اور متجسّس ہونے کے باوصف جمود کو توڑنے کی خواہش سے متاثر ہوتا ہے، جیسے کہ آئن سٹائن جس نے طبیعیات میں انقلاب برپا کیا، یا پکاسو، جس نے آرٹ کے روایتی تصورات کو توڑ دیا اور مرثیے میں دبیرؔ جس نے کلاسیکل مرثیہ گو ہوتے ہوئے بھی فکرِ ایجاد سے ایک الگ طرزِ رثاء کی ساخت و پرداخت کی اور اپنے نظامِ فکر و فن سے عہدِ جدید کو بھی متاثر کیا۔

❁❁❁❁

حضرت عباسؑ ابنِ علیؑ۔ مرزا دبیرؔ کے کلام کی روشنی میں

ذیشان زیدی

مجتہدِ نظم مرزا سلامت علی دبیر علیہ رحمہ پر کچھ لکھنا سورج کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ بقول فراق گورکھپوری کے ''دبیرؔ کا ذخیرۂ کلام اتنا بڑا ہے کہ عام پڑھنے والے اس بحرِ ذخار کی پیرا کی نہیں کر سکتے''۔ تو مجھ جیسے ادنیٰ طالبِ علم مرثیہ کی کیا اوقات۔ یقیناً مرزا صاحب کی مضمون آفرینی اور شوکتِ الفاظ کا احاطہ کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔

ایمان، شجاعت اور وفا کی بلندیوں پر جب نگاہ کرتے ہیں تو وہاں ایک شخص نظر آتا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی جو فضل و کمال میں، قوت اور جلالت میں اپنی مثال آپ ہے۔ جو اخلاص، استحکام، ثابت قدمی اور استقلال میں نمونہ ہے اور ہر اچھی صفت جو انسان کی بزرگی کو عروج عطا کرتی ہے اس شخص میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک لشکر کا علمبردار نہیں بلکہ مکتبِ شہادت کا سپہ سالار ہے جس نے تمام دنیا کو درسِ اطاعت، وفاداری، جانثاری اور فداکاری دیا ہے۔ اور وہ حیدرؑ کرار کا لختِ جگر حضرتِ عباسؑ ہیں۔

واقعۂ کربلا میں حضرت عباسؑ علمدار کے لافانی کردار کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ مرزا دبیرؔ کے کئی شاہکار مرثیے حضرت عباسؑ کے حال میں ہیں جو تحت اللفظ خوانی اور سوز خوانی کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اس انتخاب میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ قبل از ولادت حضرت عباسؑ تا بعد از شہادت حضرت عباسؑ تک کا سلسلہ قائم رہے۔ اس لیے عمداً ایسا بھی کرنا پڑا ہے کہ ایک مرثیے کے بند میں دوسرے مرثیے کے بند ملا کے ترتیب دیے ہیں تا کہ اختصار بھی قائم رہے اور بات ترتیب وار آگے بڑھتی رہے۔

عموماً شاعروں کی شہرت بادشاہوں یا امیروں کی دست گیری سے ہوتی ہے مگر دبیرؔ کے بقول ان کو حضرت عباسؑ کی حمایت حاصل ہے جس کو وہ خود ایک مرثیہ میں یوں پیش کرتے ہیں

خاقانیؔ و فردوسیؔ و سعدیؔ و نظامیؔ — شاہوں کی مدد سے ہوئے آفاق میں نامی
عباسؑ ہیں اس بندۂ درگاہ کے حامی — دیتا ہے سُخن لکھ کے مجھے خط غلامی
ہیں دو ہی دبیر اس میں نہیں ایک کو شک ہے — منبر مری جاگیر مقام اس کا فلک ہے

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

مداح کو اب تازگیٔ نظم میں کد ہے — یا حضرتِ عباسؑ علیؑ وقتِ مدد ہے
مولا کی مدد سے جو سُخن ہو وہ سند ہے — اس نظم کا جو ہو نہ مقر اس کو حسد ہے
حاسد سے صلا بھی نہیں درکار ہے مجھ کو — سرکار حسینیؑ سے سروکار ہے مجھ کو

اوراب شاعرانہ تعلّی اور مرثیہ پر حضرت عباسؑ کی مدد ملاحضہ کیجیے:

روشن ہے رقم وصفِ علمدار و علم سے قطروں کے عوض چاند ٹپکتے ہیں قلم سے
تازہ ہے سُخن یاریِ سقائے حرم سے جس طرح گلستانِ کرم ابرِ کرم سے
مضموں ہیں عباسؑ کے اعزاز و شرف کے دیکھو تو سہی صاف یہ موتی ہیں نجف کے

ممدوح مرا نامِ خدا سیفِ خدا ہے دعویٰ جو کروں سیف زبانی کا بجا ہے
یوں قطع رہِ نظم کروں میں تو مزا ہے سب مل کے یہ کہیں کہ یہ انداز جدا ہے
خامے کو اُدھر خواہشِ تحریر نے تھاما اور ہاتھ اِدھر بازوئے شبیرؑ نے تھاما

حضرت عباسؑ کی ولادت کا پس منظر:

غزوۂ موتہ میں حضرت جعفرؑ طیار کی شہادت ہوئی تو مولائے کائنات نے بھی یہ خواہش کی کہ مجھے بھی راہِ خدا میں ایسی شہادت نصیب ہو۔ جناب رسولِؐ خدا نے فرمایا کہ پروردگارِ عالم آپ کو ایک فرزند عطا کرے گا اور نصرتِ حسینؑ میں اس کے بھی دونوں ہاتھ قربان ہوں گے۔

سن کر یہ تمنا شہِؐ لولاک پکارے بس بس کہ یہ حصہ ہے بھتیجے کا ہمارے
جو عاشقِ شبیرؑ ہے بیٹوں میں تمہارے شانوں کو کٹائے گا وہ دریا کے کنارے
رتبے کی بلندی میں فلک پست ملیں گے یاقوت کے پر اس کو سرِ دست ملیں گے

جب یہ بات جناب سیدہ سلام اللہ علیہ کو معلوم ہوئی تو سن کر بہت خوش ہوئیں اور فرمانے لگیں اگر وہ لڑکا میرے حسینؑ کا عاشق ہوگا تو میں دل وجان سے اس کی خدمت کروں گی۔ دبیرؔ نے جنابِ سیدہ اور مولائے کائنات کی پرحسرت گفتگو کو اس طرح بیان کیا ہے۔ مرزا دبیرؔ جنابِ سیدہؑ کی حسرت نظم کرتے ہیں:

پیدا جہاں میں ہوگا جو عباسِؑ نامور حسرت ہے میں بناؤں گی اپنا اسے پسر
ہوگا وہ سرو قد خراماں اِدھر اُدھر چھوٹا سا اک رکھوں گی علم اس کے دوش پر
سقا بنے وہ جعفرِؑ ثانی جہان میں ننھی سی ایک مشک بندھی ہو نشان میں

دیکھو یہ تم سے پہلے کہے رکھتی ہے بتولؑ عباسؑ کو میں پالوں گی اے نائبِ رسولؐ
زہراؑ کا پیار دیکھ کے حیدرؑ ہوئے ملول کہنے لگے یہ آپ کا کہنا بدل قبول
لیکن ہے دیر اس گلِ نورس کے آنے میں جب آئے گا وہ آپ نہ ہوں گی زمانے میں

مولائے کائناتؑ اور حضرت ام البنینؑ کا عقد مبارک مرزا صاحب نے کم از کم دو مرثیوں میں اس عقدِ مبارک کا ذکر کیا ہے۔ پہلے مرثیے سے ایک منظر یوں پیش کرتے ہیں جس میں حضرت اُم البنینؑ فاطمہ بنت حزام کلابیہ کا مقام و مرتبہ بھی ظاہر ہو رہا ہے۔

جب عقدِ یداللہ میں یہ خوش سیر آئی — اور گھر میں درِ علمِ الٰہی کے در آئی
تب شانے پہ اک لوح علیؑ کو نظر آئی — لوحِ دلِ حیدرؑ میں ضیا سر بسر آئی
فرمایا یہ اس بانوئے فرخندہ شیم سے — احوال کہو یک قلم اس لوح کا ہم سے

وہ بولی کہ مجھ کو تو خبر کچھ نہیں اصلا — پر مجھ سے مری ماں یہ بیاں کرتی تھی آقا
بیٹی تو میرے بطن سے جس دم ہوئی پیدا — ہاتف نے صدا دی کہ معزز اسے رکھنا
ہشیار امانت سے خدائے ازلی کی — یہ ماں ہے علمدارِ حسینؑ ابنِ علیؑ کی

دوسرا مرثیہ دبیرؔ کی زندگی کا آخری مرثیہ ''انجیلِ مسیحِ لبِ شبیرؑ ہیں عباس''، ہے جس کو نظم کرنے کے دوران دبیرؔ کو خدائے سخن میر ببر علی انیسؔ کی رحلت کی خبر ملی۔ دبیرؔ نے خبر سن کر بے انتہا گریہ کیا اور کہا کہ دبیرؔ یہ تیرا آخری مرثیہ ہے۔ اس مرثیے میں کیا خوب منظر بیان کیا ہے۔ جب بعد عقد بی بی ام البنینؑ کو ایک روز خواب آیا اور مولائے کائنات نے اس کی تعبیر بتائی یا یوں کہیے کہ جیسے بیٹوں کی بشارت دے دی۔

ہو کر متبسم شہِؑ مرداں یہ پکارے — کیا ڈھونڈتی ہو؟ اس نے کہا عرش کے تارے
کیا خواب میں بیدار ہوئے بخت ہمارے — اک چاند ابھی گود میں تھا ، تین ستارے
فرمایا مقدر میں ترے چار پسر ہیں — پر تین خلف تارے ہیں عباسؑ قمر ہیں

اور پھر بطنِ مادر میں علمدار وفا کی کیفیت دیکھیے:

جس چاند سے معلوم ہوئے حمل کے آثار — اعجاز و کرامات کے کھلنے لگے اسرار
ماں راتوں کو سوتی تھی یہ تھے بطن میں بیدار — پچھلے سے جگاتے تھے پئے طاعتِ غفار
یہ عشق کس طفلِ شِکم کو ہے کسی کا — ہر وقت لیا نام حسینؑ ابنِ علیؑ کا

حضرت عباسؑ کی ولادت باسعادت: چار شعبان المعظم ۲۶ھ کو ہوئی۔ مرزا دبیرؔ لکھتے ہیں:

خود ساقیِ کوثر نے دیا غسلِ ولادت — کانوں میں کہی آپ اذاں اور اقامت
پھر دامنِ شبّیرؑ میں دی اپنی وہ دولت — فرمایا کہ راضی ہوئے اے فدیۂ اُمت
ہر روز تقاضا تھا علمدار کا ہم سے — لو آج خدا نے یہ دیا اپنے کرم سے

حضرت عباسؑ سیّد الشہدا کی گود میں آتے ہیں تو

بوسہ دیا رُخسار پہ شاہِؑ شہدا نے — پر ہاتھ کئی بار ملے چوم کے شانے
بیٹا کیا اپنا خلفِ خیرِ نسّا نے — عباسؑ کو مژدہ دیا یہ شیرِ خدا نے
لے آلِؑ عبا سے ترا پیوند ہے بیٹا — فرزند پیمبرؐ کا تو فرزند ہے بیٹا

امام علیؑ اپنے بیٹے عباسؑ کو تہنیت دیتے ہوئے تلقین کر رہے ہیں:

فرزندیِ شبّیرؑ گرامی ہو مبارک — آقائی تمہیں ، ان کو غلامی ہو مبارک
مقتل میں شہیدوں کی سلامی ہو مبارک — عزّ و شرفِ جعفرؑ نامی ہو مبارک
شبیرؑ جو فرزند کہیں پیار سمجھنا! — تم ان کو مگر مالک و مختار سمجھنا!

ایک اور جگہ کیا خوب منظر پیش کیا ہے:

ہنستے ہوئے ناگاہ حسینؑ اور حسنؑ آئے — اگ گُل کے نظارے کے لیے دو چمن آئے
کس مہر سے خورشیدِ رسولِؐ زمن آئے — دو چاند ستارے کی طرف خندہ زن آئے
شبرؑ سے علیؑ نے کہا بھائی ہے تمہارا — شبیرؑ سے فرمایا فدائی ہے تمہارا

حضرت عباسؑ کا حسب ونسب:

بابا وہ ہے جو آدمؑ و حوّا کا شرف ہے — واں عرش کا یاں کعبۂ اعظم کا شرف ہے
سردار حسینؑ ان کا دو عالم کا شرف ہے — ماں آسیہؑ کا فخر ہے مریمؑ کا شرف ہے
ہو کیوں نہ وہ بی بی شرفِ مادر عیسیٰؑ — فرزند ہے عباسؑ سا وارث ہے علیؑ سا

ذہنِ عباسؑ میں معرفتِ باری کی عاقلانہ لہر:

حضرت عباسؑ علوی کمال کی ایک روشن جھلک تھے۔ مروی ہے کہ نہایت کمسنی کے عالم میں ایک دن حضرت عباسؑ امام علیؑ کے زانو پر تشریف فرما تھے تو امیر المومنینؑ نے دستورِ زمانہ کے مطابق فرمایا یوں گنتی گنو۔ کہو ایک تو حضرت عباسؑ نے فرمایا ایک پھر فرمایا کہو دو تو عباسؑ نے فرمایا کہ بابا مجھے شرم آتی ہے کہ جس زبان سے ایک کہہ کر وحدت باری کا اقرار کر چکا ہوں اس زبان سے دو کیسے کہہ دوں۔ دبیرؔ لکھتے ہیں

مکتب میں ابھی جا کے سبق بھی نہ لیا تھا — تختی پہ رقم ایک الف تک نہ کیا تھا
پر چاہیے جو علم وہ خالق نے دیا تھا — آئینۂ اخلاص بھی بے رنگِ ریا تھا
تھا ذکر خطِ عارض شبیرؑ زباں پر — قرآن تھا گویا مع تفسیر زباں پر

آثار تھے عرفاں کے عیاں رُخ سے جو سارے — اک روز علیؑ ممتحن ان کے ہوئے بارے
فرمایا کہو ایک تو صدقہ میں تمہارے — جب ایک کہا بولے کہ اب دو کہو پیارے
سو طرح کا اک دل میں غم و رنج عیاں تھا — دو کہنے سے چہرہ پہ شش و پنج عیاں تھا

آخر جو کہا تو یہ کہا اے شہِؑ خوش خو — بے عذر کہوں اور جو کچھ حکم مجھے دو
پر دو نہیں کہنے کا بحل کیجیے مجھ کو — جس منھ سے کہا ایک اسی منھ سے کہوں دو

دل سینے میں بولے گا جو چُپکا میں رہوں گا میں ایک کا قائل ہوں کبھی دو نہ کہوں گا

مولائے کائنات بہت خوش ہوئے اور فرمایا

اللہ کے اخلاص نے یہ فہم دیا ہے کیا ترجمہِ سورہِ توحید کیا ہے
انکار سے میں خوش ترے اقرار سے راضی راضی ہو خدا تجھ سے تو غفار سے راضی

اسمِ عباسؑ کے توضیحات:

کیوں حرفِ عین افسرِ عرشِ جلیل ہے کیوں حرفِ با بہشتِ بریں میں دخیل ہے
کیوں اوجِ آسماں کی 'الف' سے دلیل ہے کیوں سین سر بسر سندِ سلسبیل ہے
سب صورتوں سے حق نے فضائل دکھائے ہیں عباسؑ کے خطاب میں یہ حرف آئے ہیں

ہے 'عین' سرِ اسم کہ ہوں گے یہ علمدار 'بے' سے ہے بشارت کہ یہ ہے بازوئے سالار
ایمان کا آغاز 'الف' سے ہے نمودار ہے ' سین' سے سقائے سکینہؑ یہ خوش اطوار
ہے 'عین' کے سر پر جو زبر خواہشِ رب سے یہ بازوئے شبیرؑ زبردست ہے سب سے

امام حسینؑ سے محبت:

بچپنے سے ہی حضرت عباسؑ کو امام حسینؑ سے بہت محبت تھی۔ مرزا دبیرؔ کے لکھے ہوئے حضرتِ عباسؑ کے مرثیوں میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں یہاں کچھ بند پیش خدمت ہیں:

فہرست ازل میں تھے رقم عاشقِ شبیرؑ تھی روزِ ولادت سے عیاں عشق کی تاثیر
لے لیتے تھے گودی میں جو ان کو شہؑ دلگیر آغوش میں پہروں ہی رہا کرتے تھے بے شیر
ماں ہاتھوں کو پھیلاتی تھی جب سامنے آکر آقا سے لپٹ جاتے تھے منھ اپنا پھرا کر

اس منظر کو ایک جگہ اس طرح نظم کیا ہے کہ بیت میں مصائب کا پہلو بھی عیاں ہو رہا ہے

پھر ہاتھوں کو پھیلا کے جو وہ آنے لگی پاس منھ پھیر کے حضرت سے لپٹنے لگے عباسؑ
شہؑ نے کہا اماں ، بہت ان کو ہے مرا پاس ہیں سیر مجھے دیکھ کے نے بھوک ہے نے پیاس
جب تک ہوں میں یاں دودھ یہ جانی نہ پیے گا اک روز مرے واسطے پانی نہ پیے گا

حضرت عباسؑ عمر کی منازل طر کر رہے ہیں اور عالم یہ ہے کہ

القصہ کہ ہر دم ہوئی توقیر زیادہ ِسن بڑھتا گیا الفتِ شبیرؑ زیادہ
مشقِ رقمِ مصحف و تفسیر زیادہ شوقِ ہنرِ نیزہ و شمشیر زیادہ

کچھ ہوش سنبھالا تھا کہ تلوار سنبھالی بابا کی بھی بھائی کی بھی سرکار سنبھالی

شہؑ ان سے رضا مند تھے ، یہ شہؑ سے رضا مند وہ کہتے تھے فرزند ، یہ کہتے تھے خداوند
بانہوں کو بناتے تھے کبھی شہ کا کمر بند اور ہاتھ تو تھے دامنِ شبیرؑ کا پیوند
قبضہ نہ فقط دامنِ دولت پہ کیا تھا معشوق کا دل ہاتھ میں عاشق نے لیا تھا

کہتے ہیں جس کو عاشقِ شیدا ملک و ناس اللہ کے شبیرؑ ہیں ، شبیرؑ کے عباسؑ
اس حسنِ ارادت سے یہ حضرتؑ کے رہے پاس جیسا تھا پیمبرؐ کا علیؑ کو ادب و پاس
ایمان کو یہ جانتے تھے جان سے پیارا اور حضرتِ شبیرؑ کو ایمان سے پیارا

ایک اور مرثیے میں صنعت تجنیس استعمال کرتے ہوئے کمال بیت کہی ہے:

یوسفؑ جو گرے چاہ میں پھر چاہ سے نکلے تا حشر نہ شبیرؑ کی یہ چاہ سے نکلے

شبیرؑ کے فدوی: ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرورِ کائناتؐ نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیمؑ کو امام حسینؑ پر قربان کیا۔ اسی طرح مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالب نے اپنے بیٹے عباسؑ کو فرزند رسولؐ کا فدیہ بنایا۔ دبیرؔ کہتے ہیں

شبیرؑ کے فدیوں کی جو ہے قدر فراواں جبریلؑ کو عیسیٰؑ کو ہے اب تک یہی ارماں
شبیرؑ پہ بیٹے کو نبیؐ نے کیا قرباں جو طور نبیؐ کا وہ ہے طورِ شہِؑ مرداں
شبیرؑ کے صدقے میں دیا ان کو علیؑ نے جو کام کیا نبیؐ نے کیا وہ کام وصی نے

اسی عمل کی پیروی کرتے ہوئے حضرت عباسؑ اپنے بیٹے محمدؑ کو حضرت علیؑ اکبر کا فدوی بناتے ہیں اور ان کی زوجہ بھی اس کی تاسی کرتی نظر آتی ہیں کہ ان کا فرزند حضرت علی اکبرؑ پر قرباں ہو جائے

اب صدقے پسر کرتا ہوں ہم شکلِ نبیؐ پر پھر ہوں گا میں قربان حسینؑ ابنِ علیؑ پر
تو دودھ اسے بخش بحق علی اکبرؑ پہنا اسے پوشاک جو بہتر سے ہو بہتر
سونا ہے اسے قاسمؑ نوشہ کے برابر یہ خیر کا ہے کام نہ وقفہ تو ذرا کر

اکبرؑ کو پسر اپنا سمجھ اس کو جدا کر ہمشکلِ محمدؐ پہ محمدؐ کو فدا کر

حضرت عباسؑ کی زوجہ بھی اس کی تاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ یقیناً کربلا کی شیر دل ماؤں میں زوجہ حضرت عباس کا تذکرہ ضروری ہے۔ حفظِ مراتب کے ساتھ کیا جذبۂ ایثار و قربانی ہے۔

وہ بولی کہ بسم اللہ اگر ہے یہ ارادہ اکبرؑ سے تو لونڈی کو نہیں کوئی زیادہ

یہ اس کا غلام اور وہ اس کا ہے خوزادہ کمسن ہے تو کیا ڈر ہے علیؑ اس کا ہے دادا
حیدرؑ کی ندا آئی یہ بالکل مری خو ہے میں بھی ہوں سخی اور سخی میری بہو ہے

حضرت سکینہؑ کے لیے بیٹی کی تمنا:

لیکن ہوئی جس وقت سکینہؑ کی ولادت اور شہؑ نے کہی اس کی اسیری کی مصیبت
عباسؑ کے دل کو ہوئی بیٹی کی بھی حسرت تا دکھ میں بجا لائے سکینہؑ کی وہ خدمت
نیت تھی بخیر ان کی ، اثر پایا دعا نے عباسؑ کو بیٹی بھی عنایت کی خدا نے

محبّوں کی مشکل کشائی اور حاجت روائی:

حضرت عبّاسؑ کا بن ہاتھوں کے حاجت روائی کرنے کو کس خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے

بے دست زبردست کہیں دیکھا ہے ایسا اک ہاتھ میں دنیا ہے اور اک ہاتھ میں عقبا
بے دست ہیں اور سائلوں کو دیتے ہیں کیا کیا ہے امرِ خدا خیر کو سب سے کرو اِخفا
پھر ہاتھوں کی شرکت انھیں کب مدِ نظر ہو دینے کے یہ معنی ہیں نہ ہاتھوں کو خبر ہو

محشر میں جب ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوگی

محشر میں بجھائے گا عزاداروں کی جو پیاس عباسؑ ہے عباسؑ ہے عباسؑ ہے عباسؑ
عریاں بدنی سے نہیں کچھ شیعوں کو وسواس آئے گا جہنم کا شرارہ نہ کوئی پاس
ہر سال جو رکھتے ہیں علم اِن کا گھروں میں یہ لیں گے پھریرے کی طرح اُن کو پروں میں

سقائِ حسینؑ کی مدت تمام ہے پیاسی سکینہؑ ہے نہ شہؑ تشنہ کام ہے
اب کیوں حضور کا لبِ دریا مقام ہے؟ درپیش اپنے خاص غلاموں کا کام ہے!
اب جو کنارہ کش نہیں دریا سے ہوتے ہیں شیعہ گناہ کرتے ہیں عباسؑ دھوتے ہیں

امام علیؑ سے مناسبت:

حیدرؑ سے مشابہ ہے بہت تن بدن ان کا منھ شیرِ الٰہی کا ہے گویا دہن ان کا
ان کا جو لب و لہجہ وہ طرزِ سُخن ان کا ہے دستِ قوی مثلِ علیؑ صف شکن ان کا
عارض رُخِ حیدرؑ کی طرح جلوہ نما ہیں جو دیکھ لے ان کو وہ کہے شیرِ خدا ہیں

یزید کے دربار میں ملعون شمر حضرت عباسؑ کا ذکر کرتا ہے:

حاکم نے سوئے شمر اشارہ کیا کہ ہاں بولا وہ بے حیا کہ خلاصہ کروں بیاں

بدر و حنین و خندق و صفین و نہرواں اک دن کی جنگ میں تھے یہ سب معرکے عیاں
یکتا تھے یہ علیؑ کی طرح سب خدائی میں مہر و وفا میں خلق و کرم میں لڑائی میں

حضرت عباسؑ کی انفرادیت اور جملہ خصائص: جس طرح اُمتِ محمدیؐ میں امام حسینؑ جیسا کوئی نہیں اسی طرح امام حسینؑ کے پاس کوئی عباسؑ جیسا نہیں۔ دبیرؔ اس بند کے چوتھے مصرعے میں واضح کر رہے ہیں:

یکتائی کے سانچے میں شبیہ ان کی ڈھلی ہے پیروں کا عصا بچوں کی یہ نادِ علیؑ ہے
چاروں کتبِ حق کا شرف ان سے جلی ہے یہ سورہِ اخلاصِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے
خوش قامت و خوش رو ہوا کون ایسا سلف میں حمزہؑ سے دو بالا الف قد ہے شرف میں

دبیرؔ ایک مقام پر اسلام کے چار بڑے علمداروں کا ذکر کرتے ہیں:

مشہور ہے جعفرؑ نے جو ہاتھوں کو کٹایا حمزہ نے علم خوب پیمبرؐ کا اٹھایا
بعد ان کے یہ رتبہ اسدؑ اللہ نے پایا آخر یہ شرف حصے میں عباسؑ کے آیا

لیکن حضرت عباسؑ میں وہ کیا خصوصیت ہے جو باقی تمام علمداروں سے مختلف ہے:

رتبہ وہی عباسؑ کا ہے وہ ہی علم ہے بس فرق ہے اتنا کہ یہ سقائے حرم ہے

ایک اور گوشہ جو دبیرؔ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عباسؑ کی علمداری کی مدت ان دوسرے علمداروں سے بہت کم ہے مگر اب قیامت تک یہ علم حضرت عباسؑ سے منسوب ہو گیا ہے۔ دبیرؔ نے اس بند میں کمالِ فن سے حضرت عباسؑ علمدار کی تصویر کشی کی ہے اور بڑی خوبی سے بیت میں مصائب بیان کر دیے ہیں:

کاندھے پہ جو طوبیٰ نظر آیا ہے وہ کیا ہے وہ منصبِ جعفرؑ علمِ فوجِ خدا ہے
عباسؑ علمدار سپاہِ شہدا ہے مدت ہے علمداری کی کم ، نام بڑا ہے
کل دوپہر ان کے لیے یہ جاہ و حشم ہے پھر سر ہے نہ گردن ہے نہ شانہ نہ علم ہے

صنعتِ جمع میں مرزا صاحب کس کمال سے بند باندھتے ہیں:

شبیرؑ کے بازو بھی ہیں اور زورِ کمر بھی رشتے میں برادر بھی ہیں الفت میں پسر بھی
خادم بھی ، مصاحب بھی ، دل و جاں بھی جگر بھی اللہ کی شمشیر ، شہِؑ دیں کی سپر بھی
ثابت یہ ہوا ، رن میں جو تیروں سے چھنے ہیں شبیرؑ کی خاطر زرہِ حفظ بنے ہیں

دبیرؔ کبھی جمع و تفریق و تقسیم کو ساتھ ساتھ لکھتے ہیں اور کبھی جمع و تقسیم کو ایک جگہ کر دیتے ہیں:

کیا منھ جو نقابوں سے حسیں منھ کو نکالیں عیسیٰؑ قسم انجیل کی بے ساختہ کھا لیں
توریت کو موسیٰؑ یدِ بیضا پہ اٹھا لیں فرقانِ مبیں فرق پہ خاصانِ خدا لیں

انصاف خدا بڑھ کے حکم ہو کہ یونہی ہے — اتنوں میں کوئی ثانیِ عباسؑ نہیں ہے

پنجے میں یدِ اللہ ہے ، بازو میں ہے جعفرؑ — طاعت میں مَلک ، خُو میں حسن ، زور میں حیدرؑ
اقبال ہے ہاشم میں ، تواضع میں پیمبرؐ — اور طنطنہ و دبدبہ میں حمزۂ صفدر
جوہر کے دکھانے میں شمشیرِ خدا ہے — اور سر کے کٹانے میں یہ شاہِؑ شہدا ہے

صنعتِ استتباع میں دبیرؔ کا یہ بند دیکھیے کہ کس طرح ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو رہی ہے:

دنیائے دنی ان کا نشانِ کف پا ہے — لیکن وہ نشاں ہے کہ کفِ پا سے جدا ہے
عقبیٰ کی جو تعریف سنا کرتے ہو کیا ہے — وہ اک رہِ باریک ہے یہ راہ نما ہے
لو سن لو خلاصہ کہ یہ وہ خاصہِ حق ہے — بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے

شروع کے دو مصرعوں میں دنیا کا ممدوح کا نقش پا ہونا لیکن ایسا نقش جو پاوں سے بالکل علیحدہ ہے بڑا نادر اسلوب ہے۔ ٹیپ میں لفظ خلاصہ نے بھی لطف دیا ہے۔ خاصانِ خدا کی اس سے زیادہ کیا تعریف ہوسکتی ہے کہ ان کی رہبری کے بغیر حق و باطل میں تمیز نہیں ہوسکتی۔

ذیل کا بند صنعتِ تجنیس کی خوش نما شاخوں میں سے ہے۔ بند کے چاروں مصرعوں (قافیہ) میں بار کی لفظ ہر جگہ ایک نئے معنی پر ہے اور پھر تکلف یہ ہے کہ بے تکلف نظم ہے۔ حضرت عباسؑ کی مدح کیا خوب کی ہے:

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سرِ دربار — دربار میں دُر بار علیؑ ہوتے ہیں ہر بار
غیر از حسنینؑ ان پہ تصدق مرا گھر بار — عارض ہیں قمر بار لبِ لعل گہر بار
یہ والیٔ اِقلیمِ ولایتؑ کا ولی ہے — تصویرِ تولّائے حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

حضرت عباسؑ کا روزِ قیامت مرتبہ:

بحار الانوار، ج ۲۲، ص ۲۷۴ میں امام سجادؑ کی حدیث ہے جس میں وہ فرماتے ہیں

خدا کے نزدیک حضرت عباسؑ کا وہ مقام ہے کہ جس پر قیامت کے دن تمام شہداء رشک کریں گے۔ سو مرزا دبیرؔ لکھتے ہیں

اور بتحقیق کہ نزدیکِ خدائے غفّار — ہے علمدار حسینؑ ابن علیؑ کا وہ وقار
کہ شہیدانِ فلک مرتبہ تا روزِ شمار — آرزو مند رہیں گے نہ ملے گا زنہار
قدرِ عباسِؑ دلاور کوئی کیا جانتا ہے؟ — یا نبیؐ جانتا ہے یا کہ خدا جانتا ہے

حضرت عباسؑ کا سراپا:

دبیرؔ نے سراپا نگاری پر زورِ قلم صرف کرتے ہوئے بہت ہی نادر سراپے تخلیق کیے ہیں۔ مشہور ہے کہ حضرت ابوالفضل العباسؑ اور شہزادہ علیؑ اکبر جب مدینے کی گلیوں میں نکلتے تھے تو لوگ فقط ان کے دیدار کی خاطر جمع ہو جاتے تھے۔ مرزا دبیرؔ لکھتے ہیں

لشکر میں ہے جو اکبرؑ و عباسؑ کا وقار — وہ انجمن میں شمع تو یہ باغ میں بہار
آنکھوں میں یہ نگاہ تو سینوں میں وہ قرار — وہ بازوؤں میں زور یہ قبضے میں ذوالفقار
ان دونوں کی یہ فوجِ خدا میں مثال ہے — دریا میں وہ گہر یہ معدن میں لال ہے

یہاں حضرت عباسؑ کا سراپا مختلف مرثیوں سے پیش خدمت ہے

یاقوت اور لب حضرتِ عباسؑ میں تفریق:

شیریں رقموں میں رقم اس لب کی جدا ہے — اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے
یاقوت کا لکھنا مگر ان سب سے جدا ہے — یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے
چوسا ہے یہ لب مثلِ رُطب حق کے ولی نے — یاقوت کا بوسہ لیا ، کس روز علیؑ نے؟

پیشانی کی تعریف:

مطلع الفجر سے روشن ہے سوا پیشانی — دے ضیا صبح کو گر ناصیہ نورانی
کشتیِ روزِ رواں شرم سے ہو طوفانی — مثلِ شبنم گُلِ خورشید ہو پانی پانی
نورِ خالق کی ضیا دیکھ کے پیشانی میں — شام سے صبح تلک بدر رہے حیرانی میں

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت — نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت
چہرے پہ مہ عید کی بے جا ہے اشارت — وہ عید کا مژدہ ہے یہ حیدرؑ کی بشارت
ابرو کی مہِ نو میں نہ جنبش ہے نہ ضو ہے — اک شب وہ مہِ نو ہے یہ ہر شب مہِ نو ہے

ناک کی تعریف:

شان بینی کی ہے حق بینیِ غازی کا شعار — تقویت نکہتِ جنت کو ہے اس سے ہر بار
الف ایماں کا یہ ہے کیوں نہ فدا ہوں دیندار — بیچ میں مصحفِ رُخ کے ہے اسے وقف و قرار
رتبے ثابت ہوئے بینی سے رُخِ تاباں کے — دیکھو انگشتِ نبیؐ بیچ میں ہے قرآں کے

گردن کی تعریف:

گردنِ نازکِ انور ہے کہ مینائے بلور — سربسر بادۂ عرفانِ خدا سے معمور
اس کے نظارے سے دینداروں کو ہوتا ہے سرور — گردنِ عجز جھکاتے ہیں یہاں اہلِ غرور
سب پہ روشن ہے کہ ہاں شمعِ حرم گردن ہے — ایک اس شمع سے فانوس جہاں روشن ہے

حضرت عباسؑ کے کانوں کی تعریف:

کان وہ کان نہیں جن کی ثنا کا امکاں — خبرِ غیب سنا کرتے ہیں ہر دم یہ کاں

کعبۂ رازِ جنابِ احدی کے ارکاں صاف قطروں کے سبب ہیں دُرِ شہوار کی کاں
چرخ حیرت زدہ اس کان کے پرتو سے ہے بندۂ حلقہ بگوش اس کا مہِ نو سے ہے

حضرت عباسؑ کا سینہ اور طُورِ سینینَ:

طُورِ سینا سے یہ سینہ ہے بزرگی میں سوا پر غلط میں نے کہا طُورِ کجا سینہ کجا
طُور میں سنگ ہیں سینے میں دُرِ رازِ خدا لوح محفوظ میں اس لوح کی لکھی ہے ثنا

روز و شب سینہ سپر ہے یہ برائے شبیرؑ
اس کا سینہ تو ہے صندوقِ ولائے شبیرؑ

حضرت عباسؑ کے ہاتھوں کی تعریف:

ہاتھ یہ دستِ یداللہ سے ہوئے ہیں مشتق زورِ حیدرؑ ہے نہیں فرق کچھ اس میں مطلق
فیصلہ کرتے نہ یہ ہاتھ تو آگاہ ہے حق حق سے باطل نہ جدا ہوتا نہ باطل سے حق
دخل کیا شیر بھی جو اس سے ملائے پنجہ قدرتِ پنجتنِؑ پاک دکھائے پنجہ

حضرتِ عباسؑ کے روضۂ مبارک کا جاہ وحشم:

رباعی:

دیکھو شرف و جاہِ جنابِ عباسؑ اللہ ہے ہم راہِ جنابِ عباسؑ
زوار ملائک ہیں ، مجاور رضواں فردوس ہے درگاہِ جنابِ عباسؑ

مرثیوں سے کچھ منتخب بند:

یہ بزمِ مقدس ہے فرشتوں کی گزرگاہ جس طرح سے جنت میں فقط مومنوں کو راہ
موجود ہے تار آنسوؤں کے اور علمِ آہ چلّہ جو بندھا عقدۂ دل کھل گئے واللہ
بے حل ہوئے مشکل نہیں رہتی ہے کسی کی محفل ہے کہ درگاہ ہے عباسِ علیؑ کی

فولاد کی ضریح میں کس کا مزار ہے نمگیرہ جس کا رحمتِ پروردگار ہے
باہم ضریح و قبر سے نور آشکار ہے اِس کی بہار وہ ہے یہ اُس کی بہار ہے
قبر و ضریح سے ہے نمود آب و تاب کی وہ آفتاب ہے یہ کرن آفتاب کی

تربت بھی اور ضریح بھی ہے نور سے بھری صاحب مزار ماہِ بنی ہاشمی ، جری
تربت پہ وہ ضریح مشبک نہیں دھری اُترا ہے برجِ سنبلہ بہرِ مجاوری

کیا قبر نے ضریح کے رتبے بڑھائے ہیں حور و ملک نے دیدۂ حق بیں چڑھائے ہیں

مولائے کائنات کی وصیت:

مولائے کائنات اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں اور اپنے اصحاب و اہل عیال کو وصیتیں کر رہے ہیں۔ حضرت عباسؑ کے حوالے سے ایک خاص وصیت یوں پیش کرتے ہیں۔

القصہ مومنو ہوئی اکیسویں جو رات سونپا حسنؑ کے ہاتھ میں حضرتؑ نے سب کا ہات
باقی بس ایک رہ گئے عباسِؑ نیک ذات ناگہہ کہیں سے شہؑ نے سنی نوحے کی یہ بات
یہ کس کی آہ دل سے مرے پار ہوتی ہے زینبؑ پکاریں مادرِ عباسؑ روتی ہے

ام البنینؑ یہ کہتی تھیں آنسو بہا بہا عباسؑ کو سپرد حسنؑ کے نہ کیوں کیا
کم رتبہ ہوں میں بیٹا بھی کم رتبہ ہے مرا؟ قابل سپرد کرنے کے عباسؑ کیا نہ تھا
شہؑ بولے رو کے سمجھا میں اس شوروشین کو عباسؑ کو بلاؤ اور یہاں حسینؑ کو

عباسؑ اور حسینؑ جو یاں آئے ننگے سر سلجھائیں زلفیں دونوں کی شہؑ نے بچشمِ تر
فرمایا اب نہ پیٹو کہ ہے رخصت پدر تم رہیو دونوں پیار سے آپس میں عمر بھر
عباسؑ سے کہا کہ امامؑ اپنا جانیو ان سے کہا کہ تم بھی غلام اپنا جانیو

پھر یہ عباسؑ سے رو رو کے یدؑاللہ نے کہا میرا بیٹا ہے تو شبیرؑ پہ صدقے رہنا
جانیو اس کو نہ بھائی یہ ترا ہے آقا تو مرا لال ہے یہ ابنِ نبیؐ و زہراؑ
حلق کو اس کے عوض تیغ تلے دھرنا تو اپنے بابا کو نہ زہراؑ سے خجل کرنا تو

سفر کربلا کے دوران حضرت عباسؑ کا کردار:

دو دو قدم پہ ہوتے تھے اطفالِ بے حواس اک پانی پانی کہتا تھا اور ایک پیاس پیاس
یوں قافلہ تھا گردِ علمدارِ حق شناس جس طرح پیاسے حشر میں کوثر کے آس پاس
عباسؑ شانِ ساقیؑ کوثر دکھاتے تھے رستے میں ساری فوج کو پانی پلاتے تھے

حضرت امام حسینؑ حضرت عباسؑ کی شان و شوکت دیکھ کر فرماتے ہیں:

تھے آگے آگے فوج کے عباسؑ نامور لہرا رہا تھا سر پہ پھریرا اِدھر اُدھر
بیساختہ یہ کہتے تھے سلطانِ بحر و بر شوکت پہ مرے بھائی کی کوئی کرے نظر

نانا جہاد کو جو وطن سے نکلتے تھے لیکر علم یونہی مرے بابا بھی چلتے تھے

تو دوسری طرف بہن زینبؑ اپنے بھائی کو دیکھ کر کہتی ہیں:

زینبؑ پکاری شاہِ نجف یاد آتے ہیں کس شان سے علم لیے عباسؑ جاتے ہیں

تیز گرمی میں بھی اپنے آقا و مولا کا خیال:

تھا فرطِ محبت سے یہ عباسؑ کا احوال تھے پہلوئے حضرتؑ میں بہت مضطرب الحال
گھبرا کے ہلاتے تھے کبھی شاہؑ کو رومال سایہ کے لیے منہ پہ کبھی روکتے تھے ڈھال
رو کر کبھی کہتے مرے آقا کو بچانا اس دھوپ سے یارب گُلِ زہراؑ کو بچانا

تشبیہ میں کیا کیا لطافتیں اور نزاکتیں پیش کیں ہیں:

یوں زین پہ زینت تھی علمدارِ جری کی جیسے دلِ مومن میں جگہ حُب علیؑ کی

عباسؑ سے کیا زین مزین نظر آیا یوسفؑ بھی نہ یوں چشمِ زلیخا میں سمایا

جب جنابِ حرؑ کے پیاسے قافلہ سے سامنا ہوا تو ان کے لشکر کی سیرابی کس طرح فرمائی

تھا وہ جری جو مہتمم اس فیضِ عام کا دھوکہ تھا سب کو خضر علیہ السلام کا

میدان کربلا میں ورود:

فرات پر خیمے نصب ہوتے ہیں۔ حضرت ابوالفضل العباسؑ شیر خدا کی آن بان سے ٹہلنے لگتے ہیں اور دریا کو دیکھ کر فرماتے ہیں

آرام کریں گے وہیں افضالِ خدا سے نیند آتی ہے شیروں کو ترائی کی ہوا سے

عباسؑ سبز پوش کھڑے تھے فرات پر جس طرح خضر چشمہِ آبِ حیات پر

عباسؑ کی شمشیر شرربار کی اتنی دہشت ہے کہ:

یہ ہیبتِ شمشیر کا واں جوش ہوا تھا جو موجوں سے دریا بھی زرہ پوش ہوا تھا

فوجِ یزید کی مداخلت اور حضرت عباسؑ کا غیظ و غضب: دبیرؔ نے ایک مقام پر مولائے کائنات کا ارشاد رقم کیا ہے

اللہ ری عدالت کہ علیؑ نے کیا اظہار شبرؑ میں ہے خُلقِ حسنِ احمدِؐ مختار
شبیرؑ میں مظلومیٔ زہراؑ کے ہیں آثار عباسؑ میں ہے دبدبۂ حیدرؑ کرّار
سب وصف ہیں الفت ہے مروت ہے وفا ہے غصہ مرے عباسؑ کا پر قہرِ خدا ہے

واقعہ اس وقت کا ہے جب شمر کے حکم پر یزیدی فوج کے سپاہی دریا کے کنارے سے خیامِ حسینیؑ اٹھانا چاہتے ہیں جس پر بلوے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ غُل جو ہوا جمع ہوئے شاہؑ کے انصار — عباسؑ درِ خیمہ سے آگے بڑھے اک بار
گھنٹا تھا جگر غصہ سے اور سرخ تھے رخسار — للکارے کہ او شمر خبردار ، خبردار
تھم جا وہیں بڑھ کر جو اِدھر آئے گا ظالم — سر لوٹتا بالائے زمیں پائے گا ظالم

تو کیا ہے فرشتے کا بھی تیرے نہیں مقدور — سادات کے خیموں کو جو تیغوں سے کرے دور
آقا کی ہیں میں تسلیم و رضا سے تو ہوں مجبور — ورنہ ابھی معلوم ہو او ظالم و مقہور
وہ قدرتِ حق صاف سرِ دست عیاں ہو — یہ تیغ مری منھ میں ترے مثلِ زباں ہو

جب شمر امام حسینؑ کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہے تو حضرت عباسؑ کہتے ہیں:

تو ابو جہل سے رتبے میں نہیں ہرگز کم — بولہب سے بھی عملِ بد ہیں ترے او اظلم
وہ پیمبرؐ کو کہا کرتا تھا ساحر ہر دم — سحر اعجاز کو کہتا تھا وہ خالق کی قسم
لختِ دل اپنا جسے احمدِؐ مختار کہے — کیا قیامت ہے کہ تو اس کو گنہگار کہے

امام حسینؑ حضرت عباسؑ کو سمجھاتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں:

عباسؑ پھرے کانپتے پیشِ شہؑ والا — کی عرض وہی خوب ہے جو مرضیٔ آقا
ہے کام ہمیں آپ سے ، دریا سے غرض کیا — پر آپ کے فدوی کا بھی دعویٰ نہیں بے جا
یہ آپ نے بھی میں نے بھی بابا سے سنا ہے — دریا کی ترائی تو مرے دفن کی جا ہے

شمر نے آتے ہی اپنی عیاری اور مکاری کا استعمال کرنا چاہا اور اس نے حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں کے نام رشتہ داری کی بنا پر امان نامہ بھجوایا تا کہ وہ امام حسینؑ سے الگ ہو جائیں۔ اس عمل پر حضرت عباسؑ کی کیفیت دیکھیے:

یہ سن کے لگا کانپنے وہ خاصۂ معبود — اور دست پہ قبضہ ہوا ہو کر غضب آلود
فرمایا کہ بس چپ ہو یہ کیا بکتا ہے مردود — اتنا بھی تکبر نہ کر اللہ ہے موجود
میں بندہ ہوں کیوں کر شہؑ دلگیر سے پھر جاؤں — اللہ سے پھر جاوں تو شبیرؑ سے پھر جاؤں

مجھ پر تو سراسر ہیں حقوقِ شہؑ والا — کیا سن تھا یتیمی کا جو دکھ چرخ نے ڈالا
تھا بعدِ علیؑ کون مرا پالنے والا — بھائی نے نہیں پالا تو کس نے مجھے پالا
بابا کے برابر ہی مجھ پاس ہے ان کا — یہ گوشت یہ پوست ان کا ہے عباسؑ ہے ان کا

دبیرؔ نے اپنے ایک سلام میں چاندنی جیسی مشکل ردیف میں متواتر ۲۴ اشعار کہے ہیں جس کا ایک بہترین شعر یہ ہے

شمر نے چاہا کہ حضرتؑ سے جدا عباسؑ ہوں — یہ نہ سمجھا چاند سے چھوٹے گی کیوں کر چاندنی

میدان کربلا میں علمداری کا تقرر: مرزا صاحب کے اس بند کی بیت بہت مشہور ہے۔

اب دیکھیے کسے یہ حسینؑ علم ملے کس خضرؑ تشنہ لب کو یہ ابرِ کرم ملے
پردیس میں قبالۂ باغِ ارم ملے لکھنے کو فردِ بخششِ اُمت قلم ملے
کس کا یہ حق ہے معرکۂ کارزار میں اک پاؤں سے کھڑا ہے علم انتظار میں

امام حسینؑ کربلا میں اپنے مختصر لشکر کی علمداری اپنے بھائی حضرت عباسؑ کو سونپتے ہیں:

باہم رفقا شاہؑ کے کرنے لگے تقریر کیا جانیے کس شخص کی یاور ہوئی توقیر
عباسؑ کو ناگاہ پکارے شہِؑ دلگیر اے ماہِ بنی ہاشم و اے عاشقِ شبیرؑ
بیکس کے علمدار بنو جاہ و حشم لو عباسِؑ علیؑ آؤ پیمبرؐ کا علم لو

دیا عباسؑ کو شبیرؑ نے لشکر کا علم اور رفیقوں سے یہ فرمانے لگے شاہِؑ اُمم
جس طرح سے تھے علیؑ پیشِ رسولِؐ اکرم ہے مرے قوتِ بازو کا وہی اب عالم
رتبۂ جعفرِؑ طیّار مبارک ہو انھیں ورثۂ حیدرِؑ کرار مبارک ہو انھیں

حضرت عباسؑ کی رخصت: حضرت عباسؑ نے میدان میں جانے کی اجازت چاہی لیکن امام حسینؑ نے ہر بار ٹالا۔

جن کو پالا تھا اب ان میں سے رہا کوئی نہیں آسرا زیست کا اب تیرے سوا کوئی نہیں
روکوں اس دکھ میں جو تم کو تو حیا آتی ہے گر رضا دوں تو ابھی جان نکل جاتی ہے
داغ اصغرؑ کا مرے دل کو گوارا ہوگا پر ترے درد کا کچھ ہم سے نہ چارا ہوگا

حضرت عباسؑ کے اصرار پر آپ کو فقط بچوں کی پیاس بجھانے کے لیے پانی فراہم کرنے کی اجازت ملی۔ عباسؑ حضرت سکینہؑ سے کہتے ہیں

عباسؑ پکارے کہ بھلا مشک تو لاؤ تم ہاتھ سے اپنے ہمیں سقّہ تو بناؤ
اور زیرِ فلک ننھا سا سجادہ بچھاؤ سر کھول کے قبلہ کی طرف ہاتھ اٹھاؤ
حق چاہے تو پتھر بھی ہوئے جاتے ہیں پانی بی بی کے لیے نہر سے ہم لاتے ہیں پانی

حضرت عباسؑ اپنے امام اور اہلِ حرم سے رخصت ہو کر خیمے سے باہر آ رہے ہیں۔ دبیرؔ نے کیا خوب منظر کشی کی ہے:

اسوار ہوا جلد علمدارِ گرامی اکبرؑ نے رکاب اور عناں شاہؑ نے تھامی
اقبالِ دو عالم نے دیا خطِ غلامی دے چرخِ بریں جھک کے زمیں اٹھ کے سلامی
کیوں دامنِ دولت نہ کہوں دامنِ زیں کو دامن میں لیا زین نے اس دولتِ دیں کو

اور گھوڑے کی تعریف بھی خوب لکھی ہے

غازی نے جو پردہ درِ دولت کا اٹھایا — اصطبل سے دوڑا ہوا پیکِ اجل آیا
رہوار کو چمکارتا دروازے پہ لایا — اور شور نقیبانہ ادب نے یہ مچایا
آپ آتے ہیں عورت نہ کوئی سامنے آئے — اقبال سے کہہ دو کہ عناں تھامنے آئے

انگلی سے لکھ کے گردنِ توسن پہ یا علیؑ — اک جست میں سوار ہوا حق کا وہ ولی
فی الفور نور و طور کے معنی ہوئے جلی — بجلی جلانا بھول کے خود رشک سے جلی
ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرمِ عناں ہوا — صرصر کی سانس رک گئی جب یہ رواں ہوا

کیا کیا بند پیش کیے جائیں۔ دبیر میدان کربلا میں تو موجود نہ تھے لیکن اپنا تخیل کس طرح استعمال کرتے ہیں

رکھنے لگا جو ہاتھ تصور عنان پر — بگڑا بنا کے منھ کہ نہ کھیل اپنی جان پر
بولی زمیں کدھر؟ تو کہا آسمان پر — پوچھا جو آسماں نے ، کہا ، لامکان پر
یہ کہہ کے فکر و وہم کی حد سے گذر گیا — سایہ ہوا سے پوچھ رہا تھا کدھر گیا

حضرت عباسؑ کی آمد: دبیرؔ کا عظیم الشان مرثیہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' برصغیر کی یونیورسٹیوں اور اردو کے کلاسیکی نصابوں میں شامل رہا ہے۔ مرثیے کا چہرہ میدان جنگ کے اس نفسیاتی منظر سے متعلق ہے جس میں ایک دہشت خیز خبر اور عظیم ترین جرنیل کی آمد کا چرچا ہے۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ''رزمیہ کے لیے یہ امر لازمی ہے کہ قرین قیاس ناممکنات کو خلافِ قیاس ممکنات پر ترجیح دی جائے تاکہ رزم کے اثر کا دائرہ وسیع ہو''۔ ایسا کون جری رن میں نمودار ہو رہا ہے کہ جس کا اعلان قیامت کی نشانیوں پر بھاری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں صنعتِ مبالغہ کی بہترین تصویر دیکھی جا سکتی ہے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے — ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو — جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

مرزا دبیرؔ کے یہاں مابعد الطبیعاتی سوچ یا فکر ہے جس کو metaphysics کہا جاتا ہے

ہیبت سے ہیں عُہ قلعۂ افلاک کے دربند — جلادِ فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
وا ہے کمرِ چرخ سے جوزا کا کمر بند — سیارے ہیں غلطاں صفتِ طائرِ پر بند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے — خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر — کہتے ہیں انالعبد لرز کر صنمِ دیر

جاں غیر ہے تن غیر مکیں غیر مکاں غیر — نے چرخ کا ہے دور نہ سیاروں کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف سے مانند زمیں ہے — جز بختِ یزید اب کوئی گردش میں نہیں ہے

بے ہوش ہے بجلی پہ سمند ان کا ہے ہشیار — خوابیدہ ہیں سب ، طالعِ عباسؑ ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید ، علم ان کا نمودار — بے نور ہے منھ چاند کا ، رخ ان کا ضیا بار
سب جزو ہیں کل رتبہ میں کہلاتے ہیں عباسؑ — کونین پیادہ ہیں سوار آتے ہیں عباسؑ

دبیرؔ نے اپنے مرثیوں میں بے شمار تلمیحات استعمال کی ہیں۔ دبیرؔ کے کمال فن کی صحیح داد اسی وقت دی جاسکتی ہے جب قاری حوالوں سے اچھی واقفیت رکھتا ہو۔ اس بند میں دبیرؔ نے حضرت عباسؑ علمدار کی بہادری اور طاقت کے اظہار کے لیے فردوسی کے شاہنامے سے اشارے منتخب کیے ہیں اور ایرانی بہادروں کا ذکر کر کے ان سب کو نیچا بتایا ہے۔

روکش ہے اس اک تن کا نہ بہمنؔ ، نہ تہمتنؔ — سہرابؔ و نریمانؔ ، و پشن بے سر و بے تن
قاروں کی طرح تحتِ زمیں غرق ہے قارن — ہر عاشقِ دنیا کو ہے دنیا چہ بیژنؔ
سب بھول گئے اپنا حسب اور نسب آج — آتا ہے جگر گوشۂ قتالِ عرب آج

فصاحت کے بیان میں مرزا دبیرؔ کے ایک دوسرے مرثیے کا یہ بند لاثانی ہے:

خیبر شکن کے لال کی آمد ہے صف شکن — گرتی ہے فوج فوج پہ ، پڑتا ہے رن پہ رن
سیفِ خدا کی تیغ کا سایہ ہے تیغ زن — غلطاں کہیں قدم ہیں ، کہیں سر ، کہیں بدن
نے حوصلہ ، نہ بغضِ امامِ مبیں رہا — اب دل میں بھاگنے کے سوا کچھ نہیں رہا

فوجِ یزید کا ڈر: یزید کے لشکر میں مرحب بن عبدالقمر نامی ایک نامی بہادر وارد ہوتا ہے۔ عمر ابن سعد کی جان پر بنی ہے اور وہ مرحب سے کہتا ہے:

درپیش ہے سادات سے ہم کو بھی لڑائی — واں پنجتنی چند ہیں یاں ساری خدائی
اکبرؑ کا نہ قاسمؑ کا نہ شبیرؑ کا ڈر ہے — دو لاکھ کو اللہ کی شمشیر کا ڈر ہے
بولا وہ لرز کر کہ ہوا مجھ کو بھی وسواس — شمشیر خدا کون؟ عمر بولا کہ عباسؑ
اس نے کہا پھر فتح کی کیوں کر ہے تجھے آس — بولا کہ کئی روز سے اس شیر کو ہے پیاس
ہم بھی ہیں بہادر نہیں ڈرتے ہیں کسی سے — پر روح نکلتی ہے تو عباسِؑ علیؑ سے

جب مرحب حضرت عباسؑ کو آتے دیکھتا ہے تو:

دیکھا تو کہا کانپ کے یہ فوجِ وغا سے روباہو! لڑاتے ہو مجھے شیرِ خدا سے!

حضرت عباسؑ کا رجز: دبیرؔ نے اپنے مرثیوں میں حضرت عباسؑ کے حوالے سے کمال کے رجز لکھے ہیں۔ قابلِ غور بند دیکھیے کہ دبیرؔ حضرت عباسؑ کے رجز میں انسانی رشتوں کو کس طرح پیش کرتے ہیں۔

قاسمؑ کا عزادار ہوں اکبرؑ کا میں غمخوار لشکر کا علمدار ہوں سرورؑ کا جلو دار
میں کرتا ہوں پردا تو حرم ہوتے ہیں اسوار تھا شب کو نگہبان خیامِ شہؑ ابرار
اب تازہ یہ بخشش ہے خدائے ازلی کی سقا بھی بنا اس کا جو پوتی ہے علیؑ کی

احمدؐ ہے چچا میرا پدر حیدرِؑ صفدر وہ کُل کا پیمبرؐ ہے یہ کونین کا رہبر
اور مادرِ زینبؑ کی ہے لونڈی مری مادر بھائی مرا اک عونؑ دو عبداللہؑ و جعفرؑ
اور شبرؑ و شبیرؑ ہیں سردار ہمارے ہم ان کے غلام اور وہ مختار ہمارے

صنعتِ تجنیس میں یہ بیت دیکھیے۔ دو ایسے لفظ جو صورت میں ایک جیسے ہیں مگر معنی مختلف۔ اس بیت میں صنعت ذوقافتین بھی ہے۔

جناب امیرؑ کی مدح میں حضرت عباسؑ کہتے ہیں:

جب قبلہ کو ہم نے رُخِ امید پھرایا مغرب کی طرف شام کو خورشید پھر آیا

حضرت عباسؑ اور مرحب بن عبدالقمر کے درمیان رجز کا تبادلہ اور جنگ:

میر انیسؔ کے بھتیجے میر وحیدؔ نے اپنے مرثیے میں حضرت عباسؑ اور مارد بن صدیف کی لڑائی لکھی ہے۔ اسی طرح دبیرؔ نے بھی حضرت عباسؑ کی مرحب بن عبدالقمر سے جنگ نظم کی ہے۔ مرزا دبیرؔ کے ہاں رجز دوطرفہ بیان کیا جاتا ہے۔ رجز میں پہل مخالف کو دی جاتی ہے اسی لیے دبیرؔ کے مرثیوں میں رجز پہلے یزیدی لشکر کا کوئی جنگجو پڑھتا ہے۔

سیدھا کبھی نیزے کو ہلایا ، کبھی آڑا پڑھ پڑھ کے رجز باغِ فصاحت کو اجاڑا
ظالم نے کئی پشت کے مُردوں کو اکھاڑا بولا : مِری ہمت نے جگر شیروں کا پھاڑا
ہم پنجہ نہ رستم ہے نہ سہراب ہے میرا مرحب بنِ عبدالقمر القاب ہے میرا

اس کے مقابلے میں قمر بنی ہاشم حضرت عباسؑ کا رجز بھی ملاحظہ ہو جس میں دونوں کرداروں کی تفریق واضح ہو جاتی ہے

یاں سیفِ زباں سیفِ الٰہی نے علم کی فرمایا : مرے آگے یہ تقریرِ ستم کی !
اب منھ سے کہا کچھ تو زباں میں نے قلم کی کونین نے گردن مرے دروازے پہ خم کی
طاقت ہے ہماری اسداللہ کی طاقت پنجے میں ہمارے ہے یداللہ کی طاقت

اب دیکھیے صنعت ردالعجز میں یہ بند۔ کسی شعر کے مصرعہ ثانی کے جز و آخر کی تکرار کرنا۔ دبیرؔ نے اپنے مرثیوں میں اس صنعت کو بھی کثرت

سے استعمال کیا ہے۔

مرحب ہے تو ، ہم مرحب و عنتر کے کُشندے — عنتر کے کُشندے ہیں تو اَژدَر کے درندے
اَژدَر کے درندے ہیں تو خیبر کے کَنندے — خیبر کے کَنندے ہیں تو لشکر کے بُرندے
لشکر کے بُرندے ہیں ، تو شمشیرِ خدا ہیں — شمشیرِ خدا ہیں ، سپرِ آلِ عبا ہیں

نامرد نے پوشیدہ کیا رخ کو سپر سے — اور کھینچ لیا خنجرِ ہندی کو کمر سے
خنجر تو ادھر سے چلا اور تیغ ادھر سے — اس وقت ہوا چل نہ سکی بیچ میں ڈر سے
اللہ رے شمشیر علمدار کے جوہر — جوہر کیے اس خنجر خونخوار کے جوہر

حضرت عباسؑ کی تلوار: ذیل کے بند میں رعایت لفظی اور التزام شعری کی بہترین آمیزش ہے:

ہر سو جو کیا قلزمِ لشکر کا نظارا — دل تیغ کے پیراک کا لہرایا قضارا
عباسؑ کا پایا جو سرِ دست اشارا — ملبوسِ نیام اس نے نہانے کو اتارا
غوطے کا مزا صاف لبِ تیغ پر آیا — پانی لبِ ساحل کی طرح منھ میں بھرآیا

صنعت ردالعجز ہی میں یہ بند دیکھیے کہ مرحب کا کام تمام کس طرح ہو رہا ہے:

خنجر کا جو کاٹا تو وہ ٹھہری نہ سپر پر — ٹھہری نہ سپر پر تو وہ سیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر — تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر
تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی دامنِ زیں پر — تھی دامنِ زیں پر تو وہ راکب تھا زمیں پر

ایک دوسرے مرثیے سے یہ غیر منقوط بند دیکھیے:

صمصام کو الہام ہوا سر کو علم کر — گہہ سورۂ الحمد کو گہہ صور کو دم کر
اک وار لگا اور دو اعدا کا علم کر — ہر دم عمرِ سعد کا دم محوِ عدم کر
دو حصے کمر کر کہ الگ کاسۂ سر کر — ہر طرح مہم سہل کر اور معرکہ سر کر

تو اس کی ضد یعنی صنعتِ منقوط دیکھیے کہ ہر لفظ میں نقطہ ہے:

تیزیِ تپِ تیغ نے بخشی نئی خفّت — بے چین شقی بخت بغی جبن بہ نیت
چینی ختنی بہ جبیں پشت پہ جنت — نے جی بچے نے تن بچے نے زین نہ زینت
نے چینِ جبیں نے ذقنِ زشت نہ بینی — نے نبض بجنبش نہ تنِ زشت نہ بینی

مرحب کو واصلِ جہنم کرنے پر تہنیت کا ایک غل اٹھتا ہے:

حیدرؑ سے نبیؐ بولے یہ ہے فخر تمہارا حیدرؑ نے کہا یہ مری پتلی کا ہے تارا
پروانۂ شمع رخ تاباں ہوئیں زہراؑ محسنؑ کو لیے گود میں قرباں ہوئیں زہراؑ
یاں تو ہوا یا حضرتِ شبیرؑ کا نعرہ شبیرؑ نے ہنس کر کیا تکبیر کا نعرہ

تو خیمے میں سیدہ زینبؑ بھائی کی فتح پر خوش ہیں

اب کہتی ہوں میں دیکھتی تھی جنگ یہ ساری عباسؑ کی اک ضرب میں ٹھنڈا ہوا ناری
مرحب کو تو خیبر میں یداللہ نے مارا ہم نام کو ابنِ اسد اللہ نے مارا

حضرت عباسؑ نہر فرات پر: غازی عباسؑ لوہے کی دیواروں کو توڑتے ہوئے نہر فرات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ امام حسینؑ اپنے بھائی کے لیے فکر مند ہیں۔ دبیرؔ نے ایک غیر منقوط بند میں اس کیفیت کو جس ہنر مندی سے بیان کیا ہے اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

سردار اِدھر محوِ علم دارِ دلاور دل مردہ و مہموم و ملول و مکدر
گہ مرگِ علمدار کا وسواس سراسر گہ ولولۂ وصلِ علمدار مکرر
گہ دردِ کمر ، گہ دلِ آگاہ کا صدمہ گہ صدمۂ آلِؑ اسد اللہ کا صدمہ

القصہ حضرت عباسؑ نہر فرات پر پہنچتے ہیں اور کیا عالم ہے:

دریا میں ہوا غل کہ وہ دُرِ نجف آیا الیاسؑ و خضرؑ بولے ہمارا شرف آیا
عباسؑ شہنشاہِ نجف کا خلف آیا پابوس کو موتی لیے دستِ صدف آیا
یاد آگئی پیاسوں کی جو حیدرؑ کے خلف کو دل خون ہوا دیکھ کے دریا کی طرف کو

چلو میں پانی بھرا۔ دل کیا مشورہ دیتا ہے:

پانی جو بے حسینؑ کے منھ سے لگائے گا ہے ہے وفا کا نام ابھی ڈوب جائے گا
اس وقت آبرو جو گئی پھر نہ پائے گا یہ روز اب زمانے میں کاہے کو آئے گا
چلیے تو آبِ نہر سے کوثر بھی پاس ہے جب ہاتھ کٹ گئے تو نہ فاقہ نہ پیاس ہے

گھوڑے کی وفاداری:

کہہ کے یہ پھینک دیا ہاتھ سے پانی یکسر اور کہا گھوڑے سے کر آب سے تو لب کو تر
کہا گھوڑے نے کہ اے ابنِ امیرِ کوثر جائے انصاف ہے میں پیاس بجھاؤں کیوں کر
تین دن سے نہ ملے شہؑ کو برابر پانی میں پیوں نہر سے اے دلبرِ حیدرؑ پانی؟

گھوڑے کے مزاج کی تطہیر دیکھیے

پیاس کی ہے پسرِ فاطمہؑ پر طغیانی ہوئی کیا آلِؑ محمدؐ کی یہاں مہمانی

ہاں اصغرؑ نے ابھی تک نہیں پایا پانی پیاسی مرتی ہے سکینہؑ وہ تمہاری جانی
پیاس سے غش میں پڑا زینؑ عبا ہے مولا پانی پینا مرے نزدیک خطا ہے مولا

مجھ سے پوچھے گا یہ جب اسپ امامؑ دلگیر حال میرا بھی تو تھا پیاس کے مارے تغییر
پانی سقا نہ پیے اور رہیں پیاسے شبیرؑ ایک دم کی نہ ہوئی تجھ کو گوارا تاخیر
آج پانی اگر اس نہر کا پی جاوں گا حشر میں صاحبِ دُلدل سے میں شرماوں گا

خیمے میں حضرت سکینہؑ کی کیفیت: جب دشمن جھوٹی خبر اڑاتے ہیں کہ عباسؑ ہم سے مل گئے ہیں تو بچپنے کی گفتگو کو کس پیرائے میں ادا کیا ہے۔

گھبرا کے سکینہؑ نے کہا اے شہِ ذیشاں بتلاؤ تو ، کیوں چھوڑتے ہیں ہم کو چچا جاں؟
کیا کچھ مری سقائی سے آزردہ ہیں اس آں میں ان کو منا لاتی ہوں جاکر سوئے میداں
میں رونے لگوں گی تو کہاں جائیں گے عباسؑ انگلی جو پکڑ لوں گی چلے آئیں گے عباسؑ

حضرت عباس جب فوج میں گھر گئے اور جناب سکینہؑ کو معلوم ہوا:

شرما کے یہ کہنے لگی وہ نازوں کی پالی ہائے ہائے یہ بلا میں نے چچا جان پہ ڈالی
قربان ہوئی نہر پہ میں بھیجنے والی اللہ نہ ٹوٹے کمرِ سیّدِ عالی
جس وقت بلائیں میں چچا جان کی لوں گی یہ بالیاں کانوں کی تری راہ میں دوں گی

اچھی مری اماں ، مرے سقّے کو بلاؤ کہہ دو کہ سکینہؑ ہوئی آخر ادھر آؤ
اب پانی نہیں چاہیے تابوت منگاؤ کندھے سے رکھو مشک جنازے کو اٹھاؤ
ملنے مری میت کے گلے آئینگے عباسؑ یہ سنتے ہی گھبرا کے چلے آئینگے عباسؑ

مشک کا چھدنا اور شہادتِ حضرت عباسؑ:

آنسو آنکھوں سے بہے مشک جو پانی سے بھری باندھا منھ تسمے سے اور دوش مبارک پہ دھری
نکلے دریا سے چلے گھر کو بصد جلوہ گری سدِ راہ شیر کی آ کر ہوئی فوجِ سقری
بلوہ تنہا پہ کیا آن کے بدخواہوں نے گھیرا ابنِ اسد اللہ کو روباہوں نے

دریا سے جو نکلا اسداللہ کا جانی تھا شور کہ وہ شیر لیے جاتا ہے پانی
پھر راہ میں حائل ہوئے سب ظلم کے بانی سقائے سکینہؑ کی یہ کی مرتبہ دانی
قبریں نبیؐ و حیدرؑ و زہراؑ کی ہلادیں برچھیوں کی جو نوکیں تھیں کلیجے سے ملا دیں

وہ کون سا تھا تیر جو دل پر نہ لگایا مشکیزے کے پانی سے سوا خون بہایا
یہ نرغہ تھا جو شمر نے حیلے سے سنایا عباسؑ بچو غول کمیں گاہ سے آیا
مڑ کر جو نظر کی خلف شیرِ خدا نے شانوں کو تہہِ تیغ کیا اہلِ جفا نے

خاک پہ گر کے یہ عباسؑ نے دی شہؑ کو صدا السلام اے شہِؑ مظلوم و غریب الغربا
الوداع اے پسر فاطمہ و شیر خدا افراق اے شہِؑ لب تشنہ امامِ دو سرا
آو ہم نیزہ و شمشیر سے بے جان ہوئے بھائی ہم تم پہ تصدق ہوئے قربان ہوئے

یہ صدا کان میں شبیرؑ کے جس دم پہنچی ایسا روئے کہ نہ روئے تھے کبھی سبطِ نبیؐ
متواتر کہا اب میری کمر ٹوٹ گئی آئے پھر لاش پہ تو نزع کی یہ حالت دیکھی
آہ کس درد سے شاہِ شہدا روتے تھے سن کے جس رونے کو سب اہلِ جفا روتے تھے

مرزا صاحب سے بہتر کون یہ محاورے اور مضمون آفرینی پیش کرسکتا ہے۔ یہ دو رباعیت کمال کی ہیں

ظاہر میں تو دریا پہ علمدار گئے باطن میں وہ کوثر کے طلبگار گئے
دریائے شہادت تھا بیچ میں حائل دو ہاتھ میں اِس پار سے اُس پار گئے

دونوں کے شرف سے ہم خبردار ہوئے ایسے نہ علمدار نہ سردار ہوئے
دریا پہ گرے کٹ کے جو عباسؑ کے ہاتھ دنیا سے حسینؑ دست بردار ہوئے

آیا ہے علم اور علمدار نہ آیا

دیوڑھی پہ علم غرق بخوں آیا کہ محشر ماتم کا اشارہ کیا پنجے نے لپک کر
پھر تو کوئی غش تھا کوئی حیراں کوئی ششدر دیوڑھی پہ حرم پیٹتے تھے ، لونڈیاں باہر
سردار بھی بے ہوش تھا اور اہلِ حرم بھی منھ ڈھانپ کے روتا تھا پھریرے سے علم بھی

خیمے میں موجود امام عالی مقام حضرت عباسؑ کو یاد کر کے نڈھال ہو رہے ہیں۔ حضرت سکینہؑ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی اور وہ عباسؑ علمدار کو پکار کر اپنے والد کی کیفیت بتاتی ہیں۔ امامؑ کی کیفیت اور حضرت سکینہؑ کی بے چینی کو دبیرؔ نے ایک غیر منقوط بند میں کس طرح سمو دیا ہے:

دل دار ! سوا درد ہوا دل کو ، دوا دو دل دار ! علم دار کا ہو وصل ، دعا دو
دل دار ! علم دار کا رو ہم کو دکھا دو دل دار ! علم دارِ دلاور کو صدا دو

عمو اِدھر آؤ ، اِدھر آؤ ، اِدھر آؤ مردہ ہوا سردار ، علم دار گھر آؤ

صوتی اعتبار سے پانچویں مصرع میں ادھر آؤ کو تین مختلف طریقوں سے ادا کرنے سے جو اثر پیدا ہوتا ہے اسے اہل فن ہی سمجھ سکتے ہیں

دمشق میں حضرت عباسؑ کا ماتم: یزید ملعون کو اس کی زوجہ نے لعن طعن کیا اور وہ پشیماں ہوا۔ اس نے اسیرانِ اہل بیتؑ کی رہائی کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ دمشق کے قید خانے میں شہیدوں کے تبرکات آنا شروع ہوئے۔ حضرت عباسؑ کا سر مبارک بھی آیا۔ مرزا دبیر لکھتے ہیں

سردار کے سر کو جو علم نیزے پہ پایا تسلیم کو دروازے سے جھک کر عَلَم آیا

عباسؑ کے ماتم نے اسیروں کو اٹھایا پہنے ہوئے زنجیر قدم سب نے بڑھایا

افشاں تھا پھریرا جو بہشتی کے لہو سے سب زیرِ علم گر پڑے اس خون کی بو سے

مدینے میں ذکر: مدینہ واپسی پر ام البنینؑ سیدہ زینبؑ سے حضرت عباسؑ کی داستانِ وفا سنتی ہیں تو ناز کرتی ہیں

ام البنینؑ نے جب کہ مفصّل یہ سب سنا مسجد کے صحن میں کیا منھ سوئے کربلا

بولی اٹھا کے ہاتھوں کو عباسؑ مرحبا! مرقد میں چین حشر میں پہلوئے مصطفاؐ

تم پیاسے مرگئے تو مری آبرو ہوئی تم خون میں نہائے یہ ماں سرخرو ہوئی

حضرت عباسؑ کے معجزات: دبیرؔ نے اپنے مرثیوں میں کئی معجزات بھی رقم کیے ہیں۔ مثلاً ایک قافلہ کربلا کی زیارت کے لیے رواں ہوتا ہے تو سفر کے دوران میں سے ایک عاشقِ شبیرؑ بیمار ہو جاتا ہے۔ قافلہ آگے رواں ہو جاتا ہے:

اب معجزہ عباسؑ کا کرتا ہوں میں تحریر اک قافلہ جاتا تھا سوئے روضۂ شبیرؑ

پر متصّلِ کربلا لائی جو تقدیر بیمار ہوا ایک محبِّ شہِؑ دلگیر

واں چھوڑ کے اس زائرِ شاہِؑ شہدا کو سب شوق زیارت میں گئے کرب و بلا کو

ناگہ کئی رہزن ہوئے صحرا سے نمودار باندھے کمرِ ظلم کو اور لوٹ پہ تیار

لینے لگے اسباب تو چلّایا وہ دیندار مظلوم کا زائر ہوں میں بے کس کا ہوں زوار

زہراؑ کا علیؑ کا شہِؑ لولاک کا صدقہ لوٹو نہ مجھے پنجتنؑ پاک کا صدقہ

رہزن ہٹ دھرمی دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نہ صرف تمہارا اسباب لوٹیں گے بلکہ تمہاری عورتوں کو کنیزی میں لیں گے۔ اتفاقاً اس مردِ مومن کے اہل وعیال کے ہمراہ سکینہ نامی ایک سیّد زادی بھی ہوتی ہے۔ وہ رہزنوں کی منت سماجت کرتا ہے کہ میرے اسباب اور زن وفرزند اس راہ میں قربان ہو جائیں مجھے پرواہ نہیں مگر اسیران کربلا کی یاد دلا کر خبردار کرتا ہے کہ میرے ساتھ فاطمہؑ کی اولاد ہے خدارا اس سے مزاحمت مت کرو:

کبریٰ کو کنیزی میں طلب جس نے کیا تھا فردوس میں زہراؑ کو قلق اس نے دیا تھا

بے پردہ کیا تم نے گر اس اہلِ وفا کو گویا کہ اتارا سرِ زینبؑ سے ردا کو

مگر رہزنوں نے ایک نہ سنی یہاں تک کہ وہ عاشق اہل بیت حضرت عباسؑ کو واسطے دے کر پکارتا ہے

پھر دھیان میں عباسؑ کے چلّایا وہ مضطر اے سیفِ خدا حامیٔ دیں ثانیِ حیدرؑ
وہ سینۂ شبیرؑ چڑھا جس پہ ستمگر اس سینے کا صدقہ مری اس وقت مدد کر
ہر آن ہو تم طالبِ آرامِ سکینہؑ لٹتی ہے اب اک سیّدہ ہمنامِ سکینہؑ

واللہ ابھی ختم ہوئی تھی نہ یہ گفتار اک گرد زمیں سے جو اٹھی تا فلک اکبار
آنے لگی کانوں میں صدائے سمِ رہوار اور تھی یہی آواز ہم آپہنچے خبردار
غل تھا کہ ہے کس صاحبِ شمشیر کی آمد ہوتی نہیں اس دبدبے سے شیر کی آمد

پیدا ہوا اس گرد کے دامن سے اک اسوار اسوار ہے قدرت کا تو قدرت کا ہے رہوار
ہر چند نہاں زیر نقاب اس کے ہیں رخسار پر ماہ دو ہفتہ کی تجلّی ہے نمودار
زائر نے کہا راہزنوں کو یہ سنا کے لوٹو تو بھلا اب مرے ناموس کو آکے!

کہتے ہیں وہ اسوار کھڑا تھا ابھی خاموش ان راہزنوں کو نہ رہا رعب سے کچھ ہوش
بس غولِ بیاباں کی طرح ہوگئے روپوش زائر سوئے اسوار چلا کھول کے آغوش
پاس آن کے مجرا کیا شادی و فرح سے پاوں سے ملیں آنکھیں رکابوں کی طرح سے

زائر اسوار سے گزارش کرتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پھیلائے تاکہ زائر ان کا بوسہ لے سکے مگر دبیرؔ نے اگلے بند میں مصائب کا دردناک پہلو بیان کر دیا ہے:

ہاتھوں کے جو پھیلانے کو زائر نے کہا آہ اسوار نے اس وقت کیا نالۂ جاں کاہ
فرمایا تو سقائے حرم سے نہیں آگاہ پھیلاؤں میں کیا ہاتھ بھی رکھتا نہیں واللہ
سر کو تو کیا شاہِ مدینہ کے تصدق ہاتھوں کو کیا مشکِ سکینہؑ کے تصدق

جنابِ دبیرؔ فقہ اور قرآن وحدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے کثیر احادیثِ معصومینؑ، روایات اور قرآنی آیات سے اپنے کلام کو بخوبی سجایا ہے۔ تلمیحات، صنائع و بدائع، نادر تشبیہات و استعارات، مضمون آفرینی، لفظی و معنوی صنعتیں، شوکتِ الفاظ دبیرؔ کے کلام کا خاصہ ہیں۔ کتبِ معقول و منقول پر خاصہ عبور حاصل تھا۔ وہ اپنے وقت کے مروجہ علوم میں عروج پر تھے۔ اس کی جھلک ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

ہے استفادہ مجھ کو حدیثوں کی سیر سے واللہ ننگ و عار ہے مضمونِ غیر سے

امید کرتا ہوں کہ اس مضمون کے پڑھنے والوں کے سامنے محاسنِ دبیرؔ کے وہ گوشے آئیں گے کہ جس سے وہ مرزا دبیرؔ کی اردو مرثیے کے لیے ناقابل فراموش خدمات کا اندازہ لگا سکیں گے۔ یہ ہماری ادبی بدقسمتی ہے کہ ہم نے دبیرؔ کے محاسن کو کم اور انیسؔ کے محاسن کو زیادہ پیش کرنا ایک طرح کا رائج الوقت سکہ بنا لیا ہے۔ دونوں ہی کے محاسنِ کلام کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ میر انیسؔ مرثیے کے آفتاب اور مرزا دبیرؔ ماہتاب ہیں بلکہ دونوں ہی آفتاب و ماہتاب ہیں۔ چاند اپنی روشنی سورج سے لیتا ہے۔ یہ دونوں عظیم نفوس مرثیہ گوئی کے افق پر آفتاب کی طرح چمک رہے ہیں اور چمکتے رہیں گے۔ میں اس مضمون کو مومنین و مومنات کے حق میں دعا کرتے ہوئے مرزا دبیرؔ علیہ رحمہ کے ان مصرعوں پر ختم کر رہا ہوں مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!!

اے دبیرؔ اب ہے جگر شق صفتِ شقِ قلم درگہِ حق میں اٹھا دستِ دعا کو اس دم
یہ دعا مانگ کہ اے خالقِ ذوالفضل و کرم مجھ کو سقائے سکینہؑ کی شہادت کی قسم
زائرِ روضۂ شاہِؑ شہدا کر مجھ کو جو مرے دل کے مطالب ہیں عطا کر مجھ کو

❁❁❁

اشاریۂ دبیرؔ
زیرِ طبع
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

ابرؔ جون پوری
کے مرثیے
زیرِ طبع
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ مونسؔ
زیرِ طبع
ترتیب و تدوین
اصغر مہدی اشعر

مرزا دبیرؔ: شاعرِ خوش نوا

کاظم عابدی

مرزا سلامت علی دبیرؔ ان خوش نصیب شعرا میں جنہیں اپنی حیات میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔ جو ہنوز برقرار ہے۔

دبیرؔ کی ولادت ۲۹/ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں ہوئی۔ والد مرزا غلام حسین ایرانی النسل تھے اور ایران کے مشہور مثنوی نگار کے خانوادے سے تعلق تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مغلیہ سلطنت مائل بہ زوال تھی اور دہلی میں طوائف الملوکی برپا تھی۔ اس سے دلبرداشتہ ہوکر مرزا غلام حسین نے بھی اکثر شرفاء کی طرح لکھنؤ کی بود و باش اختیار کی۔

لکھنؤ میں ہی ان کے سسرال بھی تھی۔ ان کا سسرالی گھرانہ انشاء اللہ خاں انشاء کا گھرانہ تھا۔ اس طرح مرزا دبیرؔ کے خمیر میں نوطرفین کی جانب سے علم و ادب کے عناصر شامل تھے۔ دبیرؔ عہدِ طفلی میں ہی والد کے ہم راہ لکھنؤ آ گئے۔

لکھنؤ کی فضا ان کی جولانیٔ طبع کو خوب راس آئی۔ اور شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ اس وقت میر ضمیرؔ مستند استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ دبیرؔ نے ان کی شاگردی اختیار کی لیکن جلد ہی بعض غلط فہمیوں کی بنا پر کنارہ کشی اختیار کر لی۔

والیاں اودھ فقہ جعفری کے پابند تھے۔ انھوں نے فروغِ عزا پر خصوصی توجہ دی۔ الناس علیٰ دینِ ملوکہم کے اصول کے تحت رعایا کی کثیر تعداد بھی اسی عقیدے پر عمل پیرا تھی۔ اودھ کے زرخیز علاقہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی کرگسی نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ سلطنتِ مغلیہ کی تباہی اور سلطنتِ اودھ کے سقوط کے اندیشے کے سبب معاشرہ بول کارل مارکس ''مخصوص غم'' میں مبتلا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر لکھنؤ میں رثائی ادب بدرجۂ اتم پروان چڑھا۔

علم کلام کے دو بنیادی عناصر فصاحت اور بلاغت ہیں مبداء فیاضی نے بلاغت کو مرزا دبیرؔ کے لیے مقسوم کر دیا تھا۔

اس کی واضح مثال ان کا یہ شاہکار مرثیہ ہے۔

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیٔ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخ ہنر مند کے لیے — دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لیے

طلوعِ صبح کی یہ بلیغ منظر کشی شاذ ہے۔

مرثیہ کی بنیادی غرض و غایت گریہ و بُکا ہے۔ اس مقصد میں بھی مرزا دبیرؔ کے مراثی لافانی ہیں۔ ان کے بعض مراثی اس قدر مبکی ہیں کہ انھیں سوزخواں اب تک سوزخوانی میں پڑھتے ہیں۔

مثال کے طور پر چند مطلعے پیش ہیں۔

۱۔ جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ ۲۔ آہوئے کعبۂ قربانیٔ داور ہے حسینؑ
۳۔ روانہ نہرِ لبن کو جو شِیرخوار ہوا ۴۔ قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے
۵۔ گھر سے جب بہرِ سفر سیّدِ عالم نکلے ۶۔ بانوؑ کے شِیرخوار کو ہفتم سے پیاس ہے
۷۔ قریب کوفہ جو رانڈوں کا کارواں آیا ۸۔ وہ کون دو یوسفؑ ہیں کہ آوارہ وطن ہیں

دبیرؔ نے مختلف علوم کی تعلیم مستند علماء سے حاصل کی اور منتہی ہوگئے۔ اس کا انعکاس ان کے کلام میں واضح ہے۔ انھوں نے بے شمار روایات نظم کی ہیں۔ دبیرؔ مرثیہ نگار تھے مورخ نہیں۔ ان کے مراثی کی ضخیم جلدیں ''دفترِ ماتم'' کے نام سے شائع ہوچکی ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے پڑپوتے مرزا گوہر آغا دبیریؔ مرحوم نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ دبیرؔ کے غیر مطبوعہ مراثی کی کثیر تعداد ان کے پاس محفوظ ہے۔ ان کی زود گوئی قابلِ تعجب ہے۔ ہر نو چندی کو نو تصنیف مرثیہ پڑھتے تھے۔

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر مہ
دبیرؔ اس کو سمجھو ہمارا مہینہ

۱۸۵۷ء میں انتزاعِ سلطنتِ اودھ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی قیامتِ صغریٰ نے تلاطم برپا کردیا۔ شاہی سرپرستی اور قدردانی موقوف ہوگئی۔ امراء و روسا یا تو جامِ شہادت نوش کر گئے یا نانِ شبینہ کو محتاج ہوگئے۔ ایسے عالم آشوب میں دیگر اہلِ فن کی طرح دبیرؔ کو بھی مرثیہ خوانی کے لیے اسفار اختیار کرنے پڑے۔ اس سلسلہ میں وہ کلکتہ عظیم آباد، غازی پور، الٰہ آباد، جون پور اور شمس آباد وغیرہ میں طلب کئے گئے۔

ان کی مقبولیت بامِ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ دبیرؔ کی غازی پور آمد کے سلسلہ میں حاجی سید ولایت علی غازی پوری رقم طراز ہیں کہ:

بڑے امام باڑے میں مجلس قرار پائی۔ ہر محلّے اور مضافات سے انبوہ در انبوہ عوام و خواص نکل کھڑے ہوئے۔ ملازم افسروں سے چھٹّی لے کر اور اہلِ بازار جلدی جلدی دکانیں بڑھا کر امام باڑے میں آ جمع ہوئے۔ کوئی جگہ خالی نہیں رہ گئی۔ مرزا صاحب خوب مرثیہ پڑھے کہ تعریف اور گریے کا شور آسمان تک پہنچا۔ عجب مجلس تھی کہ مدتوں یاد رہے گی۔ (نفحۃ العجم، ص ۵۰)

دبیرؔ کا کلام مختلف خصوصیات کا حامل ہے۔ ان کی پلّہ کش آواز سامعین کو متوجہ کرلیتی۔ انھوں نے مختلف صفتوں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ صفت مہملہ مشکل ترین صنعتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ امیر المومنینؑ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہ کا خطبۂ بے نقطہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔

انھوں نے ایک نادر مرثیہ اس صنعت میں نظم کیا ہے۔

مہر علم سرورِ اکرمؐ ہوا طالع

اس کے علاوہ۔ سلام و رباعیات میں بھی صنعت مہملہ کا کامیاب التزام رکھا ہے۔ دبیرؔ کے مراثی میں رزمیہ EPIC عناصر بھی نظر آتے ہیں۔

جب ہوئی ظہر قتل سپاہِ شبیرؑ غیرِ اصغرؑ نہ رہا نور نگاہ شبیرؑ
تھی فقط روحِ علیؑ پشت پناہِ شبیرؑ حق سے کہتا تھا کہ تو رہیو گواہِ شبیرؑ

سر کٹا کر میں شریکِ شہدا ہوتا ہوں آج میں تیری امانت سے ادا ہوتا ہوں

دُرِ دنداں مرے ناناؐ نے تجھے نذر دیا لے گئیں نذر کہ پہلوئے شکستہ زہراؑ
سُرخ رُو ترے دربار میں باباؑ میرا دل کے ٹکڑے مرے بھائی کیے تجھ پہ فدا
آج شبیرؑ بھی ان کے سب کے قابل ہوجائے سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہوجائے

مشہور مقولہ ہے کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن۔ تلامیذ رحمانی میں خودستائی میں بھی پائی جاتی ہے اور تعلّی خاص وصف ہے۔ میرؔ، انشاؔ، غالبؔ اور انیسؔ وغیرہ کے تعلّی آمیز اشعار بکثرت ملتے ہیں لیکن دبیرؔ کی فروتنی اور انکسار نے انہیں ایسے شعروں سے پاک رکھا۔

مرزا دبیرؔ نے مراثی کے علاوہ سلام و رباعیات اور قطعات بھی وافر تعداد میں لکھے ہیں جو اب تک پڑھے جاتے ہیں۔ جن میں گریہ و بُکا کی فضا بدرجۂ اتم ہے۔

جو کہ مصروفِ سلامِ شہدا رہتا ہے گو وہ رہتا نہیں پر نام سدا رہتا ہے
شمر کہتا تھا یہی ماں ہے علی اکبرؑ کی جس کا اک ہاتھ کلیجہ پہ دھرا رہتا ہے
آن کر ہند کی بیٹی نے سکینہؑ سے کہا سر ترا کس لیے اے بہنا کھلا رہتا ہے
رو کے وہ بولی یتیموں کی نشانی ہے یہی کُرتا بن باپ کے بچوں کا پھٹا رہتا ہے

رباعی اور قطعہ میں بھی اپنے کمالات پیش کیے ہیں۔

ہر چند ہزار رنگ عالم بدلے ممکن نہیں تاثیرِ محرّم بدلے
باقی ابھی دعویٰ خوف شبّر کعبہ کیوں کر لباس ماتم بدلے

کلام کی ضخامت میں دبیرؔ یکتا و لاثانی ہیں۔ ان کی عالی ظرفی کی بہترین مثال ہے وہ سلام ہے جو انھوں نے اپنے مدِّ مقابل معاصر محترم میر انیسؔ مرحوم کو بہ طور خراج نظم کیا تھا۔ جس کا آخری شعر زندہ جاوید ہوگیا۔

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طورِ سینا بے کلیم اللہؐ منبر بے انیسؔ

۶/مارچ ۱۸۷۵ء کو ۷۲ سال کی عمر میں یہ بُلبلِ خوش نوا ہمشیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ سچ ہے رہے نام اللہ کا۔

دبیرؔ کی جمالیاتی جدلیات

محمد علی ظاہر

انسان فطرتاً حسن پسند ہے اور ہر چیز میں معیارِ حُسن قائم کرنے کا عادی ہے۔ جملہ فنون لطیفہ احساسِ حُسن کے ہی گرد گھومتے ہیں۔ ادب میں جمالیاتی تنقید کا نظریہ اسی متعلق بحث کرتا ہے کہ ادب کا مقصد اخلاقیات کی تعلیم دینا ہرگز نہیں بلکہ بذاتِ خود ایک فن پارے سے قاری یا ناظر کو جمالیاتی تجربہ فراہم کرنا ہے۔ جمالیاتی تجربہ کیا ہے؟ تنقیدی اصطلاحات کی پیچیدگیوں سے بحث کیے بغیر ہم اسے اپنے مضمون کے تناظر میں یوں واضح کریں گے کہ یہ کسی بھی فن پارے کے مشاہدے یا مطالعے سے حاصل ہونے والا احساس ہے! مثلاً جب آپ کسی سبزہ زار میں شام کے وقت گلابی بادلوں کی اوٹ میں چھپے پہاڑ کی چوٹی پر کسی ریوڑ کو چرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وجود یک گونہ طمانیت محسوس کرتا ہے۔ اس مثال میں یہ احساس بصری حِس سے حاصل ہوا ہے اب اگر آپ بذاتِ خود اس پُرفضا مقام پہ موجود ہوں تو بصری احساس کے ساتھ ساتھ تنفس اور مشام بھی یہ جمالیاتی تجربہ فراہم کرنے کے آلات میں شامل ہو جائیں گے، اور اگلے مرحلے میں اگر وہاں آپ کسی پھول کی نرم پتی کو چھو لیں اور ساتھ ہی کچھ خوش گلو پرندوں کا گیت بھی سنائی دے رہا ہو تو اب اس جمالیاتی تجربے کو آپ تک پہنچانے میں حسِ لمس اور سماعت بھی کارفرما ہو جائے گی۔ یہاں تک تو بات پانچ حسوں تک محدود رہی۔ لیکن کیا یہ تجربہ محض حواسِ خمسہ کے مرہونِ منت ہے؟ یا اس کی تاثیر سے فیض یاب ہونے کا کوئی اور طریقہ بھی ہے؟

فرض کیجے کہ آپ ایک ریاضی دان ہیں اور کوئی مشکل مسئلہ حل کر رہے ہیں اور کسی نکتے پہ پھنس کے رہ گئے ہیں۔ اچانک آپ کے دماغ کی بتی جلتی ہے اور آپ مسئلے کی نوعیت سمجھ جاتے ہیں اور گھنٹے دو گھنٹے سے رکا ہوا سوال پل بھر میں حل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ جس انکشافی کیفیت سے گزرے اور مسئلے کے حل تک پہنچنے کے بعد جو احساس مسرت آپ کے ساغرِ وجود کو لبریز کر گیا، یہ بھی اپنی طرز کا ایک جمالیاتی تجربہ ہی تو ہے۔ حُسن کی سو شکلیں ہو سکتی ہیں اور ہزار طرح سے حُسن ہمیں متاثر کر سکتا ہے۔

ادب اور بالخصوص شاعری کی بات کی جائے تو یہاں لفظوں کی محدود فضا میں رہتے ہوئے نہ صرف حواسِ خمسہ بلکہ وہم و تعقل کو بھی متاثر کرنے کا معاملہ ہے۔ کبھی لفظ تصویر دکھا کر بصری احساس کے پردے سے جمالیاتی تجربہ فراہم کرتے ہیں، کبھی صوتی آہنگ سے، اور کبھی تخیل میں لمس و شامہ و ذائقہ کا احساس پیدا کر کے۔ شاعری کا فن شاید واحد فن ہے جو اپنے اندر تمام حواس کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن شاعری کا اصل کام ان حواس کو متاثر کرنا نہیں بلکہ جمالیاتی تجربہ فراہم کرنا ہے بھلے وہ احساس کی سطح پہ ہو یا تعقل کی سطح پہ، البتہ جمالیاتی تجربہ اپنا اظہاری اعلان وجود میں جذبہ و احساس کی لطیف گھلاوٹ کے ذریعے ہی کرتا ہے۔ یعنی اگر آپ ایک فن پارے کے مشاہدے یا مطالعے کے بعد اپنے جذبات میں کچھ ارتعاش محسوس کرتے ہیں، بھلے وہ سست رو لہروں کی صورت میں اٹھے یا ایک طوفان بپا کر

دے،تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس فن پارے کے حُسن کو محسوس کر پائے ہیں۔

ادب برائے ادب کا نعرہ جتنا بدنام ہے درحقیقت اتنا برا نہیں۔ یورپ میں یہ ادب میں اخلاقیات کے پرچار کے ردعمل کے طور پہ سامنے آیا تھا۔ ہمارے یہاں صنف مرثیہ کو عموماً مقصدی ادب کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے، حالی نے بھی صنف مرثیہ کی اس لیے تعریف کی کہ اس میں اخلاقی مضامین کی بھرپور گنجائش موجود ہے، تاہم اگر لکھنؤ کے مرثیہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے ان قلمکاروں کی توجہ اخلاقی و مذہبی تعلیم کی طرف نہیں بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا تخلیقی شہکار پیش کرنے کی طرف ہے۔

بطور خاص مرزا دبیرؔ وہ شاعر ہیں جن کے مرثیوں میں جا بجا جمالیاتی تجربہ اور احساسِ حُسن نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرزا دبیرؔ کو اس بات پہ اصرار ہے کہ ان کے مرثیے سننے یا پڑھنے والے لطیف سطح کے احساسِ جمال سے گزریں، مثلاً جب وہ کہتے ہیں کہ

بینی کو کہوں شمع تو لو اس کی کہاں ہے — پُرنور بھنوؤں پر مجھے شعلے کا گماں ہے
دو شعلے اور اک شمع یہ حیرت کا مکاں ہے — ہاں زلفوں کے کوچے سے ہوا تند رواں ہے
سمجھو نہ بھنویں بس کہ ہوا کا جو گزر ہے — یہ شمع کی لو گاہ ادھر گاہ ادھر ہے

تو قاری ایک متحرک بصری مکاشفے کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ بینی کی شمع، جس کا شعلہ ہوا کے باعث پھڑک کر دو بھنوؤں کی صورت اختیار کر رہا ہے،،،، یہاں شمع، شعلہ اور ہوا جہاں حواس کے ذریعے حُسن کا احساس پیدا کر رہے ہیں وہیں قاری کو ایک عقلی مشقت کر کے ان تشبیہوں اور استعاروں کے باہمی تعلق کی گتھی کو بھی سلجھانا پڑ رہا ہے، گویا حُسن کا احساس دو آتشہ ہے، ایک ظاہری حواس سے محسوس کیا گیا اور دوسرا عقل کے ذریعے درک کیا گیا۔ حواسِ ظاہری اور عقل کی باہمی جستجو سے اس منظر کو اپنے تخیل میں شکل دینے پر قاری حُسن کی ایک ایسی جہت کو دریافت کرتا ہے جسے وہ اس سے قبل محسوس نہیں کر پایا تھا۔

دبیرؔ کے یہاں مضمون آفرینی بنیادی طور پہ جمالیاتی تجربے کے دروازے کا کام کرتی ہے، جسے کھولنے پر ہر دفعہ ایک نیا حسن روبرو نظر آتا ہے،،، بعض اوقات وہ اس تجربے تک قاری کو پہنچانے کے لیے غیر شعوری طور پر ڈی فیمیلیئر ازیشن (defamiliarization) کی تکنیک بھی استعمال کر جاتے ہیں،،،،

ڈی فیمیلیئر ازیشن ایک روسی نقاد کا ادبی تصور ہے جس کا مقصد عام اور مانوس اشیا کو ایک نئے اور منفرد انداز میں پیش کرنا ہے جس سے قاری ایک اچھوتا پن محسوس کر سکے،

مثلاً دبیرؔ کا یہ بند دیکھیے

دینارِ تیغ رونقِ بازار ہو گیا — نادار اس کے چلنے سے زردار ہو گیا
اور دور مفلسی کا سب آزار ہو گیا — یہ آبِ تیغ شربتِ دینار ہو گیا
صد پارہ رن میں قابلِ ہر بے دریغ تھا — اس عہد میں یہ خوردۂ دینارِ تیغ تھا

دینار، تلوار، شربتِ دینار یہ تمام چیزیں عام زندگی میں طے شدہ مفہوم رکھتی ہیں، شربتِ دینار حکمت کی اصطلاح میں ایک شفا بخش مشروب کا نام ہے،،، یہاں دبیر نے مانوس اصطلاحات کو ایک نئے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے،،، درہم و دینار کا حصول عمومی زندگی میں ایک غریب انسان کو ثروت مند بناتا ہے، یہ عام بات ہے، لیکن دینارِ تیغ کے چلنے سے وہ مانوس فضا ایک نئے معنی میں بدل گئی، تلوار کا چلنا تو

مقابل آنے والے کے لیے موت کا پیغام ہے، یعنی جس پہ تلوار چلے گی اس سے نقدِ جاں چھین لے گی، مگر دبیرؔ کہہ رہے ہیں کہ نادار اس کے چلنے سے زردار ہو گیا، یہ تضاد یہ کیفیت ایک عجب طرح کا جمالیاتی پیراڈاکس پیدا کرتی ہے، بیماری کے لیے دوا استعمال ہوتی ہے، یہ پھر عام بات ہے لیکن مفلسی کی بیماری کو دور کرنے کے لیے تلوار کا پانی شربتِ دینار کی صورت میں ظاہر ہو تو؟ دوا یا سیرپ عموماً کوئی محلول ہوتا ہے اور تلوار کی چمک کے لیے آب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یوں آب اور شربت کی رعایت سے آبِ تیغ کو شربتِ دینار بنا کر پیش کرنے کا عمل جہاں چونکا دینے والا ہے وہیں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ مفلسی کے آزار میں مبتلا تو فوجِ اشقیا کو کہا گیا ہے، اور تلوار حضرت عباسؑ کی ہے جو ان کے اس آزار کو دور کر رہی ہے، یعنی تلوار جو موت کی پیغامبر ہے ایک طرح سے مسیحا کا کردار ادا کر رہی ہے،،،، یہ بیان کا انعکاس ہے، جو مطلوبہ معنی کو متضاد کیفیت سے واضح کر رہا ہے، درحقیقت تو تلوار موت کے گھاٹ اتار رہی ہے لیکن شاعر کہہ رہے ہیں کہ آزار سے نجات دے رہی ہے، کیونکہ ان احساسات سے ذوقِ سلیم مانوس نہیں تھا لہذا ان کی دریافت کا عمل قاری کے ذہن میں مروجہ سانچوں کو توڑ پھوڑ کر ایک نئی شکل پیدا کرتا ہے، بیت میں بطور خاص حیرت انگیزی کا عمل ہے۔ بڑی کرنسی کو توڑانا معمول کی بات ہے۔ ہم دکان پہ جاتے ہیں اور ۱۰۰۰ کا نوٹ دے کر ۲ عدد ۵۰۰ کے نوٹ حاصل کر لیتے ہیں، یا ۱۰۰ روپے کے دس نوٹ حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہی کرنسی جب تلوار اور کٹے ہوئے اعضا کی صورت میں شاعری میں ڈھلی تو اب قاری ایک نئے جمال کو محسوس کرنے لگا کہ تلوار ایک دینار ہے اور اس کا بھانج یا ٹوٹے ہوئے پیسے دشمنوں کے بدن کے وہ اعضا ہیں جو میدان میں کٹے ہوئے پڑے ہیں۔

میرے نزدیک دبیرؔ کی شاعری کا بڑا حصہ دراصل حُسن کے احساس کو نیا کر دینے پہ مائل نظر آتا ہے،،،، وہ ایک ہی موضوع کو متعدد بار لکھتے ہیں تو ہر دفعہ ایک نئی کائنات تشکیل دیتے ہیں،،،،، ان کا تخلیقی ذہن شاید نئے سے نئے حسن کے احساس کو اپنی گرفت میں لانا چاہتا ہے،،،،، وہ جمال پسند شاعر ہیں اور اس کے لیے وہ چیزوں کو ویسا نہیں دکھاتے جیسی وہ فطرتاً ہیں بلکہ اپنے تخیل کے زمان و مکان میں انھیں از سرِ نو ترتیب دے کر قاری تک منتقل کرتے ہیں، مثلاً صبح کا منظر اپنے فطری انداز میں بہت ہی چابک دستی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ دیگر مرثیہ نگاروں کے یہاں اکثر پایا جاتا ہے، مگر دبیر صبح کے منظر کو بھی نہایت پیچیدہ استعاروں کا نظام تشکیل دے کر بیان کرتے ہیں:

روزِ سفید ، یوسفِ آفاقِ شب نقاب — مغرب کی چاہ میں تھا جو پابندِ اضطراب
سقّائے آسماں نے لیا دلوِ آفتاب — جس میں رسن شعاع کی باندھی بہ آب و تاب
یوسفؑ کو دلوِ مہر میں بٹھلا کے چاہ سے — کھینچا شعاعِ شرق میں مغرب کی راہ سے

پہلے پہل اس بند کو پڑھ کے یہ خاکہ بنتا ہے کہ کنویں سے پانی بھرنے کا منظر بیان ہوا ہے، پھر حضرت یوسفؑ اور کنویں کی تلمیح کی معلومات ہمیں مدد فراہم کرتی ہیں کہ کنویں میں ڈالے گئے ڈول سے لٹک کر اندر قید فرد کو باہر کھینچا گیا ہے، یہ متحرک تصویری خاکہ مکمل ہونے پر ذہن اب اس میں کرداروں کو مشخص کرتا ہے کہ کنویں سے نکالا جانے والا یوسف دراصل "دن" ہے، چونکہ ڈول بلندی سے کنویں کی گہرائی میں پھینکا جاتا ہے اور آسمان بلند ہے لہذا آسمان کو سقے کے طور سے عقل تسلیم کر لیتی ہے، ڈول چونکہ سورج کی طرح گول ہوتا ہے، اس مشابہت سے یہ تشبیہ بھی واضح ہو جاتی ہے، اور شعاع چونکہ رسی کی طرح ہوتی ہے لہٰذا سورج کے ڈول سے شعاع کی بندھی ہوئی رسی بصری طور پہ خوبصورتی کا احساس پیدا کرتی ہے، نیز ڈول کا پھینکا جانا حرکت کا خواہاں ہے سو یہ بصری تصویر متحرک ہو کر کسی فلم کی طرح ذہنی منظر نامے پہ چلنے لگتی ہے، ڈول پھینکنے میں وہ ہلکی سی آواز بھی کانوں تک خود بخود پہنچ جاتی ہے جسے کسی مصرعے میں سنوایا ہی نہیں گیا، اس کے ساتھ رسی کے

ہاتھ میں تھامنے سے لمس کا احساس بھی ہونے لگتا ہے، بصارت، سماعت اور لمس کے حواس واضح ہونے سے طبیعت کو حاصل ہونے والے جمالیاتی حظ کے ساتھ ساتھ بیک وقت قاری کسی ریاضیاتی مسئلے کو سلجھانے کی عقلی مشقت کی طرح دن، شب نقاب، مغرب کے کنویں، سورج کے ڈول اور شعاع کی رسی کے باہمی تعلق کا تانا بانا جوڑتے ہوئے ایک تعقلی ریاضت سے بھی گزرتا ہے۔ یہ عمل اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے اس بند سے حاصل ہونے والا لطف حواس کا مرہون منت ہے یا تعقل کا۔ البتہ اس پورے عمل کے نتیجے میں ایک حیرت زدگی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے، یہ حُسن کی ایسی فنی پیشکش ہے جو خارجی سبجیکٹ میٹر (subject matter) کو ادراک کی داخلی فضا میں ری-کریئیٹ (recreate) کرنے کے مترادف ہے۔ عموماً دبیر کے دوراز کار مضامین کو ان کے منفی پہلو کے طور سے دیکھا جاتا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس پورے عمل سے حاصل ہونے والا حظ ہی دراصل اس طرز کی شاعری کی کامیابی ہے۔

آرٹ کی خوبی ہے کہ متاثر کرتا ہے، اب یہ اثر نشاط کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور حزن وملال کی صورت میں بھی۔ اسی طرح خوشی اور غم کی ذیلی کیفیات بھی اسکی تاثیر میں شامل ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک شعر پڑھتے ہی آپ اداس ہوجاتے ہیں؟ اور ایک ترانہ سنتے ہی وجود میں سنسنی سی دوڑنے لگتی ہے، جب یہ بات طے ہے کہ آرٹ کی کوئی بھی صورت ہو وجود پہ اثر چھوڑے گی تو صنفِ مرثیہ کے بارے میں ایک لگا بندھا سا خیال ذہن میں یہ ابھرتا ہے کہ چونکہ اس کا تعلق حزن سے ہے لہٰذا مرثیہ کا آرٹ یہ ہوگا کہ یہ غم کی کیفیت طاری کردے۔ لیکن یہ کلیشے اس وقت ٹوٹ جاتا ہے جب ہم مرثیے میں کہیں قصیدے کا جاہ وجلال دیکھتے ہیں، کہیں غزل کی سی اداس فضا، کہیں نوحہ اور بین کی غمگین بانسری سے نکلنے والی سوگ لہریں، کہیں عرفان ومعرفت سے لبریز پراسراریت اور انکشاف سے معمور نغمے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ایک نکتہ جو ہم اس مضمون میں اٹھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مرثیہ میں دبیرؔ کا آرٹ ایک سے زائد ڈائمنشنز رکھتا ہے، یا ایک سے زائد تاثیریں رکھتا ہے۔ منطقی طور پہ تو ہونا یوں چاہیے کہ اگر مرثیہ میں فضائل کا جزو ہو تو اس سے ایسی کیفیت پیدا ہو کہ سننے پڑھنے والے واہ واہ کر اٹھیں، اور اگر مصائب کا بیان ہو تو مجمع کو رلا ڈالے، اور ایسا ہوتا بھی ہے، یہ خوبی دبیرؔ ہوں یا دیگر مرثیہ نگار سب میں مشترک ہے۔ دبیرؔ کے فن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ جس حُسن کا نمونہ اپنے مرثیے میں پیش کرتے ہیں وہ بیک وقت اپنے ناظر کو مسرور بھی کر رہا ہوتا ہے اور مغموم بھی۔ اس خوبی کو دبیرؔ کا امتیاز کہنے سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ دیگر مرثیہ گویوں کے یہاں ایسی تکنیک نہیں ملتی، یہ کسی شاعر سے زیادہ مرثیہ کا بطور صنف اور کربلا کا بطور واقعہ اختصاص ہے کہ اس میں ٹریجڈی اور کامیڈی بعض مقامات پر یکجا ہوجاتے ہیں۔ البتہ خاکسار نے اپنے مطالعے میں یہ بات ضرور محسوس کی کہ دبیرؔ کے یہاں یہ معاملہ بہت اہتمام سے ملتا ہے۔ مثلاً امام حسین علیہ السلام کے سراپا سے ایک مثال دیکھیے جس میں فضائل و مصائب یکجا ہوگئے ہیں:

لب قفلِ درِ مخزنِ اعجاز و کرامت — پر کھولے گئے چوب سے وہ بعدِ شہادت
گیسو تھے کہ شیرازۂ اجزائے شریعت — پر ان کی پریشانی تھی دلجمعیٔ امت
تھی ان کو غرض عقدہ کشائیِ جہاں سے — موجود تھے بندھنے کے لیے چوبِ سناں سے

یہ ثنویت یا تضاد بعض اوقات تو ایک شعوری کاوش کے طور پہ ان کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک عام قاری یا سامع کو اس کی متوقع رثائی جدلیات کے برعکس دوہری یا تہری تاثیرِ حیرت سے دوچار کردیتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دبیرؔ مجمع کی سخن فہمی کے لحاظ سے ایک بہت تگڑے ماہرِ نفسیات بھی تھے۔ اور ان کی یہ نباضی محض مجمع کی عمومی نفسیات کو جان کر اس کے مطابق اپنے فن پارے کو مفید بنانے تک

محدود نہ تھی بلکہ وہ رسک لینے کا جگرا رکھتے تھے۔یعنی عین فضائل میں جب سامع واہ واہ کے عرش کی جانب محوِ پرواز ہو عین مصائب کا نکتہ نکال لینا جو اس کے جذبۂ مسرت کو نکتۂ عروج تک پہنچنے ہی نہ دے اور عین مصائب میں جب سامع آمادہ ءگریہ ہو چکا ہو، فضائل کا ایسا نکتہ بیان کر دینا کہ غم کا جذبہ اپنی تکمیل تک پہنچنے ہی نہ پائے!

مثلاً شامِ غریباں میدانِ کربلا میں بے کفن لاشوں کا منظر ایسا منظر ہے جسے سوچتے ہی قاری آمادہ ءگریہ ہونے لگتا ہے اور حزن و بکا کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے جسے نشاطیہ کیفیت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں لیکن اس مقام پر دبیرؔ نے خلافِ توقع ان سر بریدہ بے کفن لاشوں کی عظمت کو یوں اجاگر کیا ہے کہ بجائے آہ کے، بے ساختہ واہ کہنے کو جی چاہتا ہے، اور اس حزنیہ حصّے میں بیانِ فضائل کی نشاطیہ لہر اثر دکھانے لگتی ہے، یہ بند اس پس منظر کے ساتھ ہے کہ مقتل میں امامؑ اور آپ کے انصار کے لاشے بے کفنی و سر بریدگی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں:

خورشید صبح سے تھا نگہبان تا بہ شام — شب کو حوالے ماہ کے تھا مہر کا یہ کام
حاضر مقرّبانِ حریمِ خدا تمام — کہتا تھا الصلاۃ کوئی ، کوئی والسلام
لاشے تھے یا کہ نور کے وہ سب چراغ تھے — زہراؑ کے لال سب گہرِ شب چراغ تھے

اسی طرح کی ایک مثال اور بھی دیکھیے، یہ وہ مقام ہے کہ بعد از واقعۂ عاشورہ اہلبیتؑ کو اسیر کر لیا گیا ہے، خواتینِ اہلبیتؑ کی اسیری اور چادروں کا چھین لیا جانا، ایسا رقت انگریز باب ہے جس کی تاثیرِ غم سے کوئی آنکھ اشکبار نہیں ہوگی، لیکن دبیرؔ نے اس مقام پہ بے ردائی سے رلانے کا کام نہیں لیا بلکہ فضائل و اسرار اجاگر کیے ہیں، جن سے سامع رونے کی جگہ واہ واہ کر اٹھے تو عجب نہیں:

کیوں کر کہوں کہ آلِؑ پیمبرؐ ہیں بے ردا — سر کھلنے سے چھپا ہوا رتبہ مگر کھلا
احسانِ چادر ان کے سروں سے نہ اٹھ سکا — سر پر ردا نہیں ہے تو ہے سایۂ خدا
کچھ رب سے دور یہ نہیں ، دور ان سے رب نہیں — چادر کا پردہ بیچ میں تھا وہ بھی اب نہیں

اس طرح سامع یا قاری کو احساسِ مسرت و ملال کے مابین معلق چھوڑ دینے سے ان دونوں جذبات کا نکتۂ عروج پہلے سے زیادہ بلندی پہ چلا جاتا ہے۔ کتھارسس کا عمل مکمل نہ ہونے سے تشنگی باقی رہ جاتی ہے، سامع کے اندر جذبات کا ایک تلاطم موجزن رہتا ہے، یہ ایسا تلاطم نہیں جو اپنی شدت کو پہنچ چکا ہو، کیونکہ اگر شدت کو پہنچ گیا تو اس کے بعد تھم جائے گا، اب یہ احساسِ مسرت یا احساسِ غم اپنی تکمیل چاہتا ہے مگر تکمیل ہو نہیں پاتی، اور اس منقلبیِ احساس کے عمل پہ جب تعقل غور کرتا ہے تو ایک بالکل الگ قسم کا جمالیاتی حظ حاصل کرتا ہے۔ گویا ایک سے زیادہ ذائقے بیک وقت زبانِ طبع پہ جمع ہو جاتے ہیں جو محض احساس کے مختلف رنگوں کی دھنک ہی نہیں سجاتے بلکہ فکر کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ قاری یا سامع ایک جامد جذباتی فضا میں قید نہیں رہتا نہیں رہتا بلکہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے، ایک متحرک جمالیاتی تجربے کا ادراک کرتا ہے۔ دبیرؔ کا فن قاری کو محض جذباتی تسکین نہیں پہنچاتا بلکہ اسے سوچنے، محسوس کرنے اور اشیا کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

❁❁❁❁

اُردو مرثیے پر مرزا دبیرؔ کے احسانات

پروفیسر علی عرفان

یہ بات اب متفقہ طور پر سامنے آ رہی ہے کہ شبلیؔ نعمانی نے اپنی کتاب موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ بہت رواروی میں تحریر کی۔ میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میر انیسؔ کے اعلیٰ کلام کے سامنے مرزا دبیرؔ کے پست کلام کو رکھ کر مرزا دبیرؔ کی صلاحیتوں سے منھ موڑنے کی کوشش کی گئی۔ اگر اس زاویہ سے شبلیؔ نعمانی کو دیکھا جائے تو کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ میر انیسؔ نے مرثیے اس وقت تحریر کرنا شروع کیئے جب مرزا دبیرؔ کو شاعری میں استادی کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے ہمعصروں میں کوئی بھی اس وقت مرثیے میں ان سے آگے نظر نہیں آتا تھا۔ اگر اس وقت کوئی مرثیے لکھ بھی رہا تھا تو اس کی یہاں مرثیہ ثانوی حیثیت کا درجہ رکھتا تھا۔ لیکن مرزا دبیرؔ نے جس وقت شعر و ادب کے چمنستان میں قدم رکھا اس وقت مرثیے سے قبل اپنی شعری اور نثری صلاحیتوں کا آغاز غزل ''قصائد'' رباعیات، سلام مثنوی، تاریخی گوئی، ابواب المصائب (نثر) اور بقول مرزا محمد زماں آزردہ رسالۂ دبیر (نثر) کی شکل میں کر چکے تھے۔ اگر مرزا دبیر چاہتے تو اوروں کی طرح نظم میں غزل، رباعی، مثنوی اور قصیدہ جیسی اصناف کی آبیاری میں عمر بسر کر سکتے تھے یا روضۃ الشہداء کی طرح نثر میں ابواب المصائب جیسی چیزیں تحریر کر کے اپنا نام پیدا کر سکتے تھے یا پھر رسالۂ دبیرؔ کو مزید وسعت دے کر اپنی تنقیدی بصیرت کی مہر لگا سکتے تھے۔ نثر میں فقط رسالۂ دبیرؔ ہی ادب میں ان کی بقا کی ضمانت ہوتا۔ مرزا محمد زماں آزردہ فرماتے ہیں کہ: ''اس رسالے کا موضوع مرثیے کے موضوع اور ہیئت سے متعلق ہے جس پر مرزا دبیرؔ نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور واضح دلائل کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہ رسالہ مرزا دبیرؔ کے تنقیدی شعور کے مطالعے میں معاون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے قدماء کے طریقۂ کار کا احترام کرتے ہوئے دلیل کے طور پر شعرائے فارسی سے مثالیں پیش کی ہیں لیکن ان کے نزدیک صرف شعرائے فارسی کا تتبّع کافی نہیں ہے۔ انہوں نے نہ صرف دیگر مرثیہ گویوں کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں بلکہ بڑی فراخدلی سے اپنے ہمعصر اور معروف مرثیہ گویوں کا کلام بھی پیش کیا۔ جس سے ان کی وسعتِ ذہن و فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔۔۔ مدِ نظر رہے کہ اس دور میں مرثیے کے فنی معیاروں پر زبان و بیان کے مختلف مباحث زیرِ بحث تھے جن پر اس دور کے کئی اساتذہ نے رسالے تحریر کیے۔ ان میں رسالہ میر عشقؔ کا ذکر ڈاکٹر جعفر رضا نے کیا ہے اور اس کی تفصیل پیش کی ہے۔۔۔ لیکن اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ میر عشقؔ نے اپنے رسالے میں صحتِ زبان، متروکاتِ محاورات اور عروض و بیان کے مسائل پر بحث کرنے پر اکتفا کی ہے جبکہ مرزا دبیرؔ نے ان تمام مباحث پر بھی نتیجہ خیز اور پُر مغز بیانات پیش کیے ہیں۔

(مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات اور کارنامے از مرزا محمد زماں آزردہؔ صفحہ ۴۲۹، ۴۲۷)

لیکن ان جملہ اصناف کو ترک کر کے خالصتاً رثائی ادب یعنی مرثیے اور سلام کی طرف رخ کرنا ایک طرف جہاں دنیا والوں کو یہ پیغام دیتا

ہے کہ فنکار اگر بڑا ہو تو وہ کسی بھی صنف میں قدم رکھے گا تو اس صنف کا معیار اور وقار بھی بلند و بالا کر دے گا۔ اور دوسری طرف وہ زمانے کو یہ درس بھی دینا چاہتے تھے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے سچی محبت اور عقیدت کا اظہار ہی زندگی ہے۔ جو شخص درِ آلِ محمدؐ پر سر جھکائے گا اس کی عظمت میں اضافہ ہی ہوگا کمی نہیں آسکتی۔ انہیں شہرت و عزت دنیا والوں سے نہیں بلکہ آلِ محمدؐ کی مدح سرائی سے چاہیئے تھی۔ اور یہ دنیا والوں نے دیکھ بھی لیا کہ مرثیے کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو مرزا دبیرؔ کا ذکر بھی آتا ہے۔ دبیرؔ کے بغیر مرثیہ ادھورا رہتا ہے۔ مرزا محمد زماں آزردہؔ اپنی کتاب میں ایک مقام پر لکھتے ہیں: ''ان کی رباعیاں، غزلوں، قصیدوں، مثنویوں، سلاموں یہاں تک کہ نثری کارناموں کا تجزیہ کیا جا چکا ہے لیکن خصوصیت سے جو صنفِ سخن ان کی جولانی طبع اور خلاقیِ مضامین سے اتنی زیادہ بلند و آسودہ ہوئی کہ وہ اس کی آب و تاب کا مظہر ہے، اردو مرثیے ہیں جن میں ان کے طرزِ سخن کا ثانی ہنوز پیدا نہ ہو سکا۔ (مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات اور کارنامے از مرزا محمد زماں آزردہؔ صفحہ ۵۲۱)

اس مقام پر یہ بات کہے نہیں رہی جاتی کہ مرزا دبیرؔ کے خاندان سے لیکر ان کے فن تک کو اپنے تنقید کا ہدف بنایا۔ بہت سے لوگوں نے بہت سی گفتگو کیں ہیں۔ یعنی کسی نے انہیں نومسلم لکھ دیا تو کسی نے انہیں ہندو نژاد کہہ دیا اور فن پر ادق و ثقالت اور عربی و فارسی کے ناموس الفاظ کے استعمال کا الزام دھر دیا۔ حالانکہ زماں آزردہ لکھتے ہیں کہ:

''مرزا دبیرؔ صاحب مسلمان تھے اور اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اہلِ بیتِ رسولؐ سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ ساری عمر اس خاندان کی مدح کی یا اس کے مصائب پر روتے اور رلاتے رہے۔'' (مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات اور کارنامے از مرزا محمد زماں آزردہ صفحہ ۶۲)

اسی طرح آزردہ مزید فرماتے ہیں کہ؛

''مرزا دبیرؔ صاحب عربی اور فارسی زبان و ادب پر قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ گفتگو میں اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔ عام طور پہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص مختلف زبانوں اور مختلف علوم سے واقف ہو تو وہ غیر شعوری طور پر بھی بات چیت میں ان کے حوالے دیتا ہے یا ان کے الفاظ استعمال کرتا ہے یا ان علوم کی اصطلاحوں کو برتتا ہے۔'' (مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات اور کارنامے از مرزا محمد زماں آزردہ صفحہ ۷۲)

لیکن مرزا دبیرؔ دجلۂ عشقِ آلِ محمدؐ میں غرق تھے اور شاعری بالخصوص مرثیے کے انتخاب میں پختہ شعور کے مالک بھی تھے۔ اور تینوں زبان پر عبور بھی رکھتے تھے۔ اس لیے جہاں غالبؔ جیسا عظیم شاعر کو عمر بھر اردو زبان میں شاعری کرنا بے رنگ معلوم ہوتا رہا وہاں مرزا دبیرؔ عربی و فارسی اور اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ایک پل کے لیے بھی اردو زبان میں مرثیہ لکھنے پر شرمندگی محسوس نہیں کی کیونکہ مرزا دبیرؔ کو یقینِ کامل تھا کہ یہی وہ صنف ہے اور یہی وہ زبان ہے جو انہیں ہمیشہ کے لیے زندہ و پائندہ رکھے گی۔

میر انیسؔ ہوں یا مرزا دبیرؔ یہ دونوں اردو مرثیے کی بلند قامت شخصیت ہیں۔ دونوں حضرات نے اپنے اپنے افکار سے اردو مرثیے کی ہیئت موضوعات اور زبان و تکنیک کے روز نئے نئے اتنے تنوع پیدا کیے کہ ان کے بعد کے مرثیہ نگاروں کو ابتک نادیدہ پہلوؤں کی تلاش ہے۔ غالباً یہی بات تھی کہ خاکسار نے جب ایک شاعر سے مرثیے لکھنے کے لیے اصرار کیا تو اس شاعر نے برجستہ یہ کہہ اُٹھا کہ انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیے پر طبع آزمائی کرنے کے لیے کچھ چھوڑا ہو تو کچھ کہا اور لکھا جائے۔ یہ عاجزی صرف موجودہ دور کے شعراء کے یہاں نہیں ملتی بلکہ قدماء کے بھی نظر آتی ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد آج اگر کوئی مرثیہ لکھ رہا ہے تو وہ اس راہ پر چہل قدمی کر رہا ہے جو میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ نے بنائے ہیں یا پھر جدید

مرثیے کے نام پر مرثیہ نما نظم صفحۂ قرطاس پر لانے کی کوشش کر رہا ہے اور عوام میں یہ مقبول نہیں ہے۔ میر انیسؔ کے ساتھ ساتھ مرزا سلامت علی دبیرؔ کا ہماری اردو زبان، شاعری، تہذیب و ثقافت اور مذہب پر یہ احسان کہ انہوں نے مرثیے کے حوالے سے جو کچھ پیش کیا ہے اس سے ہماری زبان، شاعری، تہذیب و ثقافت اور مذہب کا دامن مالا مال ہوا ہے بلکہ اس میں دم خم بھی پیدا ہو گیا ہے۔ بڑی سے بڑی زبان، شاعری، تہذیب، اخلاق اور مذہب سے آنکھ سے آنکھ ملا کر گفتگو کر سکتی ہے۔ ان کی شاعری اردو میں معجزہ کی سی تاثیر رکھتی۔ اردو شاعری کی شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو جسے مرثیے کے برابر ہر عمر کے لوگ اور ہر گھر میں پڑھا جاتا ہو اور جو ہمارے اخلاق کی درستگی اور روح کی تسکین کا سبب قرار پائے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات کے صفحہ ۵۴۶ پر کیا خوب کہا ہے:

''یہ پاک روحیں جن کی بدولت ہماری نظم کو قوت اور زبان کو وسعت حاصل ہوئی۔ صلہ ان کا سخن آفرینِ حقیقی عطا کرے۔ ہمارے شکریہ کی کیا بساط۔''

جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس میں کہہ چکا ہوں کہ میر انیسؔ ہوں یا مرزا دبیرؔ دونوں نے ہی اپنی زبان، اپنے موضوع اور اپنی تکنیک کی مدد سے اردو شاعری بالخصوص رثائی ادب کو دیگر بڑی زبانوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کے قابل بنا دیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اپنی کور بینی سے ان دونوں میں سے کسی ایک کو بغیر مستحکم استدلال کے بہتر و افضل قرار دیتا ہے جیسا کہ شبلیؔ نعمانی نے موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ میں کیا ہے تو اسے آنے والا زمانہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ چنانچہ عابد علی عابد کا یہ سخت جملہ صحیح ہے کہ:

''شبلیؔ نے انیسؔ کے کلام سے بہترین اشعار کا انتخاب کیا ہے اور اس کے مقابلے میں جو شعر دبیرؔ کے درج کیے ہیں وہ دبیر کے دوم درجے کے مرثیوں سے لیے گئے ہیں۔ اگر ایسا قصداً کیا گیا ہے تو یہ انتقادی بد یانتی ہے۔ جس کی سزا اس سے کم نہیں ہو سکتی کہ دوائرِ ادب سے اور حدودِ ذوقِ سلیم سے دیس نکالا دیدیا جائے۔ اگر انتخابِ اشعار میں سوئے نیت کو دخل نہیں ہے تو صورتحال کی قباحت پھر بھی واضح ہے یعنی شبلیؔ نے غفلت برتی ہے اور احتیاط سے دبیرؔ کا کلام نہیں کھنگالا ہے کہ انیسؔ کے کلام سے صحیح موازنہ کیا جا سکے۔''

(موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ: شبلی از سید عابد علی عابد، صفحہ: ۲۷۸ مطبع عالیہ لاہور)

مجھے کہنے دیا جائے کہ تاثراتی تنقید میں ہر ادیب یا ناقد اپنا پیمانہ خود تلاش کرتا ہے جس کی وجہ سے ایسی غلطیاں راہ پاتی ہیں ورنہ میر انیس نے جس خلوص اور ذوق و شوق سے اردو شاعری کو جلا بخشی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وقت و حالات کے تحت اگر مرثیے کا دامن تھام کر اپنے افکار اور اخلاق کو عام نہ کیا ہوتا تو ہمارا معاشرہ اور تہذیب سڑ گل گئی ہوتی۔ اسی کے ہمعصر مرزا دبیرؔ نے میر انیسؔ کے شانہ بہ شانہ اردو مرثیے میں عربی اور فارسی کے الفاظ یا نئے نئے مضامین اور مستعملہ بحروں کے علاوہ بھی چار اور بحروں میں مرثیوں کا اضافہ نہ کیے ہوتے یا مرثیے میں عصری دور کو پیش نہ کیا ہوتا تو مرثیے میں مدح تو ہوتی اور مبکی کیفیت بھی ملتی لیکن عصری روح کو نظم کرنے کی صلاحیت کا پتہ نہ چلتا جو بعد کے جدید مرثیے میں دکھائی دیتا ہے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کو زبان اور فن پر جتنی اچھی قدرت تھی اس کے سلسلے میں ہر کسی کی بات نہیں کرتا بلکہ بڑے اور ان کے ہمعصر ادیبوں کی جو رائے تھی اسے جان کر رشک ہوتا ہے کہ ایسی قابلِ تعریف شخصیت صرف اور صرف عربی و فارسی کے ادق الفاظ کے استعمال یا اپنے

ہمعصر شعراء کی طرح کلام میں فصاحت یعنی کلام میں صفائی حسنِ بیان اور لطفِ محاورہ (جو کے غلط الزام ہے) کے بجائے کلام میں بلاغت یعنی شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور تازگیِ مضامین پر اپنی طاقت صرف کرنے کی وجہ سے اسے فراموش کر دیا جائے مناسب نہیں ہے۔ مرزا دبیر نے مرثیے میں جس جس رنگین، ادق عربی و فارسی اور علمی زبان وندرتِ مضامین کا استعمال کیا ہے وہ اس دور اور علاقے کا تقاضا تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرتے تو مرثیہ کجا خود پر ستم کرتے:

''شوکتِ الفاظ دبیرؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیت کہی جاسکتی ہے۔ انہیں عربی و فارسی پر پورا عبور تھا۔ ان زبانوں کے لفظ ان کا روزمرہ تھے۔ لکھنؤ کے شرفاء میں بھی ان کا رواج تھا۔ اس لیے عالمانہ زبان شرافت کا معیار اور ثقافت کا بڑا جُز بن چکی تھی۔ ایسی صورت میں دبیرؔ کے لیے سہل اور ہلکی پھلکی زبان لکھنا کیسے ممکن تھا۔ سچ تو یوں ہے کہ دبیرؔ اپنے جذبات ایسی ہی زبان میں پیش کر سکتے تھے۔ (اردو مرثیہ از سفارش حسین رضوی، صفحہ-۳۰۷)

لیکن یہ یاد رہے کہ مرزا دبیرؔ نے ناسخؔ کی زبان اور مرزا قتیلؔ کی سی مضمون آفرین اور اپنی عربی و فارسی عبارت سے مرثیے کو ضرور سجایا اور رنگین بنایا تھا مگر مدح کے حصے تک۔ رخصت، شہادت اور بین میں ان کی زبان بالکل بدل جاتی تھی۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ جس کے زبان کی مشکل پسندی کی لوگ دُہائی دیتے ہیں اس کی زبان اتنی سادہ، اثر انگیز اور پُر درد بھی ہے۔ مرزا محمد زماں آزردہ فرماتے ہیں:

''بین کی زبان تو مرزا دبیرؔ کی اس طرح بدل جاتی ہے کہ سننے والے تڑپتے ہیں۔ نالہ وفغاں بلند کیے بغیر نہیں بنتی ہے انسان کا دل رونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب ہی ناقدین اس پر متفق ہیں کہ مرزا دبیرؔ کے مرثیے نہایت مبکی ہوتے ہیں۔''

(مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات اور کارنامے، صفحہ ۲۴۸)

یہاں غالبؔ سے لیکر موجودہ دور کے ادباء اور ناقدین کی آراء سے قطع نظر جو ان حضرات نے مرزا دبیرؔ کے متعلق دی ہے میں یہ کہوں گا کہ مرثیے کی زبان اور مضامین میں وہ اپنے عہد کے دیگر مرثیہ نگاروں سے منفرد، یکتا بلکہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ رثائی ادب کی بیج اگر میرؔ و سوداؔ نے بوئی ہے اور شجر بنانے کا کام میر خلیقؔ اور مرزا ضمیرؔ نے کیا ہے تو اس شجر کو تناور اور ثمر بار کرنے کا سہرا میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کے سر ہے۔ ان میں بھی مرزا دبیرؔ نے غالبؔ کی طرح مرثیے کو بین و ماتم تک محدود نہیں رکھا بلکہ عالم و فاضل اور لکھنوی ہونے کی وجہ سے علمی و فکری عنصر کے ساتھ ساتھ رعنائی، صناعی اور مرصع کاری کے ذریعہ مرثیے کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ بقول ذاکر حسین فاروقی:

''اردو کو فارسی کا ہم پلہ ثابت کرنے کا کارنامہ دبیر ہی نے انجام دیا۔ انہوں نے مدح میں خاقانی و انوری سے ٹکر لی۔ مبالغہ میں ظہیر فاریابی کا پہلو دبایا۔ شکوہ الفاظ و طنطنۂ بیان میں فردوسی کے کمال کا مظاہرہ کیا، اخلاق و موعظت میں سعدی و رومی کی سنت کی تجدید کی، دقت پسندی و مضمون آفرینی میں صائب و بیدل کا مقابلہ کیا اور ان تمام میدانوں میں اپنی پروازِ فکر کے جوہر دکھائے جو اب تک ایرانی سخن آفرینیوں کی جولانگاہ تصور کیے جاتے تھے۔ مرزا صاحب کی مضمون آفرینیوں، صناعیوں اور ژرف نگاریوں نے ہمیں پہلی مرتبہ وہ سرمایۂ شعر و ادب عطا کیا ہے جسے ہم سخن آفرینانِ فارسی کے مقابلے میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔'' (دبستانِ دبیر صفحہ ۱۵۴)

❁❁❁❁

مطالعہ دبیرؔ اور علامہ ضمیر اخترؔ نقوی

سیّد تنویر اختر نقوی

مرزا دبیرؔ جن کی شخصیت صنفِ مرثیہ نگاری میں انتہائی معتبر تصور کی جاتی ہے۔ان کی ولادت ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی کے محلے بلّی ماراں میں ہوئی۔ والد نے سلامت علی نام رکھا۔ وہ سات برس کی عمر میں والد کے ہمراہ دہلی سے لکھنؤ آئے۔ ابتدائی تعلیم اور تربیت کے ساتھ تہذیب نفس کا اہتمام مرزا غلام حسین نے کیا اور انہوں نے بچپن میں ہی محرّم کی مجالس میں مرثیے پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ میر مظفر ضمیرؔ لکھنوی کی شاگردی میں شاعری کا آغاز کیا۔

مولانا محمد حسین آزاد کے مطابق (آبِ حیات) مرزا دبیرؔ کا انتقال ۲۹ محرّم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں ہوا۔انہوں نے اردو ادب میں ایسے انمنٹ نقوش چھوڑے ہیں کہ جب بھی مرثیہ نگاری اور اردو ادب میں خدمات کا ذکر کیا جائے گا مرزا دبیرؔ کا نام ہمیشہ صفِ اوّل میں لکھا جائے گا۔

ناسخؔ اور شعرائے لکھنؤ کی تاریخی خدمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔لیکن ناسخؔ اور آتشؔ نیز ان کے شاگردوں نے زبان و بیان میں تو حُسن پیدا کر دیا لیکن اردو کا ادبی سرمایہ سوائے چند غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں کے کچھ آگے نہ بڑھ سکا جس کی تکمیل میر تقی میرؔ اور ان کے ہم عصروں کے ہاتھوں ہو چکی تھی، ناسخؔ اور آتشؔ نے زبان کے حُسن میں چار چاند ضرور لگا دیئے لیکن شعر و ادب کا دائرہ وسیع کرنے پر کوئی توجہ نہیں کی۔ دہلی میں ذوقؔ کے بعد مومنؔ اور پھر غالبؔ بھی غزل اور قصیدہ تک محدود رہے لیکن عین اسی زمانے میں ایک بہت بڑا شاعر اُبھرا جو اس کمی کو مرثیہ کے نام سے پورا کرنے اور اردو شعر و ادب کا دامن انواع و اقسام کے گلہائے مضامین سے پُر کر دینے کا عظیم المرتبت اور تاریخی کارنامہ انجام دیا۔اس شاعر کو دنیا دبیرؔ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

یوں تو اردو شاعری کی ابتداء میں ہی مرثیہ گوئی کا آغاز ہو گیا تھا۔ یا یوں کہیے کہ اردو مرثیہ سے ہی ہماری زبان کا آغاز ہوا تھا۔مرثیہ اپنے ابتدائی دور میں مقررہ ہیئت نہیں رکھتا تھا۔شعراء کو اختیار تھا کہ وہ مثلث، مربع، مخمس، مسدّس، ترکیب بند غرض جس صورت میں چاہیں مرثیہ لکھیں اور بعد میں شمالی ہند کے شعراء نے مرثیہ کے لیے مسدّس کا انتخاب کر لیا۔سوداؔ نے اس قدیم صنفِ سخن کو نیا آب و رنگ عطا کیا اور جدید مرثیہ کے معمار اوّل قرار پائے۔سوداؔ کے مرثیے حُسن تخیّل، خلوص فکر، شعریت اور لطافت بیان کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی اردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے جہاں ہیئت کا تجربہ کیا وہیں چہرہ، آمد، رزم، مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری کا بھی تجربہ کیا۔ان کے تجربات کی روشنی میں ہی افسردہؔ، گدا، حیدریؔ وغیرہ نے نئی راہیں دریافت کیں یہ سوداؔ کی عظمت فکر کا نتیجہ تھا کہ شمالی ہند کے شعراء میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مرثیہ میں بھی شاعری کا کمال ظاہر کیا جا سکتا ہے۔میر تقی میرؔ نے بھی خاصی تعداد میں مرثیے کہے اور ان دونوں اساتذہ کی

مرثیہ گوئی نے طبقۂ شعراء کی توجہ اس طرف مبذول کی گویا دروازہ کھول دیا جس سے میر ضمیرؔ، دلگیرؔ، فصیحؔ اور میر خلیقؔ بقائے دوام کے دربار میں داخل ہوئے اور لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا چلن عام ہوا۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ نے جس طرزِ جدید کے مرثیے کی بنیاد رکھ دی اس پر مرزا دبیرؔ نے ایک شاندار عمارت تعمیر کی اور دبیرؔ کے دوش بدوش میر انیسؔ نے بھی عمارت کی تزئین و آرائش کا فریضہ انجام دے کر صنف مرثیہ کا ایک رفیع الشان قصر تیار کیا جس کی بلندی، حُسن اور زیبائش پر ہمارا ادب ناز کرتا ہے۔

علّامہ ضمیر اخترؔ نقوی، ''مرزا دبیرؔ کی زندگی اور شاعری'' میں لکھتے ہیں

''مرزا دبیرؔ کی شاعرانہ عظمت کو سب تسلیم کرتے ہیں لیکن تاریخ ادب میں ان کا صحیح مقام بیان کرنے کی کسی نے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ اس کی بڑی وجہ ہے کہ ان کو صرف میر انیسؔ کے مدِ مقابل کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی منزلت اور ان کی خدمات ادب بڑی حد تک ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں''۔

ہم یہاں بعض ناقدین کی آراء مرزا دبیرؔ کی شاعری کے متعلق لکھ کر چند امور کی جانب توجہ مبذول کریں گے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ:

جو مرثیے اوّل اوّل لکھے گئے وہ کم و بیش بیس تیس بند سے بہت زیادہ نہ ہوتے تھے اوان میں مرثیت یا بین کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا۔ مگر چونکہ مرثیہ ایک خاص مضمون کے دائرے میں محدود تھا اور اس کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ لہٰذا متاثرین کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدّت پیدا کریں اور اس کے مضامین میں اضافہ کریں۔ اگرچہ یہ ترقی براہِ راست مرثیے کی ترقی نہ تھی۔ بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہئے تھی اس میں بین اور مرثیت کے ساتھ ساتھ مدح اور فخر و مباہات، رزم و بزم بھی نہایت شدّ و مد کے ساتھ شامل ہوگئی۔ مگر حق یہ ہے کہ اس نئی طرز کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہوگئی۔

شادؔ عظیم آبادی:

میر ضمیرؔ کی تعلیم، مرزا صاحب کی جولانی طبع سب مِل جُل کر مرزا صاحب کے کلام میں چند باتیں لفظاً اور معناً ایسی پختہ طور سے مخلوط ہوگئیں کہ نہ فقط میر انیسؔ کے طرف داروں بلکہ سچے اور صحیح مذاق رکھنے والے اہلِ علم کو بھی گراں ہوگئیں۔ یہی سبب ہوا کہ میر انیسؔ کا کلام پھیلتا گیا اور نوبت یہ پہنچی کہ مرزا صاحب کا نام بھی آتا تو صرف مختصر سے لوگوں کی زبان پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ رفتہ رفتہ کیا ہوگا۔

(۲) بعض مضامین میں خاقانیؔ سے بھی بڑھ گئے ہیں بعض جگہ مبالغہ اور تکلفات میں عرفیؔ سے بڑھ گئے ہیں۔

(۳) مرزا صاحب کے مرثیوں کا جس نے بالاستیعاب ڈوب کر مطالعہ کیا ہے وہی کچھ خوب حکم لگا سکتا ہے کہ انواع و اقسام مضامین کا کس قدر ذخیرہ ہے۔ انسان کیسا ہی کامل کیوں نہ ہوجائے مگر پھر بھی کم و بیش کمزوری اور نقص سے خالی نہیں ہے۔ ایک کے کمال کو دوسرے کے کمال سے موازنہ کر کے ایک کو فائق بتانے کے یہ معنی کہ بہ نسبت دوسرے کے اس میں کم نقص ہے ورنہ نقص سے وہ بھی خالی نہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں کثرت کے سبب افراط مضامین کے اگر مصائب اور کمزوریوں کی افراط ہے تو جا بجا محاسن بھی تو کچھ کم نہیں ہیں۔ (صفحہ ۱۷۱)

(۴) مرزا صاحب کے اصناف کلام کی اٹھارہ ضخیم جلدیں ہیں جن میں ہر قسم کے مضامین بآواز بلند پکار رہے ہیں کہ میر انیسؔ و میر مونسؔ کو

چھوڑ کر اردو میں اگر کوئی باکمال گزرا ہے تو میرے سامنے پیش کرو۔

(۵) واقعہ ہے کہ بعد امیر خسروؔ ہندوستان میں جیسی شہرت اور قدر مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کی ہوئی۔ مشکل ہے کہ کسی دوسرے کو یہ بات حاصل ہو سکے۔

شبلیؔ نعمانی:

مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی دقّت آفرینی سے ایسے عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا۔

امداد امام آثر:

مرزا صاحب ایک بڑے مذہبی شاعر تھے۔ ان کے ہاں اس کی بھی پابندی تھی کے بقدرِ استعداد بالکل وضعی روایات سلسلہ نظم میں داخل نہ ہونے پائیں۔ لاریب میر انیسؔ ایک بڑے رزمی شاعر ہیں اور رزمی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہومرؔ یا اور کسی رزمی شاعر کے ساتھ آپ کا موازنہ مناسب سمجھا جاتا ہے مگر مرزاؔ صاحب کا موازنہ میرؔ صاحب کے ساتھ جبکہ یہ دونوں شاعری کے جداگانہ پہلوؤں پر قدرت رکھتے ہیں اور اس طرح پر کھتے ہیں کہ یہ بے جوڑ موازنہ لطف سے خالی اور معقول نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔

کلیم الدین احمد:

انیسؔ اور دبیر کی عمارت میں نمایاں فرق ہے۔ مرزاؔ صاحب کی زبان میں شان و شوکت زیادہ ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں: (الہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر)

دبیرؔ اپنے عہد کی پیداوار ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے سے وہ معیارِ شاعری سامنے آتا ہے جو اس زمانے کے لکھنؤ میں قابلِ قدر سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے کے معیارِ شعر و سخن فارسی کے مطابق تھا۔

(۲) شاعری کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک مضمون کو بیان کرنے میں اپنی طبیعت کے کتنے پہلو پیدا کر سکتا ہے۔ دبیرؔ کی پروازِ فکر کتنی بلند ہے ان کی مضمون آفرینی کتنی وسیع ہے ان کا کلام پڑھنے سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے پڑھ کر ایک عجیب طرح کا لطف محسوس ہوتا ہے اور دبیرؔ کی صناعی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ دبیرؔ کے یہاں یہ خوبیاں اپنی معراج پر ملتی ہیں۔ نفیس اور نادر تشبیہیں نئے نئے استعارے عجیب عجیب مضامین اور ان سب کا استعمال فنی اعتبار سے بہت ہی کامیاب ملتا ہے۔ شبلیؔ جیسا مخالف بھی مانتا ہے کہ دبیرؔ کے یہاں کوئی غلطی اصول شاعری اور قواعد کی نہیں پائی جاتی۔

(۳) شوکتِ الفاظ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے۔

(۴) مبالغے کی زیادتی کے بہت سے نمونے دبیرؔ کے یہاں ملتے ہیں جن میں خیال کی بلندی نظر آتی ہے۔

❁❁❁❁

مرزا دبیرؔ کے دو خاص مرثیے

علی عرفانؔ

علّامہ رشید ترابی نے اپنی ایک تقریر (''بصیرتِ مومن دَسویں مجلس) میں مرزا دبیرؔ کے بارے میں کچھ یوں کہا تھا:

''مرزا دبیرؔ کا نزع کا عالم تھا اور وہ کچھ کہہ رہے تھے وصیت کے طور پر مگر آواز بہت نحیف تھی۔ نزدیک پہنچنے والوں نے ان سے پوچھا کہ بتلایئے کیا کہہ رہے ہیں تو کہا اور کچھ نہیں۔ صرف یہ کہ میری قبر میں اس مرثیے کو رکھ دینا۔

''جب داغِ بے کسی نہ سکینہؑ اُٹھا سکی''۔ یہ مرثیہ دبیرؔ کے ساتھ دفن ہوا ہے۔ جب ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اس میں بعض منازل تھے کہ جہاں میں الہامی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا اور آپ پڑھیں گے اس کو تفصیل سے تو پتہ چلے گا کہ بعض مقامات پر ایسی بیتیں آ گئی ہیں کہ قلبِ مومن کانپ جاتا ہے۔ اس شان سے مرثیہ کہا ہے۔ میں نے ہمیشہ انیسؔ کے مرثیوں کو پڑھا ہے لیکن اس مسئلے میں خاص طور پر یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ شہزادی کے حال کے دو مرثیے ہیں اور دونوں مرثیے بھی عجیب و غریب ہیں۔ ایک تو ''جب داغِ بے کسی نہ سکینہؑ اُٹھا سکی'' دوسرا مرثیہ ''جب گُل ہوا چراغِ حرم ملکِ شام میں''۔

دبیرؔ کے تعلق سے علامہ کے یہ کلمات موتیوں میں تولے جانے کے قابل ہیں۔ آگے انہیں کلمات کی روشنی میں دبیرؔ کے ان دو مرثیوں کا جائزہ لینا ہے۔

پہلے مرثیے کے حوالے سے علامہ ترابی ''ایسی بیتیں آ گئی ہیں کہ قلبِ مومن کانپ جاتا ہے''، کہہ کے آگے بڑھ گئے اور بیتوں کی نشاندہی نہیں کی۔ گویا قارئین پر چھوڑ دیا کہ وہ بیتیں تلاش کریں۔ اس ارادے سے میں نے اس مرثیے کا مطالعہ شروع کیا تو سب سے پہلے میری نظریں نویں، دسویں اور گیارھویں بند کی بیتوں پر گئی۔ شہزادی کو گویا الہامی طور پر یہ پتہ چل چکا ہے کہ یہ شب دنیا میں ان کی آخری شب ہے۔

تسلیم کو پھوپھی کی کبھی سر جھکاتی تھی
تھی بے خطا پہ سب سے خطا بخشواتی تھی

اپنی بڑی بہن فاطمہؑ کبریٰ سے کہتی ہیں کہ کل وہ کہیں مہمان جائینگی۔ بہن پوچھتی ہیں کہ کیسے جاؤ گی؟ زنداں تو مقفل ہے۔ یہ جواب دیتی ہیں۔

یہ کہتی تھی کہ قفل لگا ہے تو کیا ہوا
زنداں ہے بند روضۂ رضواں کھلا ہوا

پھوپھی اور بہن کے بعد وہ اپنی ماں کے پاس جاتی ہیں اور کہتی ہیں۔

اک تازہ موت ہوگی نبیؐ کے گھرانے میں
اماں لٹو گی آج کی شب قید خانے میں

پھر وہ اپنے ایک ایک اہلِ خاندان کی مصیبتوں کو یاد کرتی ہیں اور پھر کہتی ہیں کہ اب یہ مصیبتیں دُور ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

غُل ہو سکینہؑ لے کے بلا سب کی مر گئی
حیدرؑ کی پوتی مشکلیں آسان کر گئی

یہ اس مرثیے کے سترھویں (۱۷) بند کی بیت ہے۔

پھر قید خانے میں بابا کا سر آتا ہے۔ بیٹی دیر تک اپنے بابا کے کٹے سر سے باتیں کرتی ہے اور پھر انتیسویں (۲۹) بند کی بیت پر یہ مرثیہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

سر کی جبیں پہ اپنی جبیں دھر کے رہ گئی
کلمہ پڑھا بلائیں لیں اور مر کے رہ گئی

''جب گُل ہوا چراغِ حرم ملکِ شام میں'' وہ دوسرا مرثیہ ہے جس کا علّامہ ترابی نے اپنی تقریر میں ذکر کیا تھا۔

''دفترِ ماتم'' (جلد اول) میں یہ مرثیہ ''جب داغِ بے کسی نہ سکینہؑ اُٹھا سکی'' ہی کے تسلسل کے طور پر پیش کیا گیا۔ جب کہ علامہ رشید ترابی کی نظر میں اور کچھ دیگر محققین کی نظر میں یہ ایک الگ مرثیہ ہے۔ اس مرثیے کے مطلع کی کیفیت سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

جب گُل ہوا چراغِ حرم ملکِ شام میں — یعنی سکینہؑ مر گئی یادِ امامؑ میں
دیکھے ستم یزید کے دربارِ عام میں — شہؑ کے سلام کو گئی دارالسلام میں
دنیا میں داد رس نہ ملا داد خواہ کو
جا کر نشاں طمانچوں کے دکھلائے شاہؑ کو

مطلع میں تازہ بین شروع ہوتا ہے اور اس بین تک آنے کے لیے پچھلے مرثیے کے راستے آنا چنداں ضروری نہیں ہے۔ اس مطلع کے چند مصرعوں میں دبیرؔ نے شہزادی سکینہؑ کی شہادت کے پس منظر کو سمیٹ لیا ہے اور بات وہاں سے آگے بڑھاتے ہیں۔

یہ دو الگ الگ مرثیے ہیں مگر ایک بات طے ہے کہ یہ دونوں مرثیے دبیرؔ کے مرثیوں میں خاص مقام رکھتے ہیں اور مومنین کے دلوں کو تڑپانے کی یکساں قوت کے حامل ہیں۔ پچھلے مرثیے میں دبیرؔ نے ایک چار سالہ بچی کے جذبات نظم کیے تھے اور اس مرثیے میں وہ اس بچی کی ماں کے جذبات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ بیٹی کی لاش پر اُمِّ ربابؑ کے یہ بین رثائی شاعری میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اصغرؑ کی بھولی باتیں سناؤ نثار ماں — اکبرؑ کا ذکر کر کے رُلاؤ نثار ماں
سیلی کا نیل ماں کو دکھاؤ نثار ماں — بابا کو جا کے در پہ بلاؤ نثار ماں
ماتم کے غلغلے ہیں نہ رونے کے ہوش ہیں
بی بی جو اب خموش ہیں تو سب خموش ہیں

❁❁❁❁

کلامِ دبیرؔ میں نعتیہ عناصر

گوہر لکھنوی

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے رُستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے سب ایک طرف چرخِ کُہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پَر کو

مرزا سلامت علی نام اور تخلص دبیرؔ کی ولادت ۱۱؍جمادی الاول ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹؍اگست ۱۸۰۳ء دہلی، محلہ بلی ماراں میں ہوئی اور ۳۰ محرم کو ۱۲۹۲ھ بمقام لکھنؤ انتقال کیا اپنے ہی گھر میں دفن ہوئے۔ جس گلی میں مرزا دبیر کا گھر ہے وہ گلی کوچۂ مرزا دبیرؔ کے نام سے نخاس لکھنؤ میں مشہور ہے۔ خبیر لکھنوی۔ آپ کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا اور مرزا غلام حسین کے والد کا نام مرزا غلام محمد تھا۔ مرزا دبیرؔ کی زوجہ اُردو کے عظیم المرتبت شاعر سید انشاء اللہ خاں انشاؔ کی نواسی اور سیّد معصوم علی کی بیٹی تھیں۔ مرزا دبیرؔ کے فرزند اوج نے اس بات پر اپنے ایک شعر میں فخر کیا ہے۔

نانا ہیں مرے سیّد عالی نسب انشا
عاجز ہے خرد اُن کے فضائل ہوں کب انشا

مرزا دبیرؔ نے تمام کتب رائج درسیہ عربی اور فارسی پڑھی تھیں۔ جملہ علوم معقول اور منقول میں مہارت حاصل کی تھی۔ پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں: مرزا دبیرؔ نے عربی اور فارسی کی تعلیم فضیلت کی حد تک حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی دبستانِ دبیرؔ میں لکھتے ہیں: مرزا صاحب کی علمی حیثیت بہت بلند تھی۔ دبیرؔ چونکہ بہت ذہین تھے اس لیے اٹھارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ اساتذہ میں مولوی غلام صاحب، مولوی میر کاظم علی صاحب، مُلّا مہدی صاحب اور مولوی فدا علی صاحب کے آگے زانوتلمذ تہ کیا۔ شاعری میں تقریباً دس سال میر ضمیرؔ کی شاگردی کی، ضمیرؔ لکھنوی کو خود اس بات پر فخر تھا کہ وہ دبیرؔ کے اُستاد ہیں۔ اس مضمون کو انہوں نے اپنی ایک رباعی میں اس طرح پیش کیا ہے:

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیرؔ آیا ہے اب کہتے ہیں اُستادِ دبیرؔ آیا ہے
کردی مری پیری نے مگر قدر سوا اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

مرزا دبیرؔ نے بارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا اور انہوں نے جو سب سے پہلے قطعہ کہا وہ یہ ہے:

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس کی شام و سحر کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

مرزا دبیرؔ نے آخری قطعہ تاریخ جو میر انیسؔ کے انتقال پر کہی تھی۔ جس کے آخری دو مصرعوں کے مجموعی اعداد سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق دبیرؔ کے مطبوعہ مراثی کی تعداد ۳۹۰ اور غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد ۲۸۵ ہے۔ اس طرح سے دبیرؔ کے کُل مراثی ۶۷۵ ہوتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ نے شاعری کی ہر صنف، غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس، مسدّس، قطعۂ تاریخ، رباعی، سلامی، مرثیہ وغیرہ کے علاوہ نثر میں ایک کتاب ''ابواب المصائب'' بھی لکھی ہے۔ مرزا دبیرؔ کے منتخب شاگردوں کے نام پیش خدمت ہیں:

محمد جعفر اوجؔ، محمد ہادی حسین عطاردؔ، میر نظیر میرؔ بادشاہ بقاؔ، شادؔ عظیم آبادی، نیرؔ شکوہ آبادی، مشیرؔ لکھنوی، صغیرؔ لکھنوی، ممتاز الدولہ، ملکہ زمانی، سلطان عالیہ، زیب النسا حاجی، قدیرؔ دہلوی، محمد تقی اخترؔ، شیخ فقیر حسین عظیمؔ، صفدرؔ فیض آبادی، سیّد باقر مہدی بلیغؔ، محمد رضا ظہیرؔ، وہاب حیدر آبادی، امام باندی عفّت، عطیرؔ، سفیرؔ، صباؔ، وزیرؔ، حقیرؔ وغیرہ۔

جناب مرزا دبیرؔ کا نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں:

(سلام)

مجرئی ہے سوگوارِ ماہِ حیدرؑ چاندنی — اشک ہیں شبنم بُکا کرتی ہے شب بھر چاندنی
مجرئی فرشِ نجف سے کب ہو ہمسر چاندنی — چاندنی جھاڑو تو جھڑتی ہے زمیں پر چاندنی
اے فلک اندھیر ہے عابدؑ کا زنداں بے چراغ — اے زمیں کیا قہر ہے دنیا میں گھر گھر چاندنی
تا کمالِ چہاردہ معصومؑ روشن سب پہ ہو — چودھویں شب کو رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی
حلۂ نورانی فردوس کے مشتاق تھے — دیکھ کر عاشور کی شب کو بہتّر چاندنی
شمر نے چاہا کہ حضرت سے جدا عباسؑ ہوں — یہ نہ سمجھا چاند سے چھوٹے گی کیوں کر چاندنی
جب سفیدی روضۂ شبیرؑ میں ہونے لگی — گرد روضہ کے پھری چونے میں مل کر چاندنی
مال و زر کا کیا بھروسا چاہیئے فکرِ مآل — فی المثل ہے چار دن کی اے تونگر چاندنی
آبروئے ماہِ بنی ہاشمؑ سے روشن تھا جہاں — بدر سے اس ماہِ نو میں تھی فزوں تر چاندنی
بارہا لکھّا ہے شب کو حسنِ رخسارِ حسینؑ — روشنائی میں مرکّب کی ہے اکثر چاندنی
خاکساروں کا ہر اک دھبّے سے دامن پاک ہے — گرد آلودہ نہیں ہوتی زمیں پر چاندنی
مہدیؑ دیں ہیں نہاں فیضِ ہدایت ہے عیاں — چاند جیسے آبرو میں اور جلوہ گستر چاندنی
اے خوشا طالع کہ ہے نامِ حسنؑ سے ہم عدو — کیوں نہ ہو روشن دلوں میں نام آور چاندنی
اصغرؑ بے شیر کی تربت پہ رکھنا چاہیئے — چاند کا ہے دودھ سے لبریز ساغر چاندنی
احمدؐ مختار ہیں نورِ خدا کے آسماں — حیدرؑ و زہراؑ قمر شبیرؑ و شبّرؑ چاندنی

اک مہِ داغِ عزا میں کتنے جلوے ہیں دبیرؔ قبر پر باہر چراغاں اور اندر چاندنی

(مرثیہ)

کیا کیا بیاں کروں میں عنایاتِ کبریا پیدا پیمبروں کو پئے رہبری کیا
ہم کو محمدؐ عربی سا نبیؐ دیا بسم اللہ صحیفۂ فہرستِ انبیاء
آگے جو انبیائے ذوی الاقتدار تھے محبوبؐ کردگار کے وہ پیشکار تھے

آفاق بہرہ ور ہوا حضرت کی ذات سے آگاہ ذات نے کیا حق کی صفات سے
تصدیق حکمِ رب کی ہوئی بات بات سے رفتار نے لگا دیا راہِ نجات سے
سیکھے طریقے قربِ خدا کے حضور سے گمراہ آئے راہ پہ نزدیک و دور سے

سینوں سے سب کے دور ہوا دردِ بے دلی باقی رہی نہ پیروں میں سُستی و کاہلی
معراج اُن کے ہاتھ سے اعجاز کو مِلی واں چاند ٹکڑے ہو گیا انگلی جو یاں ہلی
انگلی سے دو قمر کیا کس جلال سے غل تھا کہ قفل چاند کا کھولا ہلال سے

سر تا قدم لطیف تھا پیکر مثالِ جاں اس وجہ سے نہ سایہ بدن کا ہوا عیاں
قالب میں سایہ ہوتا ہے پر روح میں کہاں سایہ انہیں کا ہے یہ زمینوں پہ آسماں
معراج میں جو واردِ چرخِ نہم ہوئے سائے کی طرح راہ سے جبریلؑ گم ہوئے

سایہ بدن کا پاسِ ادب سے جدا رہا محبوب سے ہمیشہ وصالِ خدا رہا
یہ عاشقِ خدا بھی خدا پر فدا رہا سائے سے اپنے دور رسولِؐ ہدا رہا
دیکھو یہ باغِ نظم جو رغبت ہو سیر کی پرچھائیں تک نہیں یہاں مضمونِ غیر کی

لوحِ جبیں پہ سنگ لگا بد دعا نہ کی بیگانوں کے گلے سے زباں آشنا نہ کی
اور عین عارضے میں نظر جُز خدا نہ کی بخشی شِفا مریضوں کو اپنی دوا نہ کی
شکرانہ عافیت پہ تحمّل بلا پہ تھا ہر حال میں نبیؐ کو توکّل خدا پہ تھا

آدمؑ ہے قبلہ اور ہے مسجود ہر ملک کرسی ہے ان کی منبرِ نہُ زینۂ فلک
جاروبِ صحن خانہ ہے جبریلؑ کی پلک حوروں کی آنکھیں فرش ہیں عرش علا تلک

لطفِ خدا کا مومنوں پر اختتام ہے ایسا نبیؐ ہے اور علیؑ سا امام ہے

باطل ہر ایک مذہبِ دیرینہ کر دیا سینوں سے غم دلوں سے جدا کینہ کردیا
لبریز حُبِّ حق سے ہر ایک سینہ کردیا آئینِ دین و شرع کا آئینہ کر دیا
روشن ہے یہ حدیثِ رسولِؐ غیور سے پیدا ہوئے ہم اور علیؑ ایک نور سے

حق سے کیا علیحدہ باطل کو یک قلم کعبے سے بُت یقین سے شک عدل سے ستم
وحدت سے شرک ، خیر سے شر ، دیر سے حرم عصیاں سے توبہ کفر سے دیں ، بخل سے کرم
ثابت ہر ایک قطع سے توحید کو کیا چُن چُن کے مشرکوں کو تہِ تیغ دو کیا

مرزا سلامت علی دبیرؔ نے مرثیے کے علاوہ مثنویات بھی کہی ہیں جن کی تعداد اچھی خاصی ہے۔اس کے علاوہ قریب ۱۳۱۰ رُباعیات بھی تصنیف کی ہیں۔مرزا دبیرؔ نے ایک طویل مثنوی جس کا نام احسن القصص ہے جو(۳۳۱۶)اشعار پر مشتمل ہے جس میں چہاردہ معصومینؑ کے فضائل ومعجزات کونظم کیا ہے۔اُس مثنوی سے چند اشعار پیش کررہا ہوں۔جنابِ بی بی آمنہ کی زبانی منظر بیان فرماتے ہیں:

ہوئے زیبِ آفاق خیرالبشرؐ مرا گھر بنا بُرجِ شمس و قمر
عجیب نور آنکھوں سے لامع تھا واہ وہ مرمل کہ ٹھہرے نہ میری نگاہ
ہوا روشنی کا یہ اُس دم وفور نظرِ قصرِ شام آگے بے قصور
بوقت تولّد فرشتے تمام غلامانہ آئے پئے اہتمام
جو دیکھا جمالِ رسولِؐ انام کیا صف بہ صف جھک کے سب نے سلام
نبیوں کی روحیں بھی موجود تھیں کمر بستہ رضوان خلدِ بریں

(''مثنویاتِ دبیرؔ''ڈاکٹرتقی عابدی،صفحہ ۵۱)

مرزا دبیرؔ کی دوسری طویل مثنوی معراج نامہ ہے جس کے ۱۶۸۴ اشعار ہیں۔چند اشعار تسلسل سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہماری ہدایت کو کیا کیا ،کیا محمدؐ سے ہادی کو پیدا کیا
جنابِ محمدؐ شفیع انام علیہ الصّلوٰۃ و علیہ السّلام
خدا کی طرح سے ہیں یہ بھی رحیم خدا بھی کریم اور نبیؐ بھی کریم
کہاں برشِ تیغ کا یہ اثر ہوا ان کی انگلی سے ٹکڑے قمر
شہ برق طلعت سوارِ براق حبیبؐ الٰہی علی الاتفاق

رُباعی

تسلیمِ نبیؐ کو ہر سُلیماں خم ہے معراجِ نبیؐ میں جائے تشکیک نہیں

رُباعی

خاتم ہے لقب ، زیرنگیں عالم ہے
سائے کی سیاہی نہ رہے کیونکر دُور
خاتم ہے مگر نور کی یہ خاتم ہے

رُباعی

بندوں سے پیام اَحدِ پاک کہا
معبود ازل سے ما عرفناک کہا
دیکھی جو نبیؐ کی خاکساری حق نے
لولاک لما خلقت الافلاک کہا

رُباعی

یا شاہِ رُسلؐ رحمتِ یزداں تم ہو
قرآن ہے پوست مغزِ قرآں تم ہو
دعویٰ سب کو ہے مومنیت کا مگر
مومن وہ ہے کہ جس کے ایماں تم ہو

رُباعی

یٰسین کو سن کر جو قضا کرتے ہیں
حقِ اُلفتِ احمدؐ کا ادا کرتے ہیں
یٰسین ہے نبیؐ کا نام سو نزع کے وقت
اس نام پہ جاں اپنی فدا کرتے ہیں

ہے نور کا تڑکا شبِ تاریک نہیں
قوسین کے قرب سے یہ ثابت ہے دبیرؔ
اتنا کوئی اللہ کے نزدیک نہیں

رُباعی

موسیٰؑ کو تو حکم خلع نعلین ملا
احمدؐ کو مقامِ قابَ قوسین ملا
معراج کو یاں عرشِ معلیٰ واں طور
کیا فرقِ بلند و پست مابین ملا

رُباعی

طے جادہ حق، پائے سُبک رَو سے کیا
ہر ذرّے کو مہر، رُخ کے پرتو سے کیا
انگشتِ نبیؐ بدر میں تھی مثلِ ہلال
دو ٹکڑے قمر کو اُس مہِ نو نے کیا

رُباعی

کیا قامتِ احمدؐ نے ضیا پائی ہے
چہرے میں عجب نور کی زیبائی ہے
مصحف پہ نہ کیوں فخر ہو اِس صورت کو
قرآن سے پہلے یہ کتاب آئی ہے

رُباعی

آدمؑ نے شرف خیرِ بشرؐ سے پایا
رشتہ ایماں کا اِس گُہر سے پایا
دو میم محمدؐ سے جہاں روشن ہے
مضموں یہ دلِ شمس و قمر سے پایا

رباعیاتِ مرزا مرحوم ترتیب وتدوین سرفراز حسین خبیرؔ لکھنوی۔ مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ

(نذرانۂ عقیدت گوہرؔ لکھنوی)

ولائے آلِ نبیؐ کا اسیر کہتے ہیں
جو عظمتوں کی بلندی پہ جلوہ گر ہے گوہرؔ

درِ علیؑ و نبیؐ کا فقیر کہتے ہیں
اُسی بشر کو جہاں میں دبیرؔ کہتے ہیں

مراثیِ دبیرؔ میں لب ولہجہ کی وسعت

سیّد شاہ زمان شمسی

لب ولہجہ سے مراد وہ انداز اور اسلوب ہے جس میں الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ اندازِ گفتگو، الفاظ کی ترتیب، آواز کی نرمی یا سختی اور جذبات کی عکاسی پر مشتمل ہوتا ہے۔لب ولہجہ محض زبان بولنے کا طریقہ نہیں بلکہ بولنے والے کے جذبات، خیالات اور شخصیت کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔

لب ولہجہ کسی بھی زبان کی خوبصورتی، اظہار کی گہرائی اور مخاطب تک پیغام پہنچانے کے مؤثر ترین ذرائع میں سے ایک ہے۔اردو زبان، جو اپنی لطافت، نرمی اور شائستگی کے لئے مشہور ہے، میں لب و لہجے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ نہ صرف بات چیت کا ذریعہ ہے بلکہ دلوں کو جوڑنے کا فن بھی ہے۔

اردو زبان کا لب ولہجہ اپنی نرم گوئی شائستگی اور جذباتی اظہار کے لیئے جانا جاتا ہے۔ یہ زبان محبت احترام اور مروت کے ایسے اصولوں پر مبنی ہے جو سامع کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔اردو کا لب ولہجہ نہ صرف الفاظ بلکہ ان کے پیچھے چھپے جذبات کو بیان کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

اردو زبان کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں روزمرہ کی گفتگو بھی شاعرانہ انداز میں ہوتی ہے۔محاورے، تشبیہات اور استعاروں کا استعمال لب و لہجے کو مزید خوبصورت بنا دیتا ہے۔مثلاً ''آپ کا دل باغ باغ ہو جائے'' یا گفتگو میں شیرینی گھول دی۔لب و لہجے کا درست استعمال تنازعات کو کم کرنے اور مسائل کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔نرم لہجہ نہ صرف غصے کو کم کرتا ہے بلکہ معاملے کو خوش اسلوبی سے حل کرنے میں مددگار ثابت ہوتا۔کسی زبان کے اظہار اور ابلاغ دونوں ہی میں لب و لہجے کا بہت بڑا عمل دخل ہے اور شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ زبان نے لب ولہجہ کو جنم نہیں دیا بلکہ لب ولہجہ نے زبان کو جنم دیا ہے۔

لب ولہجہ دراصل انسانی آوازوں، آواز کی مختلف لہروں، اور ان کی ترتیب کا نام ہے۔ یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے الفاظ تخلیق ہوئے۔ جب انسان نے اپنے جذبات اور خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی، تو اس نے ابتدا میں اپنی آوازوں اور اشاروں کو استعمال کیا۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں ایک خاص ترتیب میں آنے لگیں، اور الفاظ نے جنم لیا۔

لہجے کا بھی اس عمل میں اہم کردار ہے، کیونکہ ایک ہی آواز یا لفظ مختلف لہجوں میں مختلف معانی پیدا کر سکتا ہے۔ لہجے کی گہرائی اور اس کی اثر انگیزی نے زبان کو خوبصورت رنگ دیے اور اسے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لب ولہجہ نے زبان کو نہ صرف جنم دیا بلکہ اسے ایک شناخت بھی دی۔مختلف خطوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کے لب و لہجے نے دنیا بھر میں مختلف زبانوں کو پروان چڑھایا۔ ایک زبان کا حُسن اس کے لب و لہجے کی متنوع رنگینی میں چھپا ہوتا ہے، جو ایک سماج کی تاریخ، روایات، اور جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

یوں کہا جاسکتا ہے کہ زبان انسان کی خالص ترین تخلیق ہے، جس کی بنیاد لب ولہجہ کی قدرتی موسیقی پر رکھی گئی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ زبان صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک پورا تجربہ ہے جو انسان کی ذات، روح اور سماجی ربط کا آئینہ دار ہے۔

لب ولہجہ، دراصل انسانی وجود کا پہلا تخلیقی اظہار ہے۔ یہ صرف آواز کی ترتیب نہیں بلکہ جذبات، تجربات، اور انسانی احساسات کی گونج ہے۔ زبان کی پیدائش محض الفاظ سے نہیں ہوئی بلکہ یہ انسان کے لب و لہجے کے ان خام جذبات سے شروع ہوئی جو کسی گہرے احساس کے زیرِ اثر پیدا ہوئے۔

تصور کیجیے کہ ابتدائی انسان، جو الفاظ سے محروم تھا، اس نے اپنی خوشی، خوف، غصے، اور محبت کے اظہار کے لیے اپنی آواز کو استعمال کیا۔ ایک درد بھری چیخ، خوشی بھرا قہقہہ، یا خوف سے کانپتی ہوئی آواز بی یہ سب انسان کے لب و لہجے کی ابتدائی شکلیں تھیں۔ ان آوازوں نے دھیرے دھیرے ایک معنویت اختیار کی اور وقت کے ساتھ زبان کی بنیاد رکھی۔

لب ولہجہ وہ بنیاد ہے جو زبان کو ایک جامد ڈھانچے کے بجائے ایک زندہ وجود بناتا ہے۔ ایک ہی لفظ، مختلف لب ولہجوں میں مختلف معانی اور جذبات پیش کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر، محبت کے اظہار کا ایک انداز خوشی بھرا ہوسکتا ہے، اور وہی محبت غم کے لمحے میں درد کی شکل اختیار کرسکتی ہے۔

اگر ہم زبان کی تاریخ کو دیکھیں، تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر زبان ایک مخصوص تہذیب اور خطے کے لب و لہجے کا عکس ہے۔ عربی کی گونج دار آوازیں، فارسی کی نرمی، اور اردو کی شیرینی یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ لب و لہجے نے زبانوں کو جنم دیا اور انہیں ایک منفرد شناخت دی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ زبان کی اصل روح اس کے الفاظ میں نہیں بلکہ لب و لہجے کی موسیقی میں چھپی ہے۔ زبان الفاظ سے زیادہ ایک احساس ہے جو لب و لہجے کے ذریعے دلوں سے جڑتا ہے۔ اس لیے لب ولہجہ زبان کا خالق ہے اور زبان اس تخلیق کا وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنی روح کو دیکھ سکتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر بڑے اہلِ قلم زبان کو ارتقا اور وسعت و رفعت اور گہرائی بخشنے کے لیے الفاظ کی نسبت لب ولہجہ سے زیادہ کام لیتے ہیں اس ضمن میں مرزا دبیرؔ کسی بڑے اہلِ قلم سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اپنے ہم عصر میر انیسؔ سے پیچھے بھی نہیں رہے یعنی میر انیسؔ کے ہم پلّہ ہی رہے ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے ایک معروف مرثیے کا ایک مکمل بند ملاحظہ فرمالیجیے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے ہر قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر

مرزا دبیرؔ کا یہ بند اردو مرثیہ نگاری کی اعلیٰ مثال ہے، جہاں لب و لہجے کی وسعت اور بیان کی گہرائی قاری کو اپنی طرف محو کردیتی ہے۔ اس بند میں جوش، ولولہ، اور تخیل کی بلندی کا امتزاج نظر آتا ہے جو دبیرؔ کی شعری عظمت اور ان کے طرزِ بیان کی بے مثال خوبیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس بند میں ''رن کانپ رہا ہے'' ''چرخِ کہن کانپ رہا ہے'' جیسے الفاظ کا استعمال منظر کو ڈرامائی اور خوفناک بناتا ہے۔ الفاظ کی یہ گونج

قاری کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے جیسے وہ میدانِ کربلا کی لرزتی ہوئی فضا میں موجود ہو۔ دبیرؔ کے لب و لہجے کی وسعت کا ایک بڑا پہلو تشبیہوں اور استعاروں کا غیر معمولی استعمال ہے۔ ''رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے'' اور ''جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر'' جیسے فقرے نہ صرف تاریخی اور مذہبی پس منظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ تخیل کی بلندی کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

یہ مصرعہ تاریخی کرداروں کے ذریعے امام حسینؑ کی عظمت اور طاقت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ رستم، جو فارسی ادب میں بہادری کی علامت ہے، یہاں ان کی بہادری بھی امام حسینؑ کے مقابلے میں بے بس نظر آتی ہے۔ دبیرؔ نے یہاں تخیل کو تاریخ سے جوڑ کر ایک نئی معنویت پیدا کی ہے۔

''شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو''

یہ مصرعہ دبیرؔ کے لب و لہجے کی شکوہ مندی کو واضح کرتا ہے۔ ''حیدرؑ کے پسر'' کے الفاظ نہ صرف شجاعت کی علامت ہیں بلکہ اس میں ایک روحانی روشنی بھی جھلکتی ہے جو قاری کے دل کو متاثر کرتی ہے۔

''جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر''

یہاں دبیرؔ نے لب و لہجے کی وسعت کو مابعد الطبیعیاتی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ جبریل جیسے فرشتے، جو طاقت اور عظمت کی علامت ہیں، امام حسینؑ کے رعب و دبدبے کے سامنے لرزاں ہیں۔ یہ منظر نامہ قاری کے سامنے نہ صرف واقعہ کربلا کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ اسے ایک ماورائی کیفیت میں بھی داخل کر دیتا ہے۔

اس بند میں ''کانپ رہا ہے'' کی تکرار ایک صوتی تسلسل پیدا کرتی ہے جو فضا کی لرزہ خیزی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ ہر مصرعے میں یہ تکرار اس کیفیت کو ظاہر کرتی ہے کہ امام حسینؑ کا رعب و جلال زمین، آسمان، اور وقت کے ہر ذرے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

مرزا دبیرؔ کے لب و لہجے کی وسعت اس بند میں ایک گہری جذباتی اور فکری گہرائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ اپنی زبان کی شائستگی، تشبیہوں کی باریکی اور تخیل کی بلندی کے ذریعے کربلا کے واقعے کو ایک کائناتی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ نہ صرف جنگی کیفیت کی شدت کو بیان کرتا ہے بلکہ روحانی عظمت اور انسانی جذبات کی گہرائی کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

یہ بند اردو ادب کی وہ مثال ہے جو مرثیے کی صنف کو نہایت بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ دبیرؔ نے اپنے لب و لہجے کی وسعت سے نہ صرف واقعاتی حقیقت بلکہ جذباتی اور روحانی اثرات کو بھی ایک منفرد انداز میں پیش کیا ہے جو قاری کو محض متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی روح کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔

لب و لہجے کی شائستگی زبان و بیان کی بنیاد ہے۔ یہ وہ نرم و نازک دھاگا ہے جو دلوں کو جوڑتا اور خیالات کو اظہار کی خوبصورت شکل عطا کرتا ہے۔ شائستہ لب و لہجہ محض گفتگو کا طریقہ نہیں، بلکہ انسان کے اندرونی شعور اور اخلاقی تربیت کا عکاس ہے۔ اس کی موجودگی نہ صرف کسی پیغام کو مؤثر بناتی ہے بلکہ اس میں ایسی دلکشی پیدا کرتی ہے جو سامع کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔

شائستگی کا لب و لہجہ، ابلاغ کے دروازے کھولتا ہے، جہاں سخت بات بھی محبت کے رنگ میں رنگی جاتی ہے، اور اختلافِ رائے بھی تہذیب کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ زبان اگرچہ اظہار کا ذریعہ ہے، لیکن اس کی تاثیر لہجے کی مٹھاس اور شائستگی کی مہک میں چھپی ہوتی ہے۔ جو بات تلخی اور تندی سے کہی جائے، وہ دل پر بوجھ ڈالتی ہے، لیکن یہی بات نرم اور شائستہ انداز میں کہی جائے تو وہ دل میں گھر کر لیتی ہے۔

شائستگی محض الفاظ کا انتخاب نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے پھوٹنے والی وہ روشنی ہے جو زبان پر جھلکتی ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو نہ صرف دوسروں کے لیے قابلِ قبول بناتا ہے بلکہ معاشرے میں رواداری ہم آہنگی اور محبت کے جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے خیالات ابلاغ کی وسعتوں تک پہنچیں تو ہمیں اپنے لب و لہجے کی شائستگی کو اپنی گفتگو کا زیور بنانا ہوگا، کیوں کہ یہی زیور ہمارے اظہار کو جاذب اور ہمارے پیغام کو مؤثر بناتا ہے۔

لب و لہجے کی شائستگی زبان و بیان کی جاذبیت کا اصل سرچشمہ ہے، جو الفاظ کو نہ صرف معنی دیتا ہے بلکہ ان میں تاثیر اور دلکشی بھی پیدا کرتا ہے۔ جب ہم بات کرتے ہیں، تو صرف ہمارے الفاظ نہیں بلکہ ان کی ادائیگی، ان کا ٹون، اور ہمارا لہجہ بھی سامع پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شائستہ لہجہ وہ خوبصورتی ہے جو ہر جملے کو گہرائی اور وقار سے آراستہ کرتا ہے۔ یہی شائستگی نہ صرف بات چیت کو خوشگوار بناتی ہے بلکہ ایک فرد کی شخصیت کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

شائستگی زبان کو ایک ایسا آہنگ عطا کرتی ہے جو نہ صرف سماعت کو خوشی بخشتا ہے بلکہ دلوں تک رسائی بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک فن ہے جو نہ صرف باتوں کے اندر نرم رویہ پیدا کرتا ہے بلکہ ان کے اثرات کو دیرپا بھی بناتا ہے۔ ایک نرم، شائستہ اور مہذب لہجہ وہ پل ہے جس سے انسانی تعلقات مضبوط ہوتے ہیں، یہاں تک کہ جب بات چیت میں اختلاف بھی ہو، شائستگی اسے تکلیف دہ نہیں بننے دیتی۔ لب و لہجے کی شائستگی صرف الفاظ کے انتخاب تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ انسان کی فطری تربیت اس کے اخلاقی معیار اور اس کے دنیا کے ساتھ تعلقات کا عکاس ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص شائستہ انداز میں بات کرتا ہے، تو وہ صرف اپنے پیغام کو بہتر طریقے سے پہنچاتا ہے، بلکہ اپنے آپ کو بھی ایک متوازن اور باشعور فرد کے طور پر پیش کرتا ہے۔ زبان کا استعمال اس کی اصلی قوت تب بن جاتا ہے جب وہ شائستہ اور مدبرانہ طریقے سے ہوتا ہے۔ اس طرح شائستہ لب ولہجہ نہ صرف ایک خوبصورت اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے بلکہ یہ ابلاغ کی طاقت کو نیا رخ دیتا ہے جو کہ انسان کے اندر کی گہرائیوں کو بھی ظاہر کرتا ہے اور اس کے باہمی تعلقات کو ایک نیا معیاری معیار فراہم کرتا ہے۔

لب و لہجے کی اہمیت اور وسعت کے حوالے سے مرزا دبیرؔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے:-

قابل میں سخن کے ہوں سخن ہے مرے قابل — لیکن سخن شہرہ فگن ہے میرے قابل
رضوان کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل — موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل
شہرہ ہے یہ تائید شہِ جنّ و ملک سے
مضموں مرا گھر پوچھنے آتے ہیں فلک سے

مرزا دبیرؔ کے اس بند میں لب و لہجے کی وسعت کا جو مظاہرہ کیا گیا ہے، وہ محض الفاظ کے استعمال تک محدود نہیں ہے بلکہ ان میں ایک ایسی سلیقے اور تخلیق کی عظمت ہے جو انسان کے اظہار کو ایک بلند ترین سطح تک پہنچا دیتی ہے۔

قابل میں سخن کے ہوں سخن ہے مرے قابل'' کے مصرعے میں شاعر اپنی شاعری کی طاقت اور اہمیت کو بیان کرتے ہیں، اور اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کی زبان کا اختیار صرف ان کے اپنے تک محدود نہیں، بلکہ ان کی تخلیق میں ایسی قوت ہے جو ہر مقام پر اپنی جگہ بناتی

ہے۔اس میں لب و لہجے کی وسعت اس انداز میں دکھائی دیتی ہے کہ شاعر کا کلام صرف اس کے ذاتی احساسات کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک عالمگیر حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

''رضوان کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل'' میں دبیرؔ نے جنت اور رضوان جیسے عظیم اور بلند تصورات کو اپنے کلام سے جوڑا ہے، جو لب و لہجے کی شائستگی اور بلند خیالات کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ مصرعہ ایک نئی حقیقت تخلیق کرتا ہے جہاں شاعر کا کلام اتنا پُرتخیل اور خوبصورت نظر آتا ہے کہ اُس کا جواب نہیں۔ یہاں زبان کا استعمال اور لہجے کی لطافت اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ شاعر کا کلام صرف معنوں میں نہیں بلکہ اس کی تاثیر میں بھی غیر معمولی ہے۔

میری دانست کو آپ ایک عام قاری کی دانست سمجھ لیجیے کہ میں کوئی باقاعدہ نقاد نہیں ہوں لہٰذا میری دانست کے مطابق مرزا دبیرؔ کا اس مصرعے سے واضح مطلب خصوصیت کے ساتھ ''رضوان کو جنت'' کے تین الفاظ کے پیش نظر یہ ہے کہ رضوان کو جنت مبارک ہو اور مجھے یہ میری شاعری کا چمن دوسرے لفظوں میں مجھے یہ میری شاعری کی جنت مبارک ہو مجھے اپنی شاعری کا یہ چمن یہ جنت رضوان کی جنت سے کہیں زیادہ عزیز ہے کہ رضوان کو جنت پر اتنا اختیار حاصل نہیں ہے جتنا مجھے اپنی شاعری کی اس جنت پر اختیار حاصل ہے رضوان اپنی جنت میں ذرا بھی ردوبدل نہیں کر سکتا ادھر میں اپنی اس شاعری کے جنت میں جب چاہوں نئے سے نئے انقلاب برپا کر سکتا ہوں رضوان کی جنت رضوان سے درجات میں کہیں بلند و بالا ہے لیکن میری شاعری کی جنت مجھ سے درجات میں کسی طرح بلند و بالا نہیں ہے لیکن میری شاعری کی جنت میں یہ لچک ضرور ہے کہ میں اسے جتنا بھی چاہوں بلند و بالا کر سکتا ہوں اصل میں بات وہی لب ولہجہ کی ہے جہاں تک کہ معنی سے لبریز ہونے کا تعلق ہے جس قدر یہ تین الفاظ رضوان کو جنت معانی سے لبریز ہیں اس قدر دوسرے الفاظ نہ ہوتے خواہ وہ کتنے بھی زیادہ کیوں نہ ہوتے لب و لہجے کا یہی کمال ہے کہ وہ اپنے اختصار اور لہجے کے اتار چڑھاؤ سے جس قدر معنی کے تر و تازہ گلشن کھلانے کا کمال رکھتے ہیں وہ لغت کے الفاظ نہیں رکھتے زبان و بیان خواہ کتنی ہی ترقی کر جائیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے وہ پھر بھی لب ولہجہ کی جگہ پُر نہیں کر سکتے ''موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل'' میں دبیر نے ''موتی'' اور ''عدن'' جیسے تشبیہات کا استعمال کیا ہے جو نہ صرف شاعری کی زیبائش کو بڑھاتے ہیں بلکہ اس میں ایک معنوی گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ یہ لفظ اور ان کی ترتیب اتنی ہموار اور شائستہ ہے کہ ایک عام زبان میں نہیں کہا جا سکتا۔لب و لہجے کی وسعت یہاں اس بات میں ہے کہ شاعر نے جواہر کی خوبصورتی اور جنت کی شان کو اپنے اظہار میں اس طرح سے سمو لیا ہے کہ وہ فنی سطح پر بے مثال ہو جاتا ہے۔

میری اس بات کی تائید اس بند کے چوتھے مصرعے سے صاف ہو رہی ہے۔دیکھیے کس خوبصورتی اور شائستگی کے ساتھ مرزا صاحب اپنے سے کم تر شعرا کو موتی کہہ رہے ہیں موتی کو اس کی نشونما کے لیے صدف کافی ہے لیکن بہت سے موتیوں کے طلبگار کے لیے ایک صدف پر گزارا نہیں ہو سکتا وہ تو پورے علاقہ کو جہاں اور بہت سے موتی تیار ہوتے ہیں اپنی جگہ جاگیر بنانا پسند کرتا ہے پھر اس مصرعہ کے لفظ ''یہ'' نے بڑا کمال دکھایا ہے مرزا صاحب فرما رہے ہیں مجھے یہ عدن یعنی شاعری کا عدن جہاں ہر لمحہ بے شمار معانی کے سچے موتی پیدا ہو سکتے ہیں اور ان کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ایک لفظ ''یہ'' سے مزید یہ بھی پتا چل رہا ہے کہ مرزا صاحب دنیاوی اور مادی دولت کے خواہش مند نہیں ہیں وہ شاعری کی

عدن اور اُس کے موتیوں کے طلبگار ہیں۔ اس بند کی ٹیپ کے پہلے مصرعہ میں فرمارہے ہیں کہ میری یہ تمام شہرت اور عزت جو مجھے نصیب ہے یہ سب میرے ممدوح جو جن و بشر کے شاہ ہیں ان کی تائید کے باعث حاصل ہے۔

''شہرہ ہے یہ تائید شہِ جنّ و ملک سے''

میں دبیرؔ اپنے کلام کی شان کو عالمگیر سطح تک پہنچاتے ہیں جہاں اس کی شہرت محض دنیا کے محدود دائرے میں نہیں بلکہ اس کی قدر و منزلت آسمانوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس مصرعے میں لب و لہجے کی وسعت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ شاعر اپنے کلام کو نہ صرف زمینی حقیقتوں سے بلکہ روحانی و سماوی دنیا سے بھی ہم آہنگ کرتا ہے۔ مرزا دبیرؔ کا یہ بند لب و لہجے کی وسعت کو اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ ان کے الفاظ ایک منفرد اور وسیع کائناتی سطح تک پہنچتے ہیں۔ ان کا کلام نہ صرف ایک ذاتی اور تخلیقی اظہار کے لیے ہے بلکہ وہ اپنے الفاظ میں اتنی گہرائی، لطافت اور شائستگی لاتے ہیں کہ ان کا اثر نہ صرف سامعین تک پہنچتا ہے بلکہ وہ ایک ابدی اور عالمگیر حقیقت بن کر رہ جاتا ہے۔

مرزا دبیرؔ اسی مصرعے میں مزید فرمارہے ہیں کہ میری شاعری یعنی میرے کلام کے بارے میں جو یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ ان میں معانی بہت وسعت رفعت اور گہرائی کے حامل ہیں تو یہ سب جن و بشر کے بادشاہ یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی تائید کے باعث ہیں۔ امام عالی مقام مولا امام حسین علیہ السلام نے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور اب میری مضمون آفرینی کا یہ حال کہ ہے نئے سے نئے اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین اس کثرت سے مجھ پر وارد ہوتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے آسانی سے ایک ہی وقت میں اتنے زیادہ مضامین مجھ پر اس انداز سے وارد ہو رہے ہیں کہ جس طرح لوگ جوق در جوق کسی خاص مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں تو ایک دوسرے پر گرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے ہیں جس کی وجہ سے ہجوم میں اپنی منزلِ مقصود کا پتہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

''مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے''

مرزا دبیرؔ کا مطلب یہ ہے کہ میرے ذہن میں اس اعلیٰ فکر کے حامل مضامین کثرت کے ساتھ مجھ پر وارد ہوتے ہیں کہ میں اُن کو الگ الگ یاد نہیں رکھ سکتا مجھے یاد کرانے کا فرض بھی میرے یہ بلند و بالا مضامین خود ادا کرتے ہیں یعنی میری توجہ دلاتے ہیں کثرتِ مضامین اور وہ بھی اعلیٰ درجہ کے مضامین یہ دو باتیں ہیں جن کو مرزا دبیرؔ اپنے قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں شہرت اپنی جگہ مرزا صاحب کے مضامینِ عالیہ اپنی جگہ۔

اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا دبیرؔ کا سخن مرزا دبیرؔ کی شاعری ایسی ویسی شاعری نہیں ان کی شاعری تو ایسی شاعری ہے کہ اس میں شاعری کی ایک ایک بات ایک ایک نکتہ اپنی جگہ ایک الگ مقام و مرتبہ رکھتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کا یہ بند زبان کے استعمال میں انتہائی تخلیقی اور شاعرانہ حسن کا حامل ہے۔ دبیرؔ نے اپنے کلام کو نہ صرف ایک ذاتی اظہار بلکہ ایک عالمی حقیقت میں بدل دیا ہے۔ ان کی شاعری میں ''شائستگی'' اور ''نرمی'' دونوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جو نہ صرف سماعت کو خوشگوار بناتی ہے بلکہ فکر کو بھی نیا زاویہ عطا کرتی ہے۔ دبیرؔ کے کلام میں استعارات کا استعمال نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں وہ جنت، عدن، موتی، اور فلک جیسے تصوراتی عناصر کو اپنی تخلیق میں یکجا کرتے ہیں۔ ان استعارات میں نہ صرف جمالیاتی خوبی ہے بلکہ ان کا گہرا معنوی تعلق بھی ہے، جو شاعری کو ایک نئی جہت دیتا ہے۔

البتہ، اس بند میں شاعر کی خود اعتمادی اور اپنی شاعری کی قدر دانی بھی صاف دکھائی دیتی ہے، جو کہیں کہیں مغرور اور خود پسندانہ بھی محسوس ہوسکتی ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دبیرؔ کی شاعری میں یہ ''خود اعتمادی'' ان کے کلام کی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو نہ صرف اپنی ذات بلکہ انسانیت کی بلند ترین سطح پر اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مجموعی طور پر، مرزا دبیرؔ کا یہ بند ایک انتہائی بلند ادبی شاہکار ہے جو نہ صرف زبان کے کمالات کا غماز ہے بلکہ شاعری کی حقیقت اور اس کی روحانیت کو بھی انتہائی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔

ایک مرثیے کا بند ملاحظہ فرمائیے۔

سرکار ہے ہر مجلسِ شبیرؑ ہماری مضموں کی طرح بیت ہے جاگیر ہماری
آئینہ سکندر پہ ہے تسخیر ہماری ہے مہر سلیمان کی تحریر ہماری
تنہا مہ و ماہی پہ نہیں سکہ پڑا ہے سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے

مرزا دبیرؔ کا یہ بند ایک ادبی شاہکار ہے جس میں لب و لہجے کی وسعت کا کمال پایا جاتا ہے۔ شاعر نے نہ صرف اپنی شاعری کی عظمت کو بیان کیا ہے بلکہ اس میں تاریخی، مذہبی، اور ثقافتی حوالوں کا بھی شاندار استعمال کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں ایک خاص وزن اور وقار ہے، جو ہر مصرعے میں نہ صرف معنی کی گہرائی بلکہ اس کی روحانیت اور تاثیروں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

''سرکار ہے ہر مجلسِ شبیرؑ ہماری''

یہ مصرعہ شاعر کی اپنی شخصیت اور شاعری کی اہمیت کو انتہائی بلند مقام پر لے جاتا ہے۔ ''سرکار'' کا لفظ نہ صرف ایک حاکم یا رئیس کی علامت ہے، بلکہ اس کے ذریعے دبیر اپنی شاعری کو ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کی موجودگی ہر محفل میں محسوس کی جاتی ہے۔ ''مجلسِ شبیرؑ'' میں شبیرؑ کا ذکر ایک مذہبی و تاریخی حوالہ ہے جو دبیر کے کلام کو نہ صرف معاصر بلکہ ایک عالمگیر، باوقار حقیقت میں تبدیل کرتا ہے۔ اس میں لب و لہجے کی وسعت یہ ہے کہ شاعر اپنے کلام کو ایک روحانی اور تاریخی سیاق میں پیش کرتے ہیں جو زبان کی حدود سے تجاوز کر کے ایک عالمی سطح پر اثر انداز ہوتا ہے۔

''مضموں کی طرح بیت ہے جاگیر ہماری''

دبیرؔ یہاں اپنی شاعری کو ایک بے مثال اثاثہ سمجھتے ہیں، جس کی قیمت اور اہمیت ہر سطح پر تسلیم کی جاتی ہے۔ ''مضموں'' اور ''جاگیر'' کے ذریعے شاعر نے اپنی شاعری کو ایک قیمتی وراثتی خزانے کی مانند بیان کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دبیر کا کلام نہ صرف محض لفظوں کا مجموعہ ہے بلکہ یہ ایک گہرا، قابلِ قدر اور دیرپا اثاثہ ہے جس کی شناخت عالمی سطح پر کی جاتی ہے۔

''آئینہ سکندر پہ ہے تسخیر ہماری''

یہ مصرعہ مرزا دبیرؔ کے کلام کی طاقت اور اثر کا غماز ہے۔ ''سکندر'' کی تشبیہ دراصل اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ دبیرؔ کا کلام فاتح ہے اور اس کی تاثیر اتنی وسیع ہے کہ وہ تاریخ کے آئینے میں اپنا عکس چھوڑتا ہے۔ ''آئینہ سکندر'' کے ذریعے وہ اپنے کلام کی قدر و قیمت اور بلندیت کو تاریخ سے جوڑتے ہیں اور اس کا اثر صرف ایک شخص یا ایک وقت تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ ایک ابدی حقیقت بن جاتا ہے۔

''ہے مہر سلیمان کی تحریر ہماری''

''مہر سلیمان'' کے ذریعے دبیرؔ نے اپنی شاعری کو اتنی عظمت دی ہے کہ وہ کسی بھی عظیم شخصیت یا طاقت کی مہر کی مانند ہے، جو ہر فیصلے کو قانونی حیثیت دیتی ہے۔ یہاں ''مہر'' کا استعمال شاعر کی شاعری کی نہ صرف معنوی بلکہ قانونی و روحانی قوت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ لب و لہجے کی وسعت ہے کہ دبیرؔ نے ایک مادی علامت کو روحانی اور معنوی سطح پر اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ وہ خود شاعری کی حقیقت کو عکاسی کرتا ہے۔

تنہا مہ و ماہی پہ نہیں سکہ پڑا ہے سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے

یہ مصرعہ دراصل دبیرؔ کی شاعری کی غیر معمولی تاثیر کو ظاہر کرتا ہے۔ ''مہ و ماہی'' اور ''سورج کا نگینہ'' جیسے استعارات کا استعمال صرف زبان کی بلاغت نہیں بلکہ ان استعارات کے ذریعے شاعر اپنی شاعری کی کائناتی عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''مہ'' اور ''ماہی'' جیسے لطیف اور دلکش تشبیہات، جبکہ ''سورج کا نگینہ'' کا ذکر شاعری کے کمال اور اس کی دنیا بھر میں تسلیم شدہ عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کا یہ بند ان کے لب و لہجے کی وسعت کو انتہائی مؤثر طریقے سے اجاگر کرتا ہے۔ ان کے الفاظ میں نہ صرف ایک خاص تاریخی، روحانی اور ثقافتی پس منظر ہے بلکہ ان کے کلام میں ایک ایسا شوق و جذبہ بھی ہے جو ہر سطح پر اثر ڈالتا ہے۔ دبیرؔ نے استعارات اور تشبیہات کا استعمال اس طریقے سے کیا ہے کہ ان کا کلام ایک عالمگیر حقیقت بن جاتا ہے جس کا اثر نہ صرف زمینی سطح پر بلکہ آسمانی سطح پر بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ دبیرؔ کا لب و لہجہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ایک شاعر کی زبان صرف محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کی شاعری میں ایک دنیا چھپی ہوتی ہے جو اپنے تخیل، تاریخ، روحانیت اور ادب کے حوالے سے ایک وسیع و عریض کائنات کا حصہ بنتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا دبیرؔ کا یہ بند شاعری کے حوالے سے لب و لہجے کی وسعت کا بہترین نمونہ ہے۔ دبیرؔ نے اپنے مراثی میں ہر سطح پر ادبی حُسن اور شعور کا توازن قائم کیا ہے۔ اُن کے لب و لہجے میں ایک خاص نوعیت کی وسعت ہے جو مختلف زاویوں سے انسانی تجربات کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چاہے وہ غم کی شدت ہو یا دکھوں کے بے شمار پہلو دبیرؔ نے اپنے اشعار میں ان سب کو اس قدر خوبصورتی سے پیش کیا کہ قاری کو ہر شعر میں ایک نئی حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ ان کی مرثیے صرف ایک مظہر نہیں بلکہ انسان کی نفسیات، واقعہ کربلا، اُس کے جذبات اور اس کے اندرونی انتشار کا عکس بھی ہے۔ دبیرؔ اپنے کلام میں درد کی ایک ایسی شدت رکھتے ہیں جو قاری کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اسے اپنے اندرونی جذبات سے بھی جوڑ لیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مراثیِ دبیرؔ کو ادب کی ایک ایسی منفرد اور وسیع دنیا سمجھا جاتا ہے، جہاں ہر لفظ ایک نیا منظر پیش کرتا ہے، ہر جملہ ایک نیا تاثر چھوڑتا ہے اور ہر شعر ایک نئی حقیقت سے روشناس کرتا ہے۔ ان کی زبان کی وسعت نہ صرف لفظوں کی بلاغت میں ہے، بلکہ ان کے اشعار کی تہہ میں ایک ایسی معنویت چھپی ہوئی ہے جو قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

مراثیِ دبیرؔ میں لب و لہجے کی وسعت پر جب بات کی جائے تو یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ دبیرؔ نے اپنی تحریروں میں ایک ایسا بیانیہ اختیار کیا ہے جو نہ صرف لفظوں کی جمالیاتی قدر کو اجاگر کرتا ہے بلکہ انسان کے جذبات، احساسات، اور زندگی کی حقیقتوں کو بھی برملا بیان کرتا ہے۔ دبیرؔ کے کلام میں لب و لہجے کی وسعت کا مطلب صرف لفظوں کی کثرت یا تنوع نہیں بلکہ یہ ایک ایسی گہرائی کو ظاہر کرتی ہے جو کثیر الجہات اور

مختلف زاویوں سے انسانی تجربات کی عکاسی کرتی ہے۔

دبیرؔ نے اپنے مراثی میں زبان کا اس قدر بھرپور استعمال کیا ہے کہ ان کے کلام میں ہر لمحہ ایک نیا تاثر اور نیا منظر سامنے آتا ہے۔ جب وہ غم والم کو بیان کرتے ہیں تو ان کا انداز نہایت گہرا اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کے ذریعے ایک ایسا کرب پیدا کرتے ہیں جو نہ صرف قاری کو محسوس ہوتا ہے بلکہ اس کی روح میں اُتر کر اس کے احساسات کی سطح پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ یہ وسعت دبیرؔ کی زبان میں اُس وقت دکھائی دیتی ہے جب وہ اپنے اشعار میں ایک ہی وقت میں مختلف جذبات، خیالات اور فلسفیانہ افکار کو ایک جگہ اکٹھا کر لیتے ہیں۔

دبیرؔ کی تحریر میں کبھی سادگی اور کبھی پیچیدگی کی جھرمٹ ہوتی ہے۔ وہ اپنے بیان میں نہ صرف زبان کی لطافت کو مقدم رکھتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے انسان کے داخلی تضادات، جذبات کی لطافت اور معاشرتی حقیقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں ایک خاص نوعیت کا تضاد ہے کبھی یہ اتنی سادہ ہوتی ہے کہ قاری کو اپنے آپ میں گم کر لیتی ہے، اور کبھی یہ اتنی گہری اور پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ قاری کو اس کی تہہ تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے۔ دبیرؔ کے مراثی میں لفظوں کا استعمال نہ صرف عاطفی طور پر بلکہ فکری سطح پر بھی قاری کو چونکاتا ہے، اور ایک نئی بصیرت فراہم کرتا ہے۔

دبیرؔ کے اشعار میں لب و لہجے کی یہ وسعت انسانی حالتوں کی مختلف پرتوں کو چھوتی ہے، جیسے دکھ، درد، محبت، امید، اور فلسفۂ زندگی۔ جب وہ رنج وغم کو بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری کو ایک درد کی گہری کھائی میں دھکیل دیتے ہیں اور جب امید کی بات کرتے ہیں تو ان کی زبان میں ایسی روشنی ہوتی ہے جو دل و دماغ کی تاریکیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ یہی وہ قدرت ہے جو دبیرؔ کے مراثی کو منفرد اور اٹوٹ بناتی ہے اور اس کے لب و لہجے کی وسعت کو ایک ابدی حیثیت دیتی ہے۔ دبیرؔ کے مراثی میں ہر لفظ ہر شعر ایک زندگی کے مختلف پہلو کو بیان کرتا ہے اور ان کی زبان میں ایک خاص قسم کا سلیقہ، مہارت اور باریک بینی ہے جو کسی اور سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وسعت نہ صرف ان کے بیانیے کی قوت کو بڑھاتی ہے بلکہ ان کے اشعار کو ایک خاص قسم کی ادبی عظمت بھی دیتی ہے۔ اُن کی زبان میں ایک ایسی وسعت پائی جاتی ہے جو واقعۂ کربلا کے تمام زاویوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ جب وہ امام حسینؑ کی قربانی کی بات کرتے ہیں تو ان کے اشعار میں نہ صرف غم کی گہرائی بلکہ ایک بلند روحانی اطمینان بھی جھلکتا ہے جیسے کربلا کا واقعہ صرف ایک جنگ نہیں بلکہ انسانیت کی بقا کے لیے ایک ابدی درس ہے۔ دبیرؔ کے لب و لہجے میں کربلا کی فضاؤں کی وہ گہرائی اور شان ہے جو انسان کے دل میں ایک زبردست کیفیات کا طوفان پیدا کر دیتی ہے۔

دبیرؔ نے نہ صرف امام حسینؑ اور ان کے خاندان اور اصحاب کی قربانی کو بیان کیا ہے بلکہ اس کے وسیلے سے انسانیت کے لیے ایک ایسا پیغام چھوڑ دیا ہے جو آج بھی دلوں کو بیدار کرتا ہے۔ اُن کے کلام میں کربلا کی فضا کا ہر پہلو چاہے وہ لشکر یزید کا ظلم ہو یا امام حسینؑ کی استقامت کا عزم، اس طرح سے بیان ہوا ہے کہ قاری کو ہر مصرعے میں ایک نیا درس، ایک نیا انکشاف ملتا ہے۔ یہ لب ولہجہ نہ صرف لفظوں کا جال ہے بلکہ ایک جذباتی اور روحانی تجربہ ہے جو قاری کو کربلا کی سرزمین کی ہر ریت، ہر لہو کی بوند، اور ہر آہ کی گونج سے متعارف کراتا ہے۔

آخر کار مراثیِ دبیر میں واقعۂ کربلا کی فضا اور لب و لہجے کی وسعت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ادب اور تاریخ کا تعلق صرف زمان ومکان سے نہیں ہوتا بلکہ یہ انسانیت کے جذبات واحساسات کی زبان ہے جو وقت کی کسوٹی پر بھی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ مراثیِ دبیر میں کربلا کا واقعہ ایک

روحانی سفر کی صورت اختیار کر لیتا جو نہ صرف ماضی کا حصہ ہے بلکہ ہر عہد میں دلوں کو جلا تا رہتا ہے۔

مراثیِ دبیرؔ میں واقعۂ کربلا کی فضا اور لب و لہجے کی وسعت ایک ایسا جمالیاتی سفر ہے جو صرف الفاظ تک محدود نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اُتر کر ایک روحانی انقلاب کی گواہی دیتا ہے۔ دبیرؔ نے کربلا کے سانحے کو اس طرح بیان کیا کہ اس کی ہر جھلک میں غم کی شدت، استقامت کی پُراثر گونج اور قربانی کی لافانی عظمت کی حقیقت نظر آتی ہے۔ ان کا لب ولہجہ گو کہ کربلا کی خونچکاں فضا سے گزر کر آتا ہے سب سے بڑھ کر اس میں ایک روشنی کی کرن بھی ہے جو ہر ظلمت میں امید کا پیغام دیتی ہے۔ یہ لب ولہجہ نہ صرف واقعے کے دکھوں کو بیان کرتا ہے بلکہ اس کے دلی اثرات اور فکری گہرائیوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

دبیرؔ نے نہ صرف کربلا کی اس انتہائی افسوسناک دلگداز حقیقت کو اپنے دلکش اسلوب میں بیان کیا بلکہ اس کے پس منظر میں چھپے ہوئے اخلاقی، روحانی اور فلسفیانہ پیغامات کو بھی اپنی تحریر میں بخوبی منتقل کیا ہے۔ کربلا کی سرزمین پر جب امام حسینؑ ان۔ کے خاندان اور ان کے ساتھیوں نے اپنی جانیں قربان کیں تو دبیرؔ نے ان کے خون کی ہر بوند کو ایک ابدی نشان کے طور پر پیش کیا ہے جس کی گونج نہ صرف کربلا میں بلکہ ہر عہد اور ہر معاشرے میں سنائی دیتی ہے۔ ان کے الفاظ کی وسعت میں ایک ایسا عروج ہے جو کربلا کے غم کو صرف ایک حقیقت نہیں بلکہ ایک زندہ روح کے طور پر پیش کرتا ہے۔

دبیرؔ کا لب ولہجہ مراثی کی ہر سطر میں کربلا کی فضا کی مہک اور تپش کو یوں اجاگر کرتا ہے کہ پڑھنے والا خود کو حسینؑ کی استقامت، ان کے ساتھیوں کی بے مثال قربانی اور میدانِ جنگ کی لامتناہی خاموشی میں محسوس کرتا ہے۔ ان کے الفاظ میں ہر زخمی جسم، ہر مقتل کی خاموشی، اور ہر شہید کی پکار ایک نئی حقیقت کے طور پر زندہ ہوتی ہے جو قاری کے دل و دماغ میں اُتر کر اسے اس عظیم قربانی کا حصہ بنا دیتی ہے۔

یہ مراثی محض تاریخ کی ایک درخشاں علامت نہیں، بلکہ ایک ابدی پیغام ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ حقیقت اور ایمان کی طاقت صرف اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک انسان اسے اپنی ذات میں سچائی اور حوصلے کے طور پر محسوس نہ کرے۔ دبیرؔ کا اندازِ بیان اس حقیقت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ کربلا کے سانحے کا ہر پہلو، ہر کرب، اور ہر زخم دراصل ایک نیا پیغام دیتا ہے جو نہ صرف ماضی کا آئینہ ہے بلکہ حال اور مستقبل کے لیے بھی ایک رہنما اصول ہے۔ اس طرح مراثیِ دبیرؔ میں واقعۂ کربلا کی فضا اور لب و لہجے کی وسعت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ صرف الفاظ سے نہیں بلکہ احساسات، جذبات اور روحانی حقیقتوں کے ذریعے ہم کسی بھی واقعے کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔ مراثیِ دبیرؔ میں کربلا کا واقعہ ایک عزم، ایک شجاعت اور ایک لافانی ایمان کی پُرعزم کہانی ہے جو ہر لمحے میں ہمارے دلوں کو جاگنے کی دعوت دیتا ہے۔

❁❁❁

مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے کی ادبی حیثیت اور فنکارانہ کمالات

صفدرؔ ہمدانی

مرزا دبیرؔ اردو مرثیہ کی شان ہیں بلاشبہ انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ نگاری میں وہ وہ معجزات کیے ہیں کہ آج بھی انسانی عقل ان کو تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیتی ہے۔ ان کے مرثیوں کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں، لیکن عمومی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مرزا دبیرؔ نے تقریباً ۳۰۰ سے ۴۰۰ کے درمیان مراثی لکھے۔ ان کے مرثیے اپنی تفصیل، فصاحت و بلاغت، اور جذباتی شدت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے مراثی اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اور آج بھی مجالس میں پڑھے جاتے ہیں۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ (۱۸۰۳ء-۱۸۷۵ء) کا شمار اردو ادب کے عظیم مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ دبیرؔ اور ان کے ہم عصر میر انیسؔ نے اردو مرثیے کو نہ صرف نئی بلندیوں تک پہنچایا بلکہ اسے فنونِ لطیفہ میں ایک منفرد مقام عطا کیا۔ مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کی ایک خصوصیت ان کا غیر منقوط مرثیہ کہنا ہے، جس میں انہوں نے بغیر نقطوں کے اشعار کہے۔ یہ ادبی مہارت صرف ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کی عکاسی ہی نہیں کرتی بلکہ زبان و بیان پر ان کی بے مثال گرفت کا بھی ثبوت ہے۔ اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے امیر المومنین باب العلم مولا علیؑ کے غیر منقوط خطبے کا ذکر کرنا مناسب ہوگا یہ بے نقط خطبہ حضرت علیؑ کی ایک تقریر ہے جس میں نقطہ والے حروف کا استعمال نہیں فرمایا ہے۔ یہ خطبہ امیر المومنین نے اصحاب پیغمبرؐ کے ایک گروہ کے سامنے گفتگو میں حروف کے کردار کے موضوع پر ارشاد فرمایا ہے۔

اس خطبے کا متن نہج السعادہ اور تمام نہج البلاغہ میں نقل ہوا ہے۔ خدا کی حمد و ثنا، بعض نعمتوں تذکرہ، اہلِ بیتؑ کا مقام اور پیغمبرِ اکرمؐ کی پیروی ان مباحث میں سے ہیں جن پر اس خطبے میں اشارہ فرمایا ہے۔ کتاب ''دوشاہکار علوی'' اسی خطبے اور امام علیؑ کا بغیر الف خطبہ کی شرح میں لکھی گئی ہے۔

بعض منابع میں ایک اور خطبے کو بے نقط خطبہ کے عنوان سے امام علیؑ کی طرف نسبت دی گئی ہے جو مذکورہ خطبے کی نسبت معتبر نہیں ہے۔

محمد باقر محمودی نے مستدرک نہج البلاغہ میں مختلف اسناد کے ساتھ اس خطبے کو ذکر کیا ہے۔ ان کے بقول اس خطبے کو انہوں نے محمد بن عبدالقاہر شہرزوری موصلی (متوفی ۸ صدی ہجری) کی کتاب ''مجموعۃ اَدبیَّہ'' سے نقل کیا ہے؛ لیکن سید رضی نے نہج البلاغہ میں اس خطبے کو ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ خطبہ تمام نہج البلاغہ میں بھی نقل ہوا ہے۔

کتاب دوشاہکار علوی کے مصنف احسانی، فر کے مطابق مناقب، الصراط المستقیم، منہاج البراعہ، بحار الانوار اور نہج، الایمان میں بھی مذکورہ خطبے کا عنوان یا ایک کچھ حصہ نقل ہوا ہے۔

اس خطبے سے ایک مختصر اقتباس

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ أَهْلِ الْحَمْدِ وَ مَأْوَاهُ، وَ لَهُ أَوْ كَدُ الْحَمْدِ وَ أَحْلَاهُ، وَ أَسْعَدُ الْحَمْدِ وَ أَسْرَاهُ، وَ أَطْهَرُ الْحَمْدِ وَ أَسْمَاهُ، وَ أَكْرَمُ الْحَمْدِ وَ أَوْلَاهُ. اَلْوَاحِدِ الْأَحَدِ الصَّمَدِ، لَا وَالِدَ لَهُ وَ لَا وَلَدَ.

حمد کرتا ہوں میں اس کی جو ستائش اور حمد کا لائق ہے اور اسی کے لیے ہی سزاوار ہے واضح ترین اور شیریں ترین حمد، سعادت مند ترین اور

سخاوت مند ترین حمد، سب سے پاک اور عالی حمد، بے نظیر اور شایستہ حمد، اس اللہ کے لیے جو یکتا اور بے نیاز ہے، اور نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔

سَلَّطَ الْمُلُوكَ وَ أَعْدَاهَا، وَ أَهْلَكَ الْعُدَاةَ وَ أَدْحَاهَا. وَ أَوْصَلَ الْمَكَارِمَ وَ أَسْرَاهَا. وَ سَمَكَ السَّمَاءَ وَ عَلَّاهَا، وَ سَطَحَ الْمِهَادَ وَ طَحَاهَا، وَ وَطَّدَهَا وَ دَحَاهَا، وَ مَدَّهَا وَ سَوَّاهَا، وَ مَهَّدَهَا وَ وَطَّاهَا، وَ أَعْطَاكُمْ مَاءَهَا وَ مَرْعَاهَا، وَ أَحْكَمَ عَدَّ الْأُمَمِ وَ أَحْصَاهَا، وَ عَدَّلَ الْأَعْلَامَ وَ أَرْسَاهَا۔

بادشاہوں کو مسلط کیا دشمنی کرنے پر آمادہ کیا، دشمنوں کو ہلاک کر کے کنارے لگا لیا۔ مکارم کو لوگوں تک پہنچایا اور انہیں شرف بخشا۔ آسمان کو اوپر لے گیا اور بلند کیا۔ زمین کو مسطح کیا اور پھیلایا، اسے پھیلا کر زندگی کے لیے ہموار کر دیا اور تمہیں پانی اور سبزہ زار دیا۔ اور قوموں کو اس پر بسنے کے لیے معیّن کیا اور ان کی تعداد پر احاطہ کیا اور ہدایت کی بلند نشانیوں کو مقرر اور استوار کیا۔

میرا شعور کہتا ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کو غیر منقوط کلام کہنے کی مہمیز باب العلم کے ایسے ہی خطبات سے ملی ہوگی منقوط اور غیر منقوط تحریروں کی روایت کے حوالے سے محقق محمد ریاض نے لکھا ہے کہ ''اردو ادب ادبی اصناف سے پُر ہے۔ اس میں صنعت مہملہ کسی بھی اور زبان سے کم نہیں ہے بلکہ اگر ہم برصغیر کی حد تک یہ کہیں کہ غیر منقوط فن پر برصغیر میں دیگر زبانوں مثلاً: عربی، فارسی، ترکی، پنجابی وغیرہ میں سب سے زیادہ اردو زبان کے ادباء و شعرا نے لکھا ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم اردو ادب میں اشعار، قصائد، کتب و رسائل صنعت عاطلہ میں نسبتاً زیادہ پاتے ہیں، غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف مہملہ کے اس فن لغوی عقلی میں مختلف لوگوں نے کم یا زیادہ طبع آزمائی کی ہے اور تجربہ کے طور پر لکھنا چاہا تو پھر لکھتے چلے گئے، چونکہ یہ فن ایک مشکل ادبی نوع سے تعلق رکھتا ہے، اکثر ادبا، شعرا اس وادی سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے ادبا و شعرا نے فن غیر منقوط کی نثر اور نظم دونوں میں قلم کو جولانی دی ہے''

اردو غیر منقوط نثر میں اولیں نام انشاء اللہ خان انشاء کا ہے وہ لکھنؤ میں ہجرت کر کے آنے والے شعرا میں شمار ہوتے ہیں، انہیں کئی زبانوں پر مکمل دسترس حاصل تھی اور انہوں نے مختلف زبانوں میں خوب لکھا۔ وہ کثیر التصانیف تھے جن میں سے کچھ کے صرف نام ہی ملتے ہیں اور کچھ مطبوع یا مخطوطہ دستیاب ہیں، ایک اہم تصنیف اردو ادب کا پہلا بے نقط نثری مجموعہ جو چالیس صفحات کی کہانی ''سلک گوہر'' پر مشتمل ہے۔ یہ عشق و محبت کی داستان ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے کلمات زیادہ مستعمل ہوئے ہیں، جیسا کہ ہم اس داستان کے شروع میں دیکھتے ہیں:

عالم عالم حمد، صحرا صحرا درود، اللہ صمد و دود، اور رسولِ کردگار، سرگروہ رُسُل، محمد محمود، اور آلہ الاطہار کو اس کہانی کا مخطوطہ رامپور رضا لائبریری میں ہے، اس کو امتیاز علی خان عرشی نے ۱۹۴۸ء میں تصحیح کے ساتھ رامپور سے ہی شائع کرایا تھا۔ پاکستان کے ولی رازی کی ''ہادی عالم'': فن عاطل کی دوسری نثر، سیرت طیبہ پر لکھی گئی کتاب ''ہادی عالم'' ہے، جو ولی رازی کی تصنیف ہے، ان کا پورا نام محمد ولی رازی بن محمد شفیع ہے۔ والد مفتی محمد شفیع اردو کی مشہور تفسیر معارف القرآن کے مفسر ہیں۔ ولی رازی جید عالم، ادیب اور صوفی ہیں۔ اردو زبان میں سب سے پہلی اور منفرد مکمل غیر منقوط سیرت طیبہ ہادی عالم نادر تالیف ہے۔ جس نے برصغیر پاک و ہند میں بالخصوص اور اقوام عالم میں اردو داں طبقہ میں بالعموم شہرت پائی، جس کے بعد کئی لوگوں نے ادب کی اس نوع کو تجربہ گاہ بنایا۔ ہادی عالم نے ۱۹۸۳ء میں سیرت کی کتب کے مقابلہ میں پہلا انعام

پایا اور حکومتِ پاکستان کی طرف سے مولف کو دس ہزار روپے انعام واعزاز دیے گئے۔ کتاب چار سو سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ بسم اللہ کے اس غیر منقوط ترجمہ کے ساتھ کتاب کو شروع کیا ہے:

اللہ کے اسم سے کہ عام رحم والا، کمال رحم والا ہے۔

انشاء اللہ خان انشاء نے جیسے اردو غیر منقوط نثر میں جوہر دکھائے، اسی طرح غیر منقوط نظم میں بھی اپنا لوہا منوایا، کلیات انشاء اللہ خان انشاء میں گیارہ صفحات کا دیوان بے نقط موجود ہے، جس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

اور کس کا آسرا ہو سر گروہ اس راہ کا آسرا اللہ اور آلِ رسولؐ اللہ کا
اہلِ عالم کا سہارا کس کام رکھ ہر سحر گہ آسرا واللہ اس درگاہ کا

کلیات انشاء میں غیر منقوط رباعیات بھی موجود ہیں، انشاء اللہ خان انشاء کی کلیات میں عربی، فارسی، ترکی زبان میں بھی غیر منقوط اشعار موجود ہیں، جن کو ان کے مقام پر ذکر کیا جائے گا۔

میر انیس (ت:۱۲۹۱ھ) کے ''غیر منقوط بند''

اردو غیر منقوط نظم میں دوسری نص میر انیسؔ کے ۴ غیر منقوط بند ہیں۔ ان کا پورا نام سید ببر علی انیسؔ ہے اور انہوں نے اردو ادب میں میر انیسؔ کے نام سے شہرت پائی۔ وہ شاعر و ادیب اور مشہور مرثیہ گو تھے۔ بغیر نقطوں کے لکھے گئے مراثی میں سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ طاہر و اطہر ہو اگر معرکہ آرا معلوم ہو حمد اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمرو کو مارا صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا
واللہ اک دم کو اگر وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہوسِ ملک عدم ہو

مرزا دبیر کا ''طالع مہر'':

فن عاطل کی نظم میں تیسری نص مرزا دبیرؔ کا دیوان طالعِ مہر ہے۔ مرزا دبیرؔ کا پورا نام مرزا سلامت علی تھا اور ادبی حلقوں میں مرزا دبیرؔ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی کئی تصنیفات ذکر کی جاتی ہیں، جن میں دیوان عاطلہ ''طالعِ مہر'' بھی ہے۔ یہ دیوان سلام، مراثی، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس میں کم و بیش ۵۵۷ غیر منقوط اشعار ہیں (۸۸)۔ اس دیوان میں مرزا دبیرؔ نے اپنا غیر منقوط تخلص ''عطارد'' استعمال کیا ہے۔ چند اشعار کا نمونہ پیش ہے:

مداح ہوا موردِ امدادِ رسولؐ کھولا وہ درِ مدح کرو دادِ رسولؐ
حلال مہمّ سرور کل ، مالکِ ملک واللہ رسولؐ اور اولادِ رسولؐ

دبیرؔ کے کلام کی بیس ۲۰ جلدیں دفترِ ماتم کے عنوان سے شائع ہوئیں تھیں۔ مرزا دبیرؔ فقہ، قرآن و حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے کثیر احادیث و اقوال معصومین، روایات اور قرآنی آیات سے اپنے کلام کو نکھارا ہے مرزا دبیر کا پہلا مرثیہ ''بانوؑ پچھلے پہر اصغرؑ کے لیے

روتی ہے'' ہے۔ یہ مرثیہ حضرت علی اصغرؑ کے حال میں ہے۔ مرزا دبیرؔ کا آخری مرثیہ ''انجیلِ مسیح لبِ شبیرؑ ہیں عباسؑ'' ہے۔ مرزا دبیرؔ یہ مرثیہ نظم کر رہے تھے کہ میر انیسؔ کے انتقال کی خبر ملی۔ مرثیہ ناتمام چھوڑ دیا اور کہا ''دبیرؔ یہ تیرا آخری مرثیہ ہے'' اور یہی نامکمل مرثیہ اپنی آخری مجلس میں پڑھا۔ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں تھا اور اس میں مولائے کائنات اور جنابِ اُم البنینؑ کے عقد کا بھی ذکر ہے۔

مرزا دبیرؔ نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مراثی کہے، اور ان کے کلام میں زبان کی سادگی اور جذبات کی گہرائی کو خوب سراہا جاتا ہے۔ مرزا دبیرؔ کے والد گرامی مرزا غلام حسین اور دادا مرزا غلام محمد تھے۔ آپ کے جدامجد ملا ہاشم شیرازی تھے جو شیخ محمد اہلیؔ شیرازی کے برادر حقیقی تھے۔ ملا اہلی شیرازی ایران کے مشہور شاعر تھے۔ ان کی مثنوی سحرِ حلال ایران میں مقبول تھی۔ ملا اہلی نے ۸۴ سال کی عمر میں انتقال کیا اور حافظ شیرازی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ مرزا دبیرؔ نے ایک رباعی میں اپنے جد کی تصنیف پر یوں فخر کیا

کب غیر کے مضموں پر خیال اپنا ہے　　الہامِ خدا شریک حال اپنا ہے
اک یہ بھی ہے اعجازِ آئمہ کا دبیرؔ　　دنیا میں سخن سحرِ حلال اپنا ہے

بلاشبہ مرزا دبیرؔ نے اپنے جد کی روایت کو نہایت اعلیٰ سطح پر پہنچایا۔ مرزا دبیرؔ نے اپنی شاعری میں اعلیٰ درجے کا اسلوب اور فنی مہارت دکھائی۔ تحت اللفظ خوانی کا مطلب ہے اشعار کو سادہ اور غیر موسیقی انداز میں پڑھنا، تاکہ اصل متن اور معانی پر زور دیا جا سکے۔ تحت اللفظ خوانی میں مرزا دبیرؔ کے اشعار کو پڑھنے کا طریقہ کچھ یوں ہوگا:

* آہستہ اور واضح تلفظ: اشعار کو آہستہ اور واضح انداز میں پڑھا جاتا ہے تاکہ سامعین ہر لفظ کو سمجھ سکیں۔
* تاثیر پر زور: تحت اللفظ خوانی میں جذباتی انداز اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ معنی اور مفہوم کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
* وقفے کا خیال: اشعار کے درمیان وقفے دینا ضروری ہوتا ہے تاکہ سامعین کو مفہوم سمجھنے کا وقت ملے۔
* سادگی: اسلوب سادہ اور عام فہم ہوتا ہے تاکہ ہر سننے والا اس سے مستفید ہو سکے۔

مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے کا ادبی جائزہ

صنعتِ غیر منقوط/مہملہ میں مرزا دبیرؔ کا ایک پورا مرثیہ ہے۔ دبیرؔ نے جب اولیں غیر منقوط مرثیہ پڑھا تو ۶۹ بند کے اس مرثیے کو سن کر آتش نے محفل میں ہی کہہ دیا کہ 'مرزا یہ صنعت آپ نے جس بے تکلفی سے استعمال کی ہے وہ آپ ہی کا خاصا ہے۔ ہم نے یا تو پہلے تفسیر فیضی کی سنی تھی یا پھر آج یہ مرثیہ غیر منقوط سنا'۔ کچھ منفرد بند پیشِ خدمت ہیں

چہرہ

مہرِ علَم سرورِ اکرم ہوا طالع　　ہر ماہِ مرادِ دلِ عالم ہوا طالع
ہر گام علمدار کا ہمدم ہوا طالع　　اور حاسدِ کم حوصلہ کا کم ہوا طالع
عکسِ علَم و عالَمِ معمور کا عالَم　　گہہ ماہ کا ، گہہ مہر کا ، گہہ طور کا عالَم

عالم ہوا مدّاحِ علمدار و علَم کا　　وہ گُل اسد اللہ کا وہ سَرو ارم کا

محرم وہ حرم کا وہ گواہ اہلِ حرم کا رہرو وہ عدم کا وہ عَصا راہِ عدم کا
مصدر وہ علمدارِ کرم اور عطا کر مطلع وہ علَم طالع مَسعُود ہُما کا

حضرت عباسؑ کی مدح

وہ مَطلعِ اسرارِ کمالِ اسد اللہ آرام و سُرورِ دلِ آلِ اسد اللہ
ممدوح مہ و مہر و ہلالِ اسد اللہ واللہ ملال اس کا ملالِ اسد اللہ
محکوم وہ اللہ کا حاکم وہ اِرم کا حامل وہ علَم کا وہ مددگار حرم کا

گھوڑے کی تعریف

رہوار کو ہر لُطمہ ہَوا کا ہُوا کوڑا اڑ کر ہوا طاؤس علمدار کا گھوڑا
اور ساعدِ صرصر کو دم کا وہ مڑوڑا اس طور مڑا گرم کہ رو مہر کا موڑا
سو دام اڑا وہم صرصر کو گُھرَک کر رہوار ہُوا گرد ہَوا دور سَرَک کر

تلوار کی تعریف

صمصام وہ صمصام کہ ہر سُوعَمل اُس کا گہہ کاسۂ سر گہہ دلِ اعدا محل اُس کا
کس طرح معمّہ ہو دام مدح حل اُس کا ہر اک درم روح عدو ماحصل اُس کا
گر حکم علمدار و امامِ دو سرا ہو وہ مار ہو ، طاوس ہو ، موسیٰؑ کا عصا ہو

صمصام کو اِلہام ہوا سر کو علَم کر گہہ سورۂ الحمد کو گہہ صُور کو دم کر
اک وار لگا اور دو اعدا کو علم کر ہر دم عمرِ سعد کا دم محوِ عدم کر
دو حصہ کمر کر کہ الگ کاسۂ سر کر ہر طرح مہم سہل کر اور معرکہ سر کر

مصائب

سردار گِرا ، اور کہا آہ علمدار محروم کو محروم رکھا واہ علمدار
اک لمحہ رہو اور سرِ راہ علمدار ہمراہ لو سردار کو لِلّٰہ علمدار
واللہ سدھارو مع سردار اِرم کو اس دم الم مرگ گوارا ہوا ہم کو

مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے میں زبان کی سادگی اور فصاحت کو انتہائی عمدگی سے برتا گیا ہے۔ان مرثیوں میں غم حسینؑ کی داستان، کربلا کی تفصیلات اور اہل بیت کے مصائب کو بیان کیا گیا ہے۔ان کی غیر منقوط شاعری کی کچھ اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

ا۔ لسانی مہارت: مرزا دبیرؔ نے اپنے غیر منقوط مرثیے میں الفاظ کی ترتیب، صوتی آہنگ اور معنوی گہرائی کو بڑی مہارت سے برتا ہے۔

ان کے اشعار میں الفاظ کے درمیان ہم آہنگی اور روانی موجود ہوتی ہے، جو قاری یا سامع کو متاثر کرتی ہے۔

۲۔ تخلیقی جدت: مرزا دبیرؔ نے اردو شاعری میں تخلیقی جدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے غیر منقوط مرثیے کی صنف کو فروغ دیا۔ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مرثیہ نگاری کے فن میں نئی جہتیں متعارف کرائیں۔

۳۔ موضوعاتی وسعت: ان مرثیوں میں موضوعاتی وسعت کے ساتھ ساتھ واقعہ کربلا کی جزئیات کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ہر شعر میں اہلِ بیتؑ کے مصائب اور واقعہ کربلا کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے، جس سے مرزا دبیرؔ کی دلی وابستگی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ فنی محاسن:

مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے میں فنی محاسن کا ایک اہم پہلو ان کی شعری ساخت ہے۔ وہ قافیے اور ردیف کے انتخاب میں نہایت محتاط اور چابک دست نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار میں:

۱۔ ردیف اور قافیہ: دبیرؔ نے بغیر نقطوں کے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے قافیہ بندی کی ہے، جو ان کے فن کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔

۲۔ بحر کی روانی: ان کے مرثیوں میں بحر کی روانی اور وزن کی پابندی بدرجہ اتم موجود ہے، جس سے اشعار میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ بیانیہ کی فنکاری: دبیرؔ کا اندازِ بیان نہایت شگفتہ اور دلنشین ہے۔ ان کے مرثیے قاری کو ایک جذباتی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

۵۔ اثرات اور اہمیت: مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے نے اردو ادب میں نہ صرف لسانی تجربات کو فروغ دیا بلکہ اردو مرثیہ نگاری کی صنف کو بھی وسیع تر دائرہ عطا کیا۔ ان کا یہ کارنامہ ادبی دنیا میں ان کی تخلیقی بصیرت اور محنت کا مظہر ہے۔

۶۔ نتیجہ: مرزا دبیرؔ کا غیر منقوط مرثیہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس مرثیے میں لسانی چابکدستی اور ادبی مہارت کی وہ مثالیں موجود ہیں جو مرزا دبیرؔ کو اردو کے عظیم شاعروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ ان کا یہ فن پارہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک مشعل راہ ہے اور اردو ادب کے خزانے میں ایک بیش قیمت اضافہ بھی۔ یہ تحقیقی مضمون مرزا دبیر کے غیر منقوط مرثیے کی فنی و ادبی حیثیت کو اجاگر کرتا ہے، اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک جامع جائزہ پیش کرتا ہے۔

اپنی اس طالب علمانہ تحریر کا اختتام برطانیہ میں مقیم عاشق و محقق مرثیہ ذیشان زیدی کے دبیرؔ کے حوالے عالمی اخبار میں شائع ایک مضمون کے اقتباس سے کرتا ہوں۔

۱۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ اشعار کہے۔ دبیر کے مطبوعہ اشعار کی تعداد ۲۰ لاکھ ہزار سے زیادہ ہے۔

۲۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے سب سے زیادہ مرثیے لکھے۔ مطبوعہ مرثیوں کی تعداد تقریباً ۴۵۰ ہے

۳۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے سب سے زیادہ رباعیات کہیں۔ مرزا دبیرؔ کی رباعیات کی تعداد ۱۳۳۲ ہے جن کو ۱۰۶

مضامین پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسے دبیرؔ خود ایک مصرع میں کہتے ہیں۔

''مضمون میرا گھر پوچھتا آتا ہے فلک سے''

۴۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے

۵۔ مرزا دبیر اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے صنعتِ غیر منقوط یا مہملہ میں سب سے زیادہ اشعار کہے۔ انشاؔ اللہ خان انشا جو دبیر کے سگے نانا خسر تھے، ان کے غیر منقوط اشعار دبیرؔ سے تعداد میں کم ہیں۔ تقی عابدی نے اسی عنوان سے دبیر پر ایک کتاب ''طالعِ مہر'' تحریر فرمائی ہے

۶۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس کی آمدنی ہزاروں روپیوں تک تجاوز کر گئی تھی اور وہ سب اہل حاجت میں تقسیم ہوتی تھی۔

۷۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے علم بدیع کی لفظی اور معنوی صنعتوں کو سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔

۸۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس کے حسب پر، نسب پر، مذہب پر، شخصیت پر، فن پر استاد اور شاگردوں کی طرف سے حملے کیے گئے۔

۹۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس کے دوست ''دبیریے'' اور مخالف ''انیسیے'' شدید تھے۔ اردو ادب نے ایسی چشمک نہیں دیکھی اگرچہ مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کے دل ایک دوسرے سے صاف تھے اور دونوں ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے۔

۱۰۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے نثری کتاب ابواب المصائب کے علاوہ شاعری کی ہر ہیئت اور صنف، یعنی غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس، مسدس، تاریخ، رباعی، سلام، مرثیہ، شہر آشوب اور تضمین میں شاہکار چھوڑے ہیں۔

۱۱۔ مرزا دبیرؔ اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس نے اپنی وفات کی تاریخ کی دعا محرم کے ایام میں مانگی تھی جو مستجاب ہوئی۔ دبیرؔ کا انتقال ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری کو ہوا۔

❁❁❁❁

سرخیلِ سخنورانِ مرزا سلامت علی دبیرؔ

فدا محمد ناشادؔ

آج سے تقریباً سوا دو سو سال پہلے کی بات ہے، برصغیر کے ایک معروف شہر دہلی کے محلہ بلی ماراں میں مرزا غلام حسین نامی ایک شخص کو اللہ نے ایک خوش شکل فرزند سے نوازا، جن کی پیدائش ہجری جنتری کے مطابق ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ جب کہ آج کل کی زیادہ مستعمل عیسوی تقویم کے اعتبار سے ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء بنتا ہے۔ مرزا غلام حسین ایرانی نژاد بزرگ تھے جن کے پردادا ملّا رفیع بادشاہ دہلی کے میر منشی کے اہم عہدے پر فائز رہ چکے تھے، نومولود کے والد اور بزرگوں نے اُن کا نام سلامت علی رکھ دیا۔ یہ ہونہار بچّہ اپنے لڑکپن میں ہی اپنے والد کے ہمراہ دہلی سے اُس دور کے معروف علمی و ادبی شہر لکھنو منتقل ہو گیا، جہاں اُنہیں ابتدا ہی سے اسلامی تعلیم کی جانب راغب رہتے ہوئے فارسی اور عربی قواعد کی کتابوں کی تعلیم کے ساتھ ادب و حکمت کی کتابوں سے بھی استفادہ کرنے کے مواقع میسر آ گئے۔ یوں آپ نے علمِ فقہ، حدیث و اصول اور علمِ کلام کی تعلیم بھی حاصل کی۔ آپ کے اساتیذ میں مولوی غلام ضامن، ملّا مہدی مازندرانی، مولوی محمد کاظم اور مولوی فدا علی معروف و مشہور ہیں۔ جن کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کرتے ہوئے آپ نے مختلف نقلی و عقلی علوم میں کسبِ فیض کیا۔ آپ عنفوان شباب ہی سے نہایت صاحبِ کردار، مودب، منکسر المزاج، خوش اخلاق اور فرشتہ صفت انسانوں میں شمار ہوتے تھے۔ طبیعت میں سادگی کے ساتھ آپ جذبہ ایثار و قربانی سے بھرپور پابند صوم و صلواۃ انسان تھے۔ شخصیت کے حوالے سے آپ اِس قدر شریف النفس اور ملنسار تھے کہ اُنہیں اپنے ہم عصر اور دبستانِ لکھنو کے ایک اور عظیم مرثیہ گو شاعر میر ببر علی انیسؔ علیہ الرحمۃ کے اس شعر کی چلتی پھرتی تصویر قرار دے تو بے جا نہ ہوگا۔

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

سلامت علی نے شاعری کی ابتدا لڑکپن سے ہی شروع کی تھی، جب آپ نے ابھی شباب کی حدوں کو بھی نہیں چھوا تھا۔ اُسی عہد کے بلند پایہ معروف شاعر میر مظفر حسین ضمیرؔ کے آپ شاگرد بن گئے۔ کہتے ہیں کہ اُن کی ذوقِ شاعری کا ادراک کرتے ہوئے آپ کا تخلص بھی میر ضمیرؔ نے ہی دبیرؔ تجویز کیا تھا۔ عام روایت یہی ہے کہ ہر شاعر، بڑے ہوں یا چھوٹے، اصنافِ سخن کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہی کرتے ہیں، سلامت علی دبیرؔ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ تاہم اُن کے تمام تر غزلیہ کلام کا دستیاب ہونا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ شاعری بجائے خود عام زبان اور اُن میں موجود روزمرہ کے الفاظ اور محاوروں کو صنعت کارانہ انداز میں جوڑ کر پیش کرنے کے فن کا نام ہے۔ مختلف شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے پر یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس فن میں دبیرؔ کو وہ یدِطولا حاصل ہے جس نے اُنہیں اپنے دور کے شعراء کے درمیان منفرد مقام تک پہنچا دیا ہے۔ محققین کے مطابق اُن کی غزلیات پر مشتمل تین دیوان موجود تھے، اُن کے گھر آگ لگنے کی

وجہ سے کچھ جل کر ضائع ہو گئے۔ ہوسکتا ہے ایسی کچھ غزلیں دبیرؔ کے وارثوں کے پاس موجود ہوں لیکن مجھے تو اُنکی کوئی ایک بھی مکمل غزل تلاشِ بسیار کے باوجود کہیں سے دستیاب نہ ہوسکی، سوائے دس بارہ غزلوں کے کچھ بکھرے ہوئے غزلیہ اشعار کے جن کے نمونے قارئین کے ذوق مطالعہ کے لئے ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

نہ پھول تھے ،نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا — چھٹے اسیر ، تو بدلا ہوا زمانہ تھا
نظر میں دیر و حرم تھے کہ میں سمجھ نہ سکا — جہاں جھکی تھی جبیں ، اُن کا آستانہ تھا
بس اتنا یاد ہے مجھ کو کہ برق چمکی تھی — پھر اُس کے بعد چمن تھا نہ آشیانہ تھی

یہ مانا فلک پر ستارے بہت ہیں — مگر داغِ دل اپنے پیارے بہت ہیں
اِس واسطے ہیں مزاروں پہ سنبل — کہ یاں اُس کی زلفوں کے مارے بہت ہیں
دبیرؔ اَب بھی مانو میں کہتا ہوں تم سے — وہاں لوگ دشمن تمہارے بہت ہیں

گہہ شعلہ کبھی شرار ہیں ہم — گہہ باغ کبھی بہار ہیں ہم
مر کے بھی نہ چھٹے در سے تیرے — کوچے کے سدا غبار ہیں ہم
چاہے وہ دبیرؔ یا نہ چاہے — پر بندہِ جاں نثار ہیں ہم

ایک اور غزل کے دو اشعار ڈھونڈ نکالنے میں بھی میں کامیاب ہوسکا، جو یہ ہیں۔

بس گئی بستیِ دل یوں تری رعنائی میں — مادہ جیسے نکھر جائے توانائی میں
پہلے منزل ، پسِ منزل اور پھر — راستے ڈوب گئے عالمِ تنہائی میں

اُن کے دو اور انتہائی خوبصورت پر مغز غزلیہ اشعار بھی دستیاب ہوئے ہیں، شاید کسی ادب نواز شخص نے ان اشعار کے نسخوں کو اپنے نوٹ بک میں درج کر کے رکھے ہونگے، جو مجھ تک پہنچ سکا۔ انہیں ضائع ہونے سے بچانے کی خاطر کام میں لاتے ہوئے ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں تا کہ اِس موقّر رسالے کے حوالے سے ہمیشہ کے لیئے محفوظ ہو جائیں۔

رواں کرتا تھا خنجر گاہے گاہے روک لیتا تھا — عجب ناز و ادا سے اُس نے کاٹا میری گردن کو

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے — انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

کلامِ دبیرؔ کے محققین کے مطابق کہ اُن کی غزلوں کی تعداد بھی خاصی تھی، لیکن چونکہ آپ کی تعلیم کا بیشتر حصہ اسلامی تھا اور رجحان بھی مکمل مذہبیات کی جانب تھا، جس کے سبب اُنہوں نے اپنی حیات میں ہی مذہبی اور تاریخی مواد پر مشتمل کلام کو یکجا کر کے مکمل محفوظ رکھتے ہوئے اس طرح کی ادبی تخلیقات کو، جو اسلامی نقطہ نگاہ سے زیادہ اہم نہیں تھیں، از خود بھی تلف کر دیا تھا۔ اَب جو کلام کے نمونے اتفاقاً کہیں کہیں سے ہاتھ آجاتے رہے ہیں وہ اُس دور کے دبیرؔ کے چاہنے والوں یا اُن کے سننے والوں کے مرہونِ منّت ہیں جن کے پاس موجود نسخوں کے

پرزوں کو دست بہ دست ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہوئے ہم جیسوں تک پہنچ پائے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ برِصغیر پاک و ہند کے شعراء، ادیب اور دانشور اِن علمی اثاثوں کو تلاش کر کے محفوظ کرتے۔ لیکن اَب تک اِس طرف کسی نے خاطر خواہ توجہ شاید نہیں دی ہے۔ اب بھی ضرورت اِس بات کی ہے کہ عصر حاضر کے محققین اِن ادب پاروں کو ڈھونڈ کر حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اُن خوبصورت ادبی کلیوں کو یکجا کر کے علم و ادب کے گلدستے میں سجا لیا جائے تا کہ آنے والے نظم و نثر کے طالب علم اِن سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ میری اپنی بھی یہ خواہش ضرور ہے لیکن میرا تعلق ملکِ عزیز پاکستان کے ایک ایسے پسماندہ خطے بلتستان سے ہے، جو پاکستان میں ہوتے ہوئے بھی پاکستان کے آئینی حدود سے اَب تک باہر ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں کی چار دیواری کے اندر ایسی جگہ واقع ہے جہاں علمی و ادبی تحقیق کے لیے مناسب سہولتوں کا بے پناہ فقدان ہے، اسی لیے تو اس خطے کے ایک عظیم شاعر مرحوم پروفیسر حشمت کمالؔ الہامی نے خوبصورت انداز میں ہمارے علاقے کا تعارف اپنے اِس شعر کے ذریعے کیا ہے ؎

پہاڑی سلسلے چاروں طرف ہیں بیچ میں ہم ہیں　　مثالِ گوہرِ نایاب ہم پتھر میں رہتے ہیں

معذرت بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی، مرزا سلامت علی دبیرؔ کی شاعری کے ذخیرے میں غزلوں، رباعیات، حمد و مناقب، نوحہ جات و مراثی، نظموں اور مثنویوں سمیت جملہ اصناف سخن تمام تر محاسنِ کلام کے ساتھ موجود ہیں۔ تاہم رباعیات اور مراثی کے حوالے سے اُن کے کلام کو زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ اُن کے رباعیات کا غور طلب ہونا ایک طرف لیکن دوسری طرف منفرد لطف اور جاذبیت و دلکشی کے ساتھ ہر قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ اُن کے ہر رباعی کے اندر ہمیشہ ایک انمول فکر و فلسفہ موجود ہوتا ہے جسے سمجھنے کے لئے بھی فہم و فراست اور عقل و دانش درکار ہے۔ اُن کے ایسے رباعیات میں سے چند ایک کے نمونے درجِ ذیل ہیں ؎

پیشِ اُمراء طالبِ زَر جھکتے ہیں　　سجدے کی طرح مجرے کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح　　ہے مال سوا جدھر ، اُدھر جھکتے ہیں

مغروروں کا خاک کر و فر چشم میں ہے　　انداز فروتنوں کا ہر چشم میں ہے
رتبہ روشن ہے خاکساروں کا دبیرؔ　　سرمہ جو ہوا سنگ تو گہر چشم میں ہے

جو اہلِ ہنر کا عیب جُو ہوتا ہے　　بد اُس کا ہر اک فعلِ نکو ہوتا ہے
جب نقصِ زَر و سیم وہ کرتا ہے عیاں　　خود سنگِ محک سیاہ رو ہوتا ہے

اُنہوں نے اپنے ایک رباعی میں انتہائی خوبصورت انداز کے ساتھ سفر کے فوائد یوں بیان کئے ہیں ؎

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا　　قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل　　پختہ جو ثمر ہوا ، چمن سے نکلا

اِسی طرح ایک اور رباعی میں دبیرؔ نے تواضع و انکساری کو یوں کمال انسانیت قرار دیا ہے ملاحظہ فرمائیے

کم مایہ سبک پیش جہاں ہوتا ہے میزاں سے بدی ہی پہ عیاں ہوتا ہے
خوردوں سے تواضع ہے بزرگوں کی دلیل جھکتا ہے جو پلّہ وہ گراں ہوتا ہے

یہ نصیحت آموز اور دل نشین رباعی بھی اِسی موضوع پر ہے۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے دِل میں وہ فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی دست ثنا آپ اپنی جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

اگر ہم مرزا سلامت علی دبیرؔ کے رباعیات کے ذخیرے پر نظر دوڑائیں تو بجا طور پر یہ انکشاف ہوگا کہ اُنہوں نے ہماری سوچ وفکر میں مثبت تبدیلی لانے کے لئے، انسانوں کو اسلامی طرز حیات کا پابند بنانے کے لیے، بزرگوں سے تواضع وانکساری کے ساتھ مؤدبانہ اور نوجوانوں کے ساتھ مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں گفت وشنید کرنے کے لئے، ہر کسی کے ساتھ حُسنِ سلوک کا رویہ اختیار کرنے کے لیے، اپنے اندر رحم وخیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے، اصولِ صداقت کو اپنانے کے لیے، نیکیوں کو اپنانے اور برائیوں سے دور رہنے کے لیے اپنے رباعیات کے ذریعے جا بجا نصیحت آموز پیغامات دئے ہیں۔ درجِ ذیل رباعیوں میں بھی ایسے ہی پیغامات ہیں۔ اِن پر اگر عمل کیا جائے تو پیش آنے والے بہت سی پریشانیوں اور الجھنوں سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔

میزانِ سخن سنج میں تلتا ہوں میں فکر گہرِ نظم میں گھلتا ہوں میں
دل رہتا ہے بند قفلِ ابجد کی طرح جب حرف شناس ہو تو کھلتا ہوں میں

شیریں سخنی ہمیشہ کام اپنا ہے حق کہنے سے ہاں تلخ کلام اپنا ہے
گو مرثیہ خوب نظم کرتے ہیں دبیرؔ پر کبر و غرور کو سلام اپنا ہے

دبیرؔ کے بیشتر اساتذہ اسلامی کتابوں کے فارغ التحصیل عالم دین تھے جس کے سبب سلامت علی دبیر کو ابتدائی زندگی سے ہی مذہبی طرز تعلیم اپناتے ہوئے اسلامی ماحول میں اپنی زندگی کو مثبت سانچے میں ڈھالنے کا ایک خوشگوار موقع میسر آیا۔ اُن کے کلام میں اِسی لیے جگہ جگہ اسلامی تعلیمات کا ایک خوشگوار اثر موجود ہے، بلکہ اگر یوں کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ اُن کے کلام میں اسلامی تعلیمات کے منافی یا اسلامی تعلیمات سے متصادم کوئی جملہ ڈھونڈ نکالنا بھی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اُنہوں نے فنِ شاعری کو مکمل طور پر دینی اصولوں کے پرچار کے لئے ہی وقف کر رکھا تھا جس کی اِس قدر بہترین مثال کسی اور کے کلام میں شائد ہی کہیں مل سکے۔ لیجئے ایک رباعی ملاحظہ کیجئے جس میں حمدیہ رنگ کے ساتھ کس خوبصورتی سے اپنی گنہ گاری کا عاجزانہ انداز میں اعتراف کیا ہے۔

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں منھ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

جب کبھی کوئی محفل سجے تو اسلامی ثقافت کا تقاضا یہی ہے کہ گفتگو کی ابتدا تلاوت کلام پاک سے ہوتی ہے۔ اور جب نعت کی بات ہو تو

ادیبؔ رائے پوری کا یہ عقیدتوں سے بھرا نعتیہ کلام ضرور یاد آجاتا ہے، جو ہر نعت خوان کی زبان پر چڑھا ہوتا ہے، بلکہ ہر تقریب کا ناظم نعت خوان کو بلانے سے قبل خود ہی یہ نعتیہ شعر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر لیتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے

خدا کا ذکر کرے ذکر مصطفی نہ کرے ہمارے منھ میں ہو ایسی زبان خدا نہ کرے

تو لیجئے دبیرؔ کا بھی ایک نعتیہ رباعی ملاحظہ کیجئے، اِس رباعی کا مضمون بھی اُن کے درجِ بالا حمدیہ رباعی سے کچھ ملتے جلتے موضوع پر مشتمل ہے۔

یٰسین کو سُن کر جو قضا کرتے ہیں حق الفتِ احمدؐ کا ادا کرتے ہیں
یاسین ہے نبیؐ کا نام سو نزع کے وقت اِس نام پہ جان اپنی فدا کرتے ہیں

جب ہم دبیرؔ کے مختلف اصناف سخن کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے اشعار چاہے جس صنف سخن سے بھی تعلق رکھتے ہوں، اہلبیتؑ اطہار کے فضائل ومناقب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے لگتے ہیں، یعنی اُن کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے ہر شعر سے اُن معصومونؑ کی شان جھلک رہی ہوتی ہے۔ جس سے واضح طور پر ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہی اُن کے ایمان وایقان کی کتاب کا ایک مستند باب ہے۔ دبیرؔ کے دو اور انتہائی ایمان افروز مدحیہ رباعی جو حضرت علی علیہ السلام کے حوالے سے اُنہوں نے رقم کئے ہیں، ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ جن کو ایک دوسرے سے جوڑ کر پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ انہوں نے مولائے متقیانؑ کی عظمت اور بلندی کس دلنشین اور خوبصورت پیرائے میں بیان کی ہے۔

ہے نور نیا شمس و قمر میں پیدا رونق ہے عجب شام و سحر میں پیدا
اِس ماہ میں واجب ہے دو عالم کی خوشی حیدرؑ ہوئے اللہ کے گھر میں پیدا

خورشید سرِ شام کہاں جاتا ہے روشن ہے دبیرؔ یہ جہاں جاتا ہے
مغرب ہی کی جانب تو ہے قبرِ حیدرؑ یہ شمع جلانے کو وہاں جاتا ہے

یہ وہ رباعیات ہیں جن میں دبیرؔ نے پیغمبر اسلامؐ اور مولا علیؑ سے اپنی عقیدت اور وابستگی کا اظہار نہایت پُرخلوص پیرائے میں کیا ہے جو اسلامی معاشرے کے مسلمہ عقائد سے ماخوذ ہیں۔ جن کے حوالے سے کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان کے ذہن میں نہ تو کوئی الجھن ہوسکتا ہے، نہ ہی اِن عقائد پر کسی کی طرف سے کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہی ہر مسلمان کے مسلمہ اور ناقابل تردید ایمان ہے جس پر حرف آنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ ایک اور رباعی میں واقعہ معراج کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے حضورؐ کی ذات کا اللہ سے تقربِ کو یوں بیان کیا ہے۔

معراجِ نبیؐ میں جائے تشکیک نہیں ہے نور کا تڑکا شبِ تاریک نہیں
قوسین کے قرب سے یہ ثابت ہے دبیرؔ اتنا کوئی اللہ سے نزدیک نہیں

مرزا سلامت علی دبیرؔ چہاردہ معصومینؑ کے انتہائی عقیدت مند پیروکاروں میں سے تھے جس کا جابجا پرخلوص اظہار کے لئے گلدستۂ معانی سے جن خوشبودار اور شعری رنگوں سے زیبا پھولوں کو چُن کر زبان وبیان کے جس قدر لطیف وزیبا سانچے میں ڈال کر پیش کیا ہے، وہ اُن کے

اِن دو رباعیوں کی شکل میں موجود ہیں ۔

کیا قامتِ زہراؑ و علیؑ زیبا ہیں ایمان کے گویا دو الف یک جا ہیں
اِن دونوں کے فرزند ہیں گیارہ معصوم جیسے دو الف سے یازدہ پیدا ہیں

اربع کتبِ خالق غفار آئے چودہ کے گواہ رتبہ یہ چار آئے
تا ہو عدد چار دہ معصوم تمام الحمد کے سات آیہ دو بار آئے

مرزا دبیرؔ کے جو رباعیات اَب تک ہمارے پیشِ نظر رہے ہیں اُن سے جو مواد واضح طور پر ہمارے سامنے آچکے ہیں، وہ ذاتِ الٰہی پر اُن کی پختہ یقین اور حضورِ پاک ؐ سمیت اہلبیتِ اطہارؑ سے اُن کی پُرعقیدت اور بلا تزلزل وابستگی کا اظہار ہے۔ یہ سب ہر راسخ العقیدہ مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ فنِ شاعری پر اُن کی فاضلانہ گرفت اور زبان و بیان کے استعمال میں کثیر و متنوع، فصیح و بلیغ، مناسب اور معقول الفاظ کے چناو میں اُن کے حسن آفرین اور اثر انگیز تخیلات کی بلندی دبیرؔ کو لکھنو اور دہلی کی سخنوروں میں اِس قدر نمایاں کر دکھاتا ہے جہاں تک پہنچ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ دبیرؔ کے رباعیوں پر مزید گفتگو سے گریز کرتے ہوئے یہاں حضرتِ حُرؑ کے حوالے سے اُن کے ایک دلفریب اور خوبصورت غیر منقوطہ رباعی نذرِ قارئین کرتے ہوئے سلسلہ کلام کو آگے پڑھاتا ہوں ۔

اعدا کو اُدھر حرام کا مال ملا حُرؑ کو اسداللہؑ کا اِدھر لال ملا
واللہ کلاہِ سرِ عالم ہوا حُر حُلّہ ملا ، معصومہؑ کا رومال ملا

مرزا سلامت علی دبیرؔ نے مختلف اصنافِ سخن میں شاعری کی ہے لیکن اُن کو جو شہرتِ عام و بقائے دوام اور مقام و منزلت رثائی ادب نے دی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یوں تو رثائی ادب کے شعراء کی تعداد بھی دوسرے اصناف سخن کے شعراء کی تعداد سے کسی طور کم نہیں، لیکن جو شہرت دبیرؔ اور انیسؔ کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔ نہ صرف یہ بلکہ جب بھی اردو ادب میں مرثیہ گوئی کی بات ہوتی ہے تو ہر ایک کے ذہن میں انہی دو شعراء کے نام اُبھر کر آجاتے ہیں۔ اور اُن میں سے بھی جس قدر ضخیم کلام دبیرؔ کا ہے کسی اور کا نہیں بلکہ اگر یہ کہے تو شائد بے جا نہ ہو کہ اگر انیسؔ کے رثائی کلام کو ایک طرف رکھ کر باقی تمام مرثیہ گو شعراء کے کلام کو یکجا کیا جائے تو بھی شائد دبیرؔ کے مرثیوں کی تعداد تک نہ پہنچ سکے۔ میر ببر علی انیسؔ بھی اپنے دور کے بلند پایہ شاعر تھے، بعض سخن شناس شخصیات اُنہی کو ہی سب سے بڑا مرثیہ گو شاعر مانتے ہیں، مولانا شبلی نعمانی نے جو اُس دور کے عالم و فاضل شخصیات میں سے تھے، اپنی کتاب میں جو ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ،، کے نام سے معروف ہے انیسؔ ہی کو سب سے بڑا مرثیہ گو شاعر ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ انیسؔ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اُن کے آباو اجداد میں سے ہر ایک پشتوں سے فنِ شاعری میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ اِسی لئے انیسؔ نے خود فخریہ طور پر کہا تھا ۔

عمر گذری ہے اِسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

میں تو ادب کے نہایت کم علم طالب علموں میں سے ایک ہوں، میری کیا مجال کہ میں انیسؔ اور دبیرؔ میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت

دے سکوں۔لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ دبیرؔ کو ادب و شاعری کا فن کسی ورثے میں نہیں ملی تھی، وہ شعر گوئی کے فنِ میں جس درجہ کمال تک پہنچ گئے وہ اُن کی اپنے فہم و فراست اور علم و دانش کا نتیجہ تھا۔ بلکہ بعض محققینِ ادب کے مطابق انیسؔ کے اِس میدان میں اترنے سے پہلے ہی اِس شعبے میں دبیرؔ کی شاعری مسلم ہو چکی تھی۔ مناظر قدرت کی منظر کشی، فصاحت و بلاغت، خیال آفرینی اور اندازِ بیان میں اُن کی جلالت کو اُس دور کے اہل علم مان چکے تھے۔ حضرت عباس علمدار علیہ السلام کے رعب و جلال، جوش و جذبے اور دبدبے کے ساتھ میدان جہاد میں اُترنے کی منظر کشی جس باوقار اور خوبصورت انداز میں دبیرؔ نے کی ہے، وہ نہ صرف زبان زدِ خاص عام ہے بلکہ ضرب المثل بن چکی ہے۔ اِس مرثیہ کو سُن کر دبیرؔ کی فکر و تدبر اور عالمانہ وقار پر مبنی قادر الکلامی کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، جس کے چند بند نمونے کے طور پر پیش کر رہا ہوں ۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رَن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے — خود عرشِ خداوند زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو — جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

طبل و دہل و بوق کو سکتہ ہوا ڈر سے — ایک بار اُڑا تاجِ ہما شاہوں کے سر سے
خنجر گرے کھل کھل کے شجاعوں کی کمر سے — تائب ہوئے مریخ و زحل فتنہ و شر سے
خورشید و مہ نو نے کہا چرخ بریں پر — اَب کھول کے رکھ دو سپر و تیغ زمیں پر

ہے شور فلک کا کہ یہ خورشیدِ عرب ہے — انصاف یہ کہتا ہے کہ چُپ ترکِ ادب ہے
خورشیدِ فلک پرتوِ عارض کا لقب ہے — یہ قدرتِ رَب قدرتِ رب قدرتِ رَب ہے
ہر ایک کب اِس کے شرف و جاہ کو سمجھے — اِس بندے کو وہ سمجھے جو اللہ کو سمجھے

پنجے میں یداللہؑ ہے بازو میں ہے جعفرؑ — طاعت میں ملک ، خُو میں حسنؑ ، زور میں حیدرؑ
اقبال میں ہاشم تو تواضع میں پیمبرؐ — اور طنطنہ و دبدبے میں حمزۂؑ صفدر
جوہر کے دکھانے میں یہ شمشیرِ خدا ہے — اور سر کے کاٹنے میں یہ شاہؑ شہداء ہے

دریا پہ ہوا غل کہ وہ دُرِّ نجف آیا — الیاسؑ و خضرؑ بولے ہمارا شرف آیا
عباسؑ شہنشاہِ نجف کا خلف آیا — پابوسی کو موتی لیے دستِ صدف آیا
یاد آ گئی پیاسوں کی جو حیدرؑ کے خلف کو — دِل خون ہوا دیکھ کے دریا کی طرف کو

یہ مرثیہ دبیرؔ کے شاہکار مرثیوں میں سے ایک ہے، جس کے ۱۵۴ مسدّس بند ہیں۔ ہر بند سے علمدار کربلا کی جرأت و جلال جھلک رہا ہے۔ جس سے دبیرؔ کی فکری گیرائی، علمی استعداد اور شاعرانہ ہنرمندی کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی تصورات کو موزون الفاظ کے سانچے میں

ڈھال کر پیش کرنے کی منفرد اور بے مثال صلاحیت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اِس سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ دبیرؔ نے مرثیہ نگاری کو صرف بین و ماتم تک محدود نہیں رکھا، بلکہ رثائی دائرے کو اِس قدر وسعت دی، جس میں اَب ہر قسم کے مضامین کو گرفت میں لینے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ اِس طویل مرثیہ کو اُنہوں نے صرف ایک ہفتہ میں مکمل کیا تھا، جو اِس آخری بند سے ظاہر ہے ؎

خاموش دبیرؔ اب کہ نہیں نظم کا یارا مداح کا دل خنجرِ غم سے ہے دو پارا
کافی پئے بخشش یہ وسیلہ ہے ہمارا ایک ہفتے میں تصنیف کیا مرثیہ سارا
تجھ پر کرم خاص ہے یہ حق کے ولی کا یہ فیض ہے سب مدحِ جگر بندِ علیؑ کا

اُن کے کلام پر اگر تبصرہ کرنا شروع کریں تو رباعیات، سلام، مناقب جیسے اصناف سخن پر اور خاص طور پر ہر ایک مرثیہ پر ایک علیحدہ کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ دبیرؔ نے واقعات کربلا کا ذکر اور بیان صرف مرثیوں ہی میں نہیں کیا، بلکہ اُن کے رباعیات میں بھی اُنہوں نے شہدائے کربلا کے مصایب کو مختصر، پُر اثر اور سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو ؎

موجوں کو غمِ شاہؑ میں بے تابی ہے ہر چرخ میں آسمان دو لابی ہے
کیوں مردمِ دین دار سیاہ پوش نہ ہو ہر بحر کے بر میں جامہِ آبی ہے

ہر چند ہزار رنگ عالم بدلے لیکن نہیں تاثیرِ محرم بدلے
باقی ہے ابھی دعویٰ خونِ شبیرؑ کعبہ کیونکر لباسِ ماتم بدلے

میدانِ رباعیات کے بھی بہت سے ایسے شعراء گذرے ہیں، جنھیں قدرتِ کلام پر مکمل گرفت حاصل تھی، اِس قبیلے میں میر تقی میرؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، الطاف حسین حالیؔ، فراقؔ گورکھپوری، اثرؔ لکھنوی، مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، رئیسؔ امروہوی، معروف خطاط و مصور و شاعر صادقینؔ اور میر انیسؔ جیسی شخصیات شامل ہیں۔ لیکن دبیرؔ نے جس طرح اپنے رباعیات میں مختلف موضوعات کو سمویا ہوا ہے، جن میں رثائی رباعیات کے ساتھ حمدیہ، نعتیہ، فلسفیانہ، اخلاقی، سماجی وغیرہ پر اردو اور فارسی زبانوں میں رباعی کلام موجود ہیں، اُن کی تعداد ادب کے محققین کے مطابق ۱۳۵۰ ہیں، یوں آپ اردو ادب کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر بھی بن گئے ہیں۔ جبکہ دوسرے معروف کہنہ مشق شاعر انیسؔ کے رباعی کلام کی تعداد ۵۸۶ سے زیادہ نہیں۔ دبیرؔ نے بعض اردو اور فارسی رباعیوں میں عربی الفاظ کو بھی انتہائی خوبصورتی کے ساتھ یوں جوڑ دیا ہے کہ عام قاری مختلف زبانوں کی اِس آمیزش کا ادراک آسانی سے نہیں کر پاتے۔ اِسی طرح کی لسانی آمیزش اُنکے دوسری اصناف سخن میں بھی جا بجا پائی جاتی ہے۔ جو اُن کی اِن زبانوں پر بھی برابر گرفت کی دلیل ہے۔ اُن کے بیشتر رباعی کلام پر بھی رثائی ادبی کا رنگ چھایا ہوا ہے، نمونے کے طور پر ملاحظہ فرمائیے ؎

موجوں کو غمِ شاہؑ میں بے تابی ہے ہر چرخ میں آسمان دو لابی ہے
کیوں مردمِ دین دار سیاہ پوش نہ ہو ہر بحر کے بر میں جامۂ آبی ہے

دبیرؔ کے سب سے زیادہ کلام رثائی ادب سے متعلق ہے اگر کوئی شخص تاریخ کربلا کا منظوم انداز میں مطالعہ کرنا چاہے، تو وہ کلام دبیرؔ میں ہی مل سکے گا جس میں اُنہوں نے اہلبیتِ اطہارؑ کی مدینے سے روانگی، کربلا میں وارد ہونے کے واقعات، شبِ عاشور کی روداد، معرکہ روز عاشور شہادت تک، اُن مظالم کی روداد جو اصحابِ امامِ مظلوم کی شہادتوں کے بعد تاراجیِ خیام، اہلبیتؑ اطہار کی فریاد و بکا، بیمار کربلا امام زین العابدینؑ کو حالت مرض میں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور شام غریباں کے حالات، واقعاتِ اسیری، کوفہ و شام کے بازاروں اور دربار یزید کے واقعات جس جامع طریقے سے بیان کیے ہیں وہ شاید ہی کسی اور کے کلام میں مل سکیں۔ نہ صرف یہ بلکہ واقعاتِ کربلا کے ساتھ ساتھ دیگر معصومینؑ کے واقعاتِ شہادت پر بھی دبیرؔ کے مرثیے، یوں اُن کے مرثیوں کی تعداد بھی ۷۰۰ کے قریب اور مطبوعہ اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان میں سب سے زیادہ مرثیے بھی دبیرؔ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک اور صنف سخن، جس میں دبیرؔ نے اپنا کمال منوایا ہے، وہ غیر منقوطہ ۶۹ بند پر مشتمل واقعات کربلا پر ایک بھرپور مرثیہ ہے۔ حروفِ تہجی میں غیر منقوطہ حروف کی تعداد نسبتاً کم ہونے باوجود یوں اتنے مسدس اشعار پر مشتمل طویل مرثیہ لکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا، لیکن اِس مشکل کام کو اندازہ کیجئے دبیرؔ نے کس فہم و فراست اور ادبی لطافت کے ساتھ آسان کر دکھایا ہے۔ اِس غیر منقوطہ مرثیے کے چند منتخب بند نمونے کے طور پر پیشِ خدمت ہے۔

مہرِ علم سرور اکرم ہُوا طالع ہر ماہِ مرادِ دلِ عالم ہُوا طالع
ہر گام علمدار کا ہمدم ہُوا طالع اور حاسد کم حوصلہ کا کم ہُوا طالع
عکسِ علم و عالمِ معمور کا عالم گہہ ماہ کا گہہ مہر کا کہہ طور کا عالم

لو سامعو اَلحال سلام اور دُعا ہو دِل محوِ علمدارؑ رسولِ دوسرا ہو
اور صَلّ علا ، صَلّ علا ، صَلّ علا ہو مدّاح علمدارؑ کا وہ اور سِوا ہو
واللہ اگر مدحِ علمدارؑ اَدا ہو مَدّاح کا حور و اِرم و حُلّہ صِلا ہو
ضَمضَمام وہ ضَمضَمام کہ ہَر سُو عمل اُس کا گہہ کاسہِ سر گہہ دِل اعدا محل اُس کا
کِس طرح معمہ ہو دَمِ مدح حل اُس کا ہر اِک دِرمِ روحِ عدو ماحصل اُس کا
گر حکمِ علمدارؑ و امامؑ دوسرا ہو وہ مار ہو طاؤس ہو موسیٰؑ کا عَصا ہو

ہر گاہ ہوا معرکہ آرا وہ علمدارؑ اِس طرح کہا اَے عمرِ حاسد و مکّار
ہو کر کلمہ گو ہوا مُلحد کا ہم اطوار دَردِ دِلِ احمدؐ کا ہوا آہ روادار
ہمدم کو ہَراول کو مددگار کو مارا اَولادِ امامِ مَلک اطوار کو مارا

اولادِ محمدؐ کو رہا کِس کا سہارا دِلدار، دِلاسہ دو ہُوا کام ہمارا
ساحل کو سُدھارا کہ عدم کو وہ سُدھارا وہ مردہ ہوا آہ کہ سردار ہمارا
مُڑ کر سوءِ گورِ اسداللہ دُعا کر دادا اسداللہ! مہم سر کرو آ کر

کِس دم سرِ ساحل ہوا مولا کا ورود آہ دَم ہمدمِ مرگ اور علمدارؑ سرِ راہ
دوڑا سوءِ ہمدم اسداللہ کا وہ ماہ اور آہ لہو اُس کا سرِ رُو ملا واللہ
صدمہ ہوا اِس طرح کا دِل کو کہ ہِلا دِل اللہ کہا اور گِرا سرورؑ عادل

علم وادب کے محققین بہتر جانتے ہیں، غیر منقوطہ کلام تو اور کئی شعراء کے بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایک ہی موضوع پر اِس قدر طویل اور جامع کلام شائد ہی کسی کے پاس موجود ہو۔ رثائی ادب میں جو مقام لکھنو کے اِن دو شعراء، انیسؔ اور دبیرؔ کو ملا، آج تک کسی اور شاعر کو نہ مل سکا۔ آپ دونوں ہم عصر شعراء تھے اور اُن دنوں کے دلدادہ ادب نواز شخصیات انیسیے اور دبیرئے کے دو گروہوں میں اِس قدر بٹے ہوئے تھے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے شاعر کو اُن کے صلاحیتوں کے مطابق شاعر ماننے کے لئے ہی تیار نہ تھے۔ جب کہ آپ دونوں شعراء ایک دوسرے کا مکمل احترام کرتے تھے۔ کہیں بھی کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی کہ اِن دونوں کے آپس میں کسی قسم کی رقابت رہی ہو۔ میر انیسؔ کی وفات پر دبیرؔ کو کِس قدر رنج ہوا، وہ اُن کی اُس تاریخی نظم سے واضح ہے، جِس کے آخری بند میں ابجد کے حساب سے انیسؔ کی تاریخ وفات کو شاندار اور نہایت دلنشین انداز میں یوں رقم کیا ہے

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین طورِ سینا بے کلیم اللہ ، منبر بے انیسؔ

انیسؔ کی وفات کے بعد دبیرؔ کو صرف تین ماہ کی زندگی نصیب ہوئی اور ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ کو آپ بھی راہی دیارِ عدم ہو گئے۔ اُس دور کے کئی شعراء نے دبیرؔ کی وفات پر منظوم قطعہ تاریخ رقم کئے ہیں، جِن میں ایک سے بڑھ کر ایک نہایت ہی مناسب اور دلپذیر ہیں۔ منیرؔ شکوہ آبادی کی رقم کردہ یہ تاریخی قطعہ ملاحظہ کیجئے ۔

آہ زِ دستِ جہاں جانبِ باغ نعیم با دِل شاداں گرفت راہ جناب دبیرؔ
مرثیہ گوئی از او دولتِ معراج یافت بود دریں مملکت شاہ جناب دبیرؔ
سالِ وفاتش چنیں گفت منیرؔ حزیں ذاکرِ آلِ نبیؐ آہ جنابِ دبیر

اللہ کا فضل وکرم ہے کہ دورِ حاضر میں بھی شعراء تو بہت پیدا ہو گئے ہیں، جو مختلف اصناف سخن میں اچھے کلام تیار کر کے پیش کرتے رہے ہیں، لیکن رثائی ادب میں دورِ رفتہ کے ایسے شعراء کے کلام میں جو سوز و گداز، لطافت اور جاذبیت موجود ہیں وہ بہت ہی کم شعراء کے کلام میں مل سکیں گے ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است،،۔

❁❁❁❁

اردو مرثیہ اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری

گوہرؔ لکھنوی

لکھنؤ کے تین عظیم خانوادے یعنی میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور سیّد محمد مرزا اُنسؔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں جلالت وقدر کے مالک تھے۔ میر ببر علی انیسؔ اور مرزا اُنسؔ کے گھرانوں کے مابین ازدواجی تعلقات بھی قائم ہوئے تھے۔ میر انیسؔ کی ایک بیٹی کا عقد میر اُنسؔ کے ایک بیٹے سید احمد مرزا صابرؔ سے ہوا تھا جن کے بیٹے سید مصطفی مرزا عرف پیارے صاحب رشیدؔ تھے۔ اس طرح سے رشیدؔ میر انیسؔ کے سگے نواسے ہوئے۔ دوسری طرف انیسؔ کے چھوٹے بیٹے میر عسکری رئیس کی بیٹی یعنی میر انیسؔ کی پوتی سے پیارے صاحب رشیدؔ کا عقد ہوا۔ یعنی رشیدؔ کی والدہ انیسؔ کی بیٹی تھیں اور رشیدؔ کی زوجہ انیسؔ کی پوتی تھیں۔ اب حقیر مرزا سلامت علی دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا ذکر کرے گا۔

نام مرزا سلامت علی تھا جبکہ دبیرؔ تخلص کرتے تھے۔ موصوف ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی کے بلّی ماراں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ابتدا میں درسیہ کتب، صرف ونحو ادب، منطق اور حکمت وغیرہ مولوی غلام ضامن صاحب سے اور کتبِ دینی، حدیث وتفسیر اور اصول حدیث وفقہ کی تعلیم مولوی مرزا محمد کاظم علی صاحب سے حاصل کی۔ علم عروض وعلم بلاغت کی تعلیم بھی مولوی غلام ضامن صاحب سے حاصل کی تھی۔ ان حضرات کے علاوہ ان کے دو استاد اور بھی تھے جن کے اسمِ گرامی ملّا مہدی صاحب اور مولوی فدا علی صاحب اخباری تھے۔ مرزا دبیرؔ اصلاً ایرانی نژاد تھے۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی، ایران کے مستند شاعر مُلّا اہلی شیرازی جو کہ مشہور زمانہ مثنوی ''سحرِ ہلال'' کے مصنف تھے، ان کے حقیقی بھائی تھے۔

اہلیؔ شیرازی کا ایک فارسی شعر ملاحظہ ہو کہ۔

اہلیؔ کدروتے کہ تو داری از خامی ست عاشق شو و چو شمع سوز و صفا ببیں

(یعنی کہ خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اہلیؔ شیرازی تیرا دل جو میل اور کدورت سے بھرا پڑا ہے تیری یہ خامی ناپختگی اور عشق حقیقی سے دوری کی وجہ سے ہے۔ عاشق ہو جا اور شمع کی طرح عشق کی آگ میں جل جا اور پھر اپنے اندر کا شفاف پن دیکھیو)

خیر بات دوسری طرف نکل گئی ہم دوبارہ مرزا دبیرؔ کی طرف آتے ہیں۔ سو یہ خاندان شیراز سے دہلی آیا تھا اور اپنی علمیت ونام ونمود کے بدولت مغلیہ بادشاہوں کے درباروں میں ممتاز عہدوں پر فائز رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت زوال پزیر ہو رہی تھی اور دہلی کی تباہی کے آثار صاف نمایاں ہونے لگے تھے۔ شرفا اور اکابر نے اپنے دلوں پر پتھر رکھ کر دہلی کو خیر باد کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُس وقت دہلی والوں کو اودھ کی سرزمین انتہائی پُرکشش نظر آئی کہ یہ علاقہ ابھی انگریز کے کالے سائے سے محفوظ تھا۔ مرزا دبیرؔ کے خاندان نے بھی یہ بمع اہل وعیال دہلی کو الوداع کہا اور لکھنؤ آ بسے۔ مستند تاریخ نگار رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں:

''ان کے والد تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کر کے رہ پڑے۔ اس کے بعد جب دہلی میں تسلط ہو گیا تو پھر دہلی واپس آ گئے مگر دبیرؔ اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ اُس وقت آئے جب ان کی عمر سات برس کی تھی۔''

مرزا دبیرؔ خاندانی نہیں بلکہ پیدائشی شاعر تھے۔ انہوں نے بچپن ہی میں منبروں پر مرثیہ خوانی شروع کر دی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ان کی شہرت ضمیرؔ کے کانوں تک پہنچی جب دبیرؔ نے اپنا نازانوئے تلمذ میر ضمیرؔ جیسے استاد الشعرا کے سامنے تہیہ کیا تو انہوں نے اپنے اس بیش بہا شاگرد کو ایسا نکھارا کہ مرزا دبیرؔ دنیائے ادب کے وہ درخشاں ستارہ بنے جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی نے مرثیہ کے توسط سے کمالِ شاعری کو ایک نیا عروج بخشتے ہوئے رثائی ادب کی شریانوں میں ایک نئی حرارت پیدا کر دی۔ مرزا دبیرؔ کے کمال شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ:

''مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اُس درجہ تک پہنچا دیا جس کے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا۔''

مرزا دبیرؔ کے دیگر خواص کچھ یوں تھے کہ اُن کا قوتِ حافظہ بہت اچھا تھا۔ زیادہ تر وقت تذکرہ اہلِ بیت اطہار میں گزرتا۔ عام لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے۔ مزاجاً اور طبعاً بہت سخی تھے۔ آمدنی بھی بہت کثیر تھی۔ اس سلسلہ میں حیاتِ دبیرؔ کے مصنف افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

''ملکہ زمانی زوجہ نصیر الدین حیدر، دوئم شاہ اودھ عشرہ محرم میں دس ہزار روپیہ مرزا صاحب (مرزا دبیرؔ) کو نذرانہ پیش فرماتی تھیں۔ بادشاہ کے یہاں سے جو ملتا وہ اس سے بدرجہا زیادہ تھا اور محلات اور اُمرا جو پیش کرتے ان تمام نذرانوں پر خیال کیا جائے تو لاکھوں روپیہ سالانہ کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔''

مرزا دبیرؔ کے زمانے میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش شعرائے لکھنؤ میں سرفہرست تھے اور دبیرؔ کے قائل تھے۔ یہ حضرات مرزا دبیرؔ کی مجلسوں میں اکثر جایا کرتے تھے۔ میر ضمیرؔ کی نظروں میں مرزا دبیرؔ کا درجہ بہت بلند تھا۔ انہیں دبیرؔ کی اُستادی پر بہت فخر تھا۔ اس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

پہلے تو یہ شہرا تھا ضمیرؔ آیا ہے — اب کہتے ہیں اُستادِ دبیرؔ آیا ہے
کردی مری پیری نے مگر قدر سوا — اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

نواب واجد علی شاہ خود بھی صاحبِ دیوان شاعر اور سخن شناس تھے جو اخترؔ تخلص کرتے تھے۔ وہ مرزا دبیرؔ سے اِس حد تک متاثر تھے کہ اس کا اندازہ اُن کے ایک شعر اور ایک واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ واجد علی شاہ اخترؔ فرماتے ہیں:

بچپن سے اُن کے دامِ سخن کا اسیر ہوں — میں کمسنی سے عاشقِ نظم دبیرؔ ہوں

مرزا دبیرؔ کی قدردانی کے سلسلہ میں بادشاہ واجد علی شاہ سے ایک واقعہ یوں منسوب ہے کہ ایک روز جب مرزا دبیرؔ، واجد علی شاہ کے یہاں مجلس پڑھ رہے تھے۔ ہوا یہ کہ ایک تیز جھونکے کے سبب منبر کے اوپر تنا ہوا شامیانہ منتشر ہو گیا اور سورج کی سیدھی کرنیں مرزا دبیرؔ کے چہرے پر پڑنے لگیں۔ یہ دیکھ کر واجد علی شاہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنی چھتری طلب کی۔ اختتامِ مرثیہ تک خود ہاتھ میں چھتری لیے مرزا دبیرؔ کے چہرے اور جسم کو آفتاب کی تمازت سے بچاتے رہے۔ یہ واقعہ واجد علی شاہ کے دفتر میں کچھ اس طرح درج ہے:

''روزِ مجلس بالائے منبر، بحضور اعلیٰ حضرت بخواند مرثیہ۔ اتفاق افتاد، یکسو شد و عکس آفتاب بہ بروئے آں جنابِ اوفتادہ۔ فی الفور ظل اللہ چتر خود طلبیدہ و چوبش بہ دست خود گرفتہ، قریب منبر استادہ تا اختتامِ مرثیہ سایہ افگن ماند''۔

مرزا دبیرؔ کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کس حد تک تھا اس کا اندازہ درج ذیل بند سے بخوبی ہوتا ہے جس میں انہوں نے اپنے بارے میں لکھا:

گر کاہ ملے فائدہ کیا کوہ کنی سے — میں کاہ کو گل کرتا ہوں نگیں سخنی سے

خوش رنگیں میں الفاظِ عقیقِ یمنی سے
یہ ساز ہے ، سوزِ غمِ شاہِؑ مدنی سے
آہن کو کروں سبز تو آئینہ بنا دوں
پتھر کو کروں گرم تو عطر اُس کا نکالوں

☆

شامی کباب تھے یہ ہوئے جب شرر فشاں
اہل تتار بن کے ہرن رن سے تھے رواں

☆

واللہ ہاتھ دوں گا نہ فاسق کے ہاتھ میں
سر جائے گا پہ فرق نہ آئے گا بات میں

☆

قبضہ تو رہا تیغ کا دستِ شہِؑ دیں میں
پھل جا کے لگا شاخِ سرِ گاوِ زمیں میں

☆

بارش تھی آبِ تیغ کی برسات سے فزوں
بدلی تھی فوجِ شام کی رنگت گھٹا تھا خوں

☆

دریا جو دور پیاس میں تھا ، شہ کی فوج سے
منھ پر طمانچے مارتا تھا ، دستِ موج سے
چھالا ہے آفتاب کا ، گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ ، درختوں کی چھاؤں میں
فوّارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا ہے
پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اٹھا ہے

☆

نورِ نظرِ شاہؑ جو گھر سے نکل آیا
حیران ہیں سب ، چاند کدھر سے نکل آیا

☆

اعدا کو اُدھر حرام کا مال ملا
حُرؑ کو اسداللہ کا اِدھر لال ملا

☆

واللہ کُلاہِ سرِ عالم ہوا حرؑ
حُلّہ ملا ، معصومہ کا رومال ملا

☆

شبیرؑ کے بازو بھی ہیں اور زورِ کمر بھی
رشتہ میں برادر بھی ہیں ، الفت میں پسر بھی
خادم بھی ، مصاحب بھی ، دل و جان و جگر بھی
اللہ کی شمشیر شہِؑ دیں کی سپر بھی

مرزا دبیرؔ نے جتنے بھی مراثی سلام، رُباعیات اور قطعات کہے ہیں اُن کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُن کے تمام مراثی ابھی تک شائع نہیں ہو سکے۔ مرزا دبیر کے ۳۷۵ مراثی (دفترِ ماتم) کے عنوان سے ۱۴ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق دبیرؔ کے مطبوعہ مراثی کی تعداد (۳۹۰) اور غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد (۲۸۵) ہے۔ اِس طرح سے دبیرؔ کے کُل مراثی (۶۷۵) ہوتے ہیں۔

❁❁❁❁

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی شخصیت اور انکے مراثی

محمد قمر خان ترکش، مرزا دبیرؔ لین لکھنؤ

عالم اسلام کے تمام پیروکاروں کے علاوہ دنیا کے دیگر دانشور بھی واقعات کربلا کے افسوس ناک باب سے بخوبی واقف ہونگے۔ اس سلسلہ میں اس دور میں ڈھائے جانے والے بہیمانہ مظالم اور دی گئی انسانی قربانیوں پر مبنی ان مغموم واقعات سے وابستہ، شاعری کو مرثیہ کا درجہ حاصل ہے، ان مراثی کی کیا اہمیت ہے اور ایسی شاعری نے انسانی ذہنوں کو کس قدر فطری انداز میں متاثر کیا ہے یہ صرف انہیں سننے کے بعد محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کربلا کے واقعہ کے دوران اپنے لخت جگر کی شہادت کے مناظر ہوں، یا بے رحمی کے ساتھ ڈھائے جانے والے دیگر غیر انسانی مظالم، ایسے تصورات کو یک جا کرتے ہوئے، انھیں نظم کی شکل میں ڈھال کر پیش کرنے کے فن کو 'مرثیہ گوئی' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کے واقعات کی تخلیق کر مراثی لکھنے اور خاص انداز میں بیان کر، مرثیہ گوئی کرنے کا شعور اور عبور، جس شخصیت کو حاصل تھا وہ مرزا سلامت علی دبیرؔ تھے۔ اپنے مراثی کے فطری انداز کو لیکر انھیں اسلامی دنیا اور اردو ادب میں خاصی شہرت ملی۔ اردو شاعری کے تحت 'صنفِ مرثیہ' کو فطری بنانے اور اسے عروج تک پہنچانے میں مرزا دبیرؔ کے تعاون کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ایسی ہی کوششوں، کاوشوں اور صلاحیتوں کو عالم اسلام میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جب ایرانی امراء کا اثر اور دبدبا حکومت اودھ پر قائم تھا، تو ایران کی مختلف روایتوں مثلاً روضہ خوانی اور مرثیہ خوانی بھی کثرت سے چلن میں تھیں۔ اس دور میں امام حسینؑ کی عزاداری کی مدّت بارہ دنوں سے بڑھا کر دو ماہ آٹھ دن کر دی گئی، اور یہ سلسلہ ابھی تک قائم ہے۔ ایسے میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ 'مرثیہ تخلیق' کے دو اہم ستون بن کر ابھرے۔ ان میں مرزا دبیرؔ کے مراثی کے متعلق ہم یہاں تفصیل سے ذکر کرنا چاہیں گے۔ مرزا دبیرؔ کے سارے مراثی، مذہبی پیرائے میں آتے ہیں، اور خصوصاً واقعاتِ کربلا کے مناظر دردناک ماحول کے اردگرد گھومتے ہوئے نظر آئیں گے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی ولادت ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو مغلیہ عہد کے دوران ہوئی تھی انھوں نے اپنے واسطے دبیرؔ تخلص چنا۔ انھوں نے اپنے بچپنے سے ماہ محرم میں مرثیہ گوئی کی شروعات کر دی تھی اور بذاتِ خود، وہ مختلف مجالس میں ان مراثی کو اپنے انداز میں سنایا بھی کرتے تھے۔ اس طرح ان کے تحریر کردہ 'مراثی' اور 'فن مرثیہ گوئی'، عزاداری کی روایت کا اہم حصہ بن گئے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے تحریر شدہ ان مراثی میں تاثر اور پختگی کے ساتھ ساتھ ان کی 'مرثیہ گوئی' کے مغموم انداز کو بھی سراہا جانے لگا، اور آہستہ آہستہ مرزا دبیر کے مراثی دہلی کے گلی کوچوں میں شہرت اور مقبولیت کو چھونے لگ گئے۔ کچھ عرصہ بعد مرزا دبیرؔ لکھنؤ ہجرت کر گئے، جہاں کا ماحول ان کے مراثی کے واسطے اور زیادہ سازگار اور موافق تھا۔ چنانچہ یہاں آ کر ان کے 'مراثی' اور 'فنِ مرثیہ گوئی' میں اور زیادہ نکھار پیدا ہو گیا۔ اس طرح لکھنؤ میں عزاداری کا

ماحول بہتر ہوکر ایک روایتی شکل میں تبدیل ہونے لگا۔ ان بدلے حالات کے چلتے مرزا دبیرؔ کی مراثی تحریر کرنے کی اور مرثیہ گوئی کی فنی صلاحیت کے نتیجہ میں لکھنؤ کے اندر دو ماہ آٹھ دنوں کی مدت کے دوران مجالس کے دور چلنے لگے اور واقعات کربلا کا بیان، مرثیہ گوئی کے تحت فروغ پانے لگا اس طرح دیکھتے دیکھتے یہی مرثیہ گوئی عزاداری کا اہم جز بن گئی اور دھیرے دھیرے اس روایت کو لکھنؤ میں زبردست فروغ حاصل ہوگیا، یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ لکھنؤ میں مرزا دبیرؔ کے 'مراثی' واقعات کربلا کی منظر کشی اور عکاسی کا طاقتور ذریعہ بن گئے۔ مرزا دبیرؔ کے مراثی کے ذخیرہ کے سلسلہ میں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ واقعات کربلا کے وقت، وہاں پر موجود نہ رہتے ہوئے بھی، ان تمام واقعاتِ کو ایک چشمِ دید کی طرح نظم میں ڈھالنے اور اپنی مرثیہ گوئی کے ذریعہ دوسروں تک پہنچانے کی بھرپور صلاحیت مرزا دبیرؔ میں موجود تھی۔

مرزا دبیرؔ نے اردو مرثیہ تحریر کرنے کے بعد فارسی زبان میں بھی مدحِ اہلِ بیتؑ کی اور متعدد مجالس میں 'مرثیہ گوئی' بھی کی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں فارسی زبان جاننے والوں کی تعداد خاصی ہوا کرتی تھی۔ غور طلب ہے کہ دبیرؔ کی تخلیقات میں رباعیاں، قطعات، مخمسات، مسدّسات وغیرہ شامل ہیں۔ مرزا دبیرؔ کی ادبی خدمات میں نثر کا بھی خاطر خواہ تعاون رہا ہے۔ اس طرح ہم مرزا دبیر کو عمدہ اسکالر کہہ سکتے ہیں۔

عزاداری کی روایت میں 'مرثیہ نگاری' اور 'مرثیہ گوئی' جیسے فن اصناف میں اپنا انداز پنہا کرنے والے اس عمدہ اسکالر نے ایسے ادبی ذخیرہ کو سلیقہ کے ساتھ عروج اور بلندیاں عطا کیں۔ اس طرح مراثی کو اپنی زندگی کے آخری پڑاؤ تک اپنے ساتھ رکھتے ہوئے ۶ مارچ ۱۸۷۵ء کو لکھنؤ میں انہوں نے وفات پائی۔ جس کے بعد لکھنؤ شہر میں ہی واقع ان کی رہائش کے احاطہ میں انھیں دفنا دیا گیا یہاں ان کی قبر پر ایک مختصر سی عمارت پر مبنی ایک چھوٹا سا مقبرہ بھی تعمیر کیا گیا تھا، جو دورِ حاضر میں انتہائی خستہ حالت میں پہنچ چکا ہے۔ حالانکہ لوکل سلف گورنمنٹ کی سطح پر یہاں واقع ان کے مقبرہ کے احترام میں اس گلی کو 'کوچہ مرزا دبیرؔ' کا نام دیتے ہوئے ایک سرکاری پتھر بھی لگوایا گیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کوچے کی ادبی اہمیت کے سلسلہ میں نہ سرکاری سطح پر اور نہ کسی ادبی ادارہ یا انجمن ہی کی سطح پر ان کی یادگار کو لے کر کوئی بھی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا گیا ہے۔ لہٰذا مرزا دبیرؔ کا یہ مقبرہ اور خستہ حالی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسی مقام پر مرزا دبیرؔ کی حالیہ پشت کے لوگ بھی رہائش پزیر ہیں۔ جو مالی اعتبار سے مقبرہ کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے معمولی بوجھ بھی اٹھا پانے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ مضمون نگار اپنی تحریر کے توسط سے موجودہ سرکار اور مختلف ادبی اداروں نیز انجمنوں سے اپیل کر رہا ہے، کہ اردو ادب میں مرثیہ کی صنف کی اہمیت کے مدّنظر اپنے وقت کے اس اعظیم مرثیہ گو کے مقبرہ کی حالت کی بہتری اور مرمت پر فوری توجہ دیتے ہوئے اسے یادگار بنائے جانے کے موثر قدم اٹھانے کی زحمت کریں۔

❁❁❁❁

بحرِ رثا کا انمول گُہر، مرزا دبیرؔ

نصیر اعظمی

اُردو ادب ہر دور میں اپنی فنی زیبائش اور اُسلوبی آرائش کے سبب عظیم ذخائر میں شمار ہوا اور آج بھی یہ صنف تمام تر کمال و جمال کے ساتھ انفرادیت کی حامل ہے۔ اس صنف میں مرثیہ آج بھی لازوال ہے یہ اس لیے نہیں کہ اس کا تعلق مذہب یا عقیدے سے ہے۔ حالانکہ دنیا کے ادب میں جن نظموں کا شمار آج تک کوئی نہیں ہے ان میں بیشتر نظموں کے محرک مذہبی واقعات اور عقائد تھے اس لیے یہ بات معذرت کی نہیں ہے کہ مرثیے مذہبی واقعات سے متعلق ہیں لیکن دراصل نہ مرثیوں کی عظمت کا سبب مذہب وعقائد ہیں اور اُن عالمی ادب کے عظیم رزمیوں کی عظمت کا سبب ان کے لکھنے والوں کے عقائد تھے۔ عظمت ان واقعات کی انسانی قدروں میں ہے، ان واقعات کو اپنے تخلیقی عمل میں ڈھالنے میں اور اظہار کے ان طریقوں میں ہے اور ان سب چیزوں نے مل کر اسے عالمی کلاسیک یا کسی ادب کی عظیم تخلیق کا درجہ دیا ہے۔

مرثیہ اُردو ادب کی وہ واحد صنفِ سخن ہے جس نے ہیئت کا طویل سفر طے کیا ہے۔ غزل، مثنوی اور قصیدہ بھی اصنافِ سخن میں ہیں لیکن ان کی ہیئتیں ابتدا ہی سے طے تھیں البتہ مرثیے کی کوئی ہیئت نہیں تھی۔ شروع میں جو مرثیے دکن میں لکھے گئے وہ غزل کی طرح الگ الگ اشعار پر مبنی تھی۔ فارسی میں بھی مرثیے کی یہی روایت تھی کہ وہ غزل ہی کے انداز پر لکھے جاتے تھے اور ان کے اشعار میں کوئی تسلسل نہیں ہوتا تھا۔ لوگ مجالسِ عزا کے لیے مرثیے لکھتے تھے ان کا مقصد فقط حصول ثواب تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کا لکھنا پڑھنا اور سننا سب ثواب میں داخل ہو تو ایسے لوگ بھی اسے لکھنے لگیں گے جو فنِ شعر گوئی سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے بہ اعتبارِ فن مرثیے کو کم تر مانا جاتا تھا۔ لوگ بے جھجک جس طرح چاہتے تھے مرثیے لکھتے تھے اور زبان و بیان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ مذہبی عقیدت میں چونکہ غلطیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کے مصائب پر پردہ پڑا رہتا تھا۔ بعض شعرا اور تذکرہ نگاروں نے اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔

سوداؔ نے تو بہت صاف صاف الفاظ میں تنبیہ کی کہ ''لازم ہے کہ مرتّبہ مدِنظر رکھ کر مرثیہ کہے۔ نہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے''۔

مرثیے کی ابتدا:

کہا جاتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں مرثیے کی ابتدا اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوا جبکہ دکن میں اس کا آغاز لگ بھگ دو سو برس پہلے ہو چکا تھا۔ دکن میں خود مختار سلطنتوں میں جو علم و فن کی ترقی میں جو ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتی تھیں مجالس میلاد اور مجالسِ عزا کا بھی خاص دستور پڑ گیا تھا۔ اس قسم کی مجلس کا آغاز بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت میں ہوا مگر اس کے ساتھ ہی قطب شاہوں اور نظام شاہوں نے بھی اس کو رواج دیا تھا۔ بالخصوص مرزا نے جو رواج دکن کی مجالس میں مرثیے کا رائج کیا اسے قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں نے بھی جاری رکھا۔

اُردو مرثیے کی روایت میں ڈاکٹر مسیح الزمان لکھتے ہیں ''اُردو مرثیہ گوئی کی رفتار کا جائزہ لینے کے لیے جب ہمارے بزرگ نقادوں نے قلم اُٹھایا تو زیادہ غور و فکر سے کام لیے بغیر عربی اور فارسی میں اس صنف کے نمونوں کو ان کی بنیاد قرار دیا ہے۔ حالانکہ غزل، قصیدہ اور مثنوی سے مرثیے کی ادبی میراث بالکل مختلف ہے۔

یہ بات نا قابلِ انکار ہے کہ دکن ہو یا شمالی ہند کا علاقہ، دونوں جگہ مراثی کی ہیئت میں واقعیت نظر آتی تھی۔ سادگی کے ساتھ ساتھ جو حقائق ہوتے تھے انھیں بیان کر دیا جاتا تھا۔ ان میں مذہبیت جلوہ گر تھی ادبیت کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ علی قلی ندیمؔ نے اس میں ادبیت کو داخل کیا۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ مرثیہ گو شاعر نہ کہلا کر غزل گو کہلایا۔ البتہ جو سلسلۂ مراثی علی قلی ندیمؔ نے شروع کیا تھا اسے سوداؔ اور میر تقی میرؔ نے کمال تک پہچانے کی کوشش کی اگر چہ یہ دونوں شعرا بھی ایک غزل گو کی حیثیت سے ہی پہچانے گئے۔ مگر ان کے کہے ہوئے مراثی شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوداؔ مرثیے کی صرف رُلانے والی شاعری نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی کتاب سبیلِ ہدایت میں لکھتے ہیں ''لازم ہے کہ مرتبہ درنظر کر کے رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ''۔ یعنی مرثیہ گو کو چاہئے کہ شہدائے کربلا کے مرثیے کو بھی نظر میں رکھے اور محض اپنے سامعین کو رُلانے کی خاطر کوئی ایسی بات زبان قلم پر نہ لائے۔ جو دونوں مرتبہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سوداؔ نے مرثیے تنقیدی انداز میں نہیں کہے۔ بلکہ وہ اس صنف میں اپنے عہد میں ایک مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قیامت سلطنت اودھ کے بعد مرثیے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچا جہاں شاہانِ اودھ کے ساتھ رعایا میں بھی عزاداریٔ امام حسینؑ کے لیے ایک خاص انہماک پایا جاتا تھا۔ عزائے حسینؑ کا ایک اہم مرکز مجلس ہوا کرتی تھی۔ مجلس کا رواج دہلی میں بھی تھا اور لکھنؤ میں بھی لیکن لکھنؤ میں شاہان وقت کی سرپرستی کی بنیاد پر مراثی عروج پاتے گئے۔ اہلِ لکھنؤ کے ادبی ذوق کی بنیاد پر شعرا نے مراثی میں نئی نئی جدتیں پیدا کی اور اسے وسعت عطا کی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اودھ میں مرثیہ خلیقؔ و ضمیرؔ کے بعد میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے ہاتھوں اپنی معراجِ کمال کو پہنچا۔ مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جس کی رگوں میں کئی اصناف کا خونِ جگر دوڑتا ہے مرثیہ گوئی ہو یا مرثیہ خوانی دونوں ہی فنی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر کوئی شاعر مرثیہ گوئی کا سلیقہ تو رکھتا ہو مگر مرثیہ خوانی کے ہنر سے ناواقف ہو تو ایسا مرثیہ کلامِ موزوں کی حیثیت تو رکھتا ہے مگر اثر انگیزی کا حامل نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ جتنے بھی بڑے مرثیہ نگاران گذرے ہیں انھیں اکثر فنِ مرثیہ خوانی کے بھی مالک تھے مگر انیسؔ و دبیرؔ نے فنِ مرثیہ خوانی کو بھی امتیازی شان عطا کی۔

مرثیہ خوانی کی خصوصیات:

بلند خوانی اور آواز کا زیر و بم یہ ہر مرثیہ خواں میں بدرجۂ اتم ہونا چاہئے۔ یعنی مجمع کی آخری فرد تک ایک ایک مصرعہ اور ہر لفظ پہنچنا چاہیئے۔ اگر درمیان میں کوئی لفظ سامع تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے تو سننے والے کا لطف جاتا رہتا ہے اور تسلسل منقطع ہو جاتا ہے۔ مرثیہ خوانی میں اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ لہجہ پُرکشش ہونا چاہیے۔ یعنی سننے والوں کی سماعت پر خوانندگی گراں نہ گزرے۔ جو لفظ جس انداز سے برتی جائے اسے ویسے ہی پیش بھی کیا جائے۔ شعر خوانی میں چونکہ جلد تھک جانے کا امکان ہے لہٰذا سینے کے زور کے ساتھ آواز نکالنے کے بجائے گلے کی آواز کو زیادہ صرف کرنا چاہیے۔ ملا کے پڑھنا یا کئی الفاظ کے درمیان فاصلہ رکھنا ہے ان باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اس طرح پڑھنے والے کے جوہر کھلتے ہیں اور مجلس میں کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ مرثیہ خواں کے لیے Body Language پر دھیان دینا انتہائی لازمی ہے۔ کہاں ہاتھوں کو جنبش دینا ہے۔ کہاں چشم و ابرو کے اشارے سے مصرعہ پہچانا ہے۔ کہاں دائیں اور بائیں جانب رُخ کرنا ہے، کہاں لفظوں میں دھمک پیدا کرنی ہے کہاں مسکرانا ہے اور کب گریہ کرنا ہے، یہ بات بھی ضروری ہے کہ فضائل و مصائب میں

آواز کی کیفیت کی ہونی چاہئے اور فضائل ہے تو تعارف میں فخریہ لہجہ ہو رزم کی باتیں ہوں تو محسوس ہو کہ ایک سپاہی میدانِ جنگ میں پوری تیاری کے ساتھ آیا ہے اور جب مصائب ہو تو خود بھی گریہ کرے جب پڑھنے والے پر تاثر طاری ہوتا ہے تو سامعین میں خود بخود شعورِ گریہ بلند ہو جاتا ہے۔ مرثیہ خوانی میں مشق کا بڑا کردار ہے یعنی پڑھنے کے پہلے مرثیے کو دھرایا جائے اور پورے جوش وولولے کے ساتھ۔ یہی اساتذۂ فن کا بھی دستور رہا ہے۔

قائدہ تحت لفظ خوانی میں سیّد مہدی حسین مرثیہ خواں نے لکھا ہے ''مرثیہ خواں کے لیے لازم ہے کہ وہ ''نشستِ منبر درست کرے اور پہلے چاروں طرف دیکھے اچھی طرح سے نظارہ کرے کہ سب طرف کے دیکھنے سے دل کا دھڑکا دفع ہوتا ہے طبیعت کو اطمینان معلوم ہوتا ہے۔ رعبِ مجلس حاوی نہیں ہوتا''۔

حیاتِ دبیرؔ میں سیّد افضل حسین ثابتؔ لکھنوی نے مرزا دبیرؔ کے ایک شاگرد میر محمد رضا ظہیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ہر روز تنہائی میں ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ پڑھتے تھے۔ بعض مصرعے کو بیس بیس مرتبہ مختلف طرز اُتار چڑھاوے پڑھتے تھے جب جا کر ان کو اطمینان ہوتا تھا۔

رثائی ادب میں مرزا دبیرؔ کا حصہ:

۲۹/اگست ۱۸۰۳ھ کو دہلی کے محلہ بلّی ماراں میں مرزا سلامت علی دبیرؔ متولد ہوئے۔ ابھی آپ پانچ برس کے ہی تھے آپ کے والد مرزا غلام حسین نے دہلی کو خیر باد کہا اور لکھنؤ کو آباد کیا اور یہاں محلّہ نخاس میں مقیم ہوئے۔ ابتدا سے ہی مرزا دبیرؔ کی تعلیمات پر زور دیا گیا۔ عربی اور فارسی کی مستند کتابیں آپنے لکھنؤ کے علما سے پڑھیں۔ صرف ونحو منطق ادب اور حکمت میں مولوی غلام علی ضامن کی شاگردی اختیار کی اور حدیث اصولِ حدیث اور فقہ وغیرہ مولوی کاظم علی اور مولوی فدا علی صاحبان سے حاصل کی۔ شعر کوئی میں بھی مرزا دبیرؔ نے ان اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ اور یہیں سے آپ کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ ہونے لگا۔

دبیرؔ نے فنِ شعر گوئی میں اپنے اساتذہ اور معلّمین ادب سے فیض اُٹھایا لیکن اُردو ادب کی کلاسیکی روایت میں تو شاعری ایک ایسا عمل رہی ہے کہ پشت پر اگر کوئی استاد نہ ہو تو سوسائٹی اسے شاعر ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ مرزا غلام حسین نے جب اپنے بیٹے کو موزوں طبع پایا تو شاگردی کے لیے میر ضمیرؔ کے پاس لے گئے۔ ضمیرؔ نے دبیرؔ سے کچھ سوالات کیے جس کا انھوں نے خاطر خواہ جواب دیا۔ پھر ضمیرؔ نے پوچھا میاں کچھ کہا بھی ہے اس پر دبیرؔ نے اثبات میں جواب دیا تو میر ضمیرؔ نے سنانے کو کہا۔ مرزا دبیرؔ نے فوراً ایک قطعہ سنایا۔

کسی کا کندہ نگینے پر نام ہوتا ہے کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر کسی کا کُوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ سنتے ہی میر ضمیرؔ مسکرائے اور دبیرؔ کو اپنی شاگردی میں لے لیا اور فرمایا:-

''بر دبیران روشن ضمیرؔ مخفی و متعجب نماند''

صاحب زادے میں نے اپنے نام پر تمہارے نام کو مقدم کر دیا ہے۔ ضمیر کی شاگردی کے بعد دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ لکھنؤ میں مرزا دبیرؔ مشہور ہونے لگے۔ یہ شہرت جب خواص تک پہنچی تو والیٔ اودھ غازی الدین حیدر کو مرثیہ سننے کا اشتیاق ہوا۔ آپ

نے ایک خصوصی مجلس برپا کی اور دبیرؔ کو پڑھنے کی دعوت دی۔ مرزا دبیرؔ تاریخِ مقررہ پر شاہی عزاخانے میں پہنچے۔ منبر پر آئے تو سب سے پہلے حمد و نعت کے اشعار سنائے اس کے بعد بادشاہ کی شان میں مسدس کا ایک بند پڑھا جو فی البدیہہ راستے میں کہہ لیا تھا۔ اس واقعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرزا دبیرؔ ابتدا ہی میں ایک عمدہ مرثیہ گو کی حیثیت سے شہرت پا گئے تھے۔ ضمیرؔ کے دیگر شاگردوں کو یہ شہرت کھلنے لگی چنانچہ طرح طرح کی سازشیں رچتے رہے ان کے مابین دڑاریں ڈالنے کی اور پھر اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ ایک عرصے تک ضمیرؔ و دبیرؔ کے رشتے منقطع رہے مگر ۱۸۴۷ء میں علی نقی خاں (واجد علی شاہ کے وزیر) نے ایک مجلس کا اہتمام کیا جس میں تمام شاہزادگان حکّام اور معزز حضرات موجود تھے۔ مرزا دبیرؔ کو مرثیہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ اور مرزا نے یہ مرثیہ پڑھا ''اَے عرشِ بریں تیرے ستاروں کے تصدق'' مجلس میں میر ضمیر بھی موجود تھے۔ مرثیے کے دوران جب علی نقی خاں نے با آواز بلند دبیرؔ کی تعریف کی تو دبیرؔ نے ضمیر کی طرف اشارہ کیا اور بآواز بلند کہا یہ سب فیض و تصدق جنابِ اُستاد کا ہے۔ مجلس ختم ہونے کے بعد ضمیرؔ نے دبیرؔ کو گلے سے لگا لیا اور اس طرح سارا گِلہ جاتا رہا۔ مصالحت کے بعد دبیرؔ ہمیشہ میر ضمیرؔ کے یہاں سالانہ مجلس پڑھنے لگے۔ یہ سلسلہ ضمیرؔ کے انتقال کے بعد اُن کے سویم کی مجلس تک چلتا رہا۔

امجد علی شاہ کے زمانے میں میر انیسؔ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے ان کے آنے پر لکھنؤ کی ادبی فضا میں ایک نئی لہر پیدا ہوئی اور ادبی حلقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا اور پھر ان کے درمیان من گھڑت واقعات رونما ہونے لگے جن کا حقائق سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔

ایک واقعہ یوں بھی ملتا ہے کہ انیسؔ کے ایک فدائی نے بیان کیا ہے کہ ایک مجلس میں مرزا صاحب مرثیہ پڑھ کر منبر سے اُترے تو جناب مفتی میر عباس جو اس مجلس میں موجود تھے مرزا کو گلے لگا کر فرمانے لگے ''ماشاءاللہ'' مرزا صاحب آپ خوب فرماتے ہیں مگر اپنا مرثیہ میر انیسؔ کو دکھا لیا کیجئے تو خوب ہوگا''۔ وہیں ایک دبیرؔ نواز کھڑا تھا فوراً کہا ''جناب میر انیسؔ صاحب خود فرماتے تھے کہ میں نے ایک بند مقطع کا دعائیہ نظم کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یا خدا اپنی مداحی کے صدقے میں مجھے گہرِ مضمونِ بیش بہا عطا فرما۔ دن کو یہ نظم کیا شب کو عالم رویا میں کیا دیکھتا ہوں کہ امام مظلومؑ مجھ سے فرماتے ہیں اے فرزند تم مجھ سے گہرِ مضمونِ بیش بہا کیا مانگتے ہو حق سبحانہٗ تعالیٰ نے تمام معدنِ گہرِ مضمون کا دبیرؔ کے نام پر ٹھیکا کر دیا ہے اب سوائے دبیرؔ کے کسی کو نہیں مل سکتا۔ تم انھیں کے پاس جاؤ وہ تمہیں تعلیم دیں گے''۔

اسی طرح کی بے پر کی باتیں دونوں کے شائقین و عاشقین کے درمیان برابر چلتی رہتی تھیں۔ لیکن مرزا دبیرؔ کے دل میں میر انیسؔ سے جو محبت اور احترام تھا وہ انیسؔ کے انتقال کے بعد مرزا دبیرؔ کی تعزیتی نظم اور بالخصوص تاریخِ وفات کے مصرعے سے عیاں ہے ''سال تاریخش بُز بروبینہ شد زیب نظم

طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ''

میر انیسؔ کے انتقال کے بعد مرزا دبیرؔ کے ذہن پر بہت گہرا اثر ہوا اور آپ مستقل طور پر علیل رہنے لگے۔ آخری دنوں میں ورمِ کبد کی شکایت ہو گئی تھی علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور بالآخر ۹ مارچ ۱۸۷۵ء کو چہ دبیرؔ محلّہ نخاس میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

❀❀❀❀

مرزا دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات

تحریر سید شاہ زمان شمسی

''ذوقِ الٰہی'' ایک لطیف اور گہرے روحانی تجربے کی نمائندگی کرتا ہے جس میں انسان کی روح خدا کی صفات، اُس کی قدرت اور اُس کی حکمت کو نہ صرف عقیدت کے طور پر بلکہ ایک فکری اور ذاتی تعلق کے طور پر محسوس کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا جذبۂ عقیدت ہے جو انسان کو خدا کے وجود اور اس کی عظمت کی حقیقتوں کے ساتھ ایک روحانی ہم آہنگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہ کسی خاص مذہبی یا عقیدتی نظریے تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کے اندر خدا کی حقیقت کو سمجھنے اس کے ساتھ ایک معنوی تعلق قائم کرنے اور اس کی صفات کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے کا عمل ہے۔

شاعری میں ''ذوقِ الٰہی'' ایک ایسا جمالیاتی تجربہ بنتا ہے جس میں شاعر اپنی تخلیقی قوت کو خدا کی صفات کے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ ذوق محض ایک فکری دریافت نہیں، بلکہ ایک جمالیاتی اور روحانی بیداری ہے جو شاعر کے کلام میں ظاہر ہوتی ہے۔ جب شاعر خدا کی عظمت اور اس کی صفات کو بیان کرتا ہے، تو وہ اپنے شعری ہنر کے ذریعے خدا کی حقیقت کو انسانی ذہن کے قریب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں ہر لفظ اور ہر استعارہ ایک ایسا دروازہ کھولتا ہے جس سے قاری کو خدا کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے۔

''ذوقِ الٰہی'' کا مفہوم یہ بھی ہے کہ شاعر یا فنکار اپنی تخلیق کے ذریعے خدا کے ساتھ ایک ذاتی اور روحانی تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں خدا کی صفات، اس کی قدرت اور اس کی حکمت کو نہ صرف عقیدہ یا مذہب کے طور پر بیان کرتا ہے بلکہ یہ حقیقت اس کے اندر ایک خاص جمالیاتی اور وجدانی لذت پیدا کرتی ہے جو اس کی تخلیقی صلاحیت کو نئی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔ اس ذوق کا اظہار صرف لفظوں میں نہیں ہوتا بلکہ یہ شاعر کی روح کی گہرائیوں سے نکل کر اس کے کلام میں شعور کی ایک نئی جہت پیدا کرتا ہے۔ ''ذوقِ الٰہیات'' سے مراد وہ روحانی اور فکری لذت ہے جو ایک شخص یا شاعر خدا کی صفات اس کی عظمت اور اس کی حکمتوں کو سمجھ کر محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک خاص فکری سطح پر دل کی گہرائیوں سے جڑتا ہوا تجربہ ہے جہاں انسان اپنی محدودیت کو تسلیم کرتے ہوئے خدا کی لامحدود قدرت کا اعتراف کرتا ہے۔ اس میں محض عقیدت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ذاتی، فکری اور روحانی دریافت ہے جو ایک شخص کو اپنے وجود اور کائنات کے مقصد کے بارے میں غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ایک بلند اور متعالی کیفیت کا نام ہے جس میں شاعری اور الفاظ کے معانی کا جوہر اس وقت کُھلتا ہے جب شاعر خدا کی حقیقت کو شاعری کے ذریعے ایک منفرد زاویے سے بیان کرتا ہے۔ اس میں شاعری محض حسنِ کلام کا مظہر نہیں رہتی بلکہ وہ ایک دروازہ بن جاتی ہے جس کے ذریعے انسان اپنی روحانی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ذوق ایک لطیف تفکر کا نتیجہ ہے جس میں شاعر خدا کی تخلیق اس کی حکمتوں اور اس کی قدرت کو نہ صرف روحانی اعتبار سے تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے اپنے فنی اور شعری اظہار کا حصہ بناتا ہے۔

انسان کا شعور دراصل اس کی روحانی اور فکری بیداری کی علامت ہے جو اسے کائنات کی حقیقتوں سے آگاہی فراہم کرتا ہے اور اسے اپنی موجودگی کے مقصد کا ادراک دلاتا ہے جب انسان میں شعور کی پہلی کرن پھوٹتی ہے تو وہ خود کو اپنی حقیقت سے متعارف کرانے کی کوشش کرتا ہے اور یہی لمحہ ہوتا ہے جب اس کا تعلق اللہ سے بھی نمو پذیر ہوتا ہے شعور کے اس سفر میں انسان ایک مرحلے پر اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی کائنات کا حقیقی مفہوم صرف اور صرف اس اعلیٰ حقیقت سے جڑا ہوا ہے جسے ہم اللہ کی ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔

شعور کا آغاز ایک نیا سفر ہوتا ہے جو انسان کو مادی دنیا سے آگے بڑھا کر روحانی حقیقتوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ ایک ارتقائی عمل ہے جہاں انسان اپنے اندر کی خاموش آواز کو سن کر اللہ کی ہدایت کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ جیسے جیسے انسان کا شعور پختہ ہوتا ہے، وہ اپنی زندگی میں خدا کی موجودگی اس کی رہنمائی اور اس کی عظمت کو ہر لمحے محسوس کرتا ہے۔ اس کی روحانیت اور ایمان میں گہرائی آتی ہے اور اس کا تعلق اللہ کے ساتھ ایک ٹھوس اور پائیدار تعلق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

جب انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے تو وہ محض ایک دینی عقیدہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ایک زندہ، پائیدار اور ذاتی تعلق کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ تعلق صرف عقیدت کا معاملہ نہیں بلکہ ایک سمجھ ایک آگاہی اور ایک احساس کا نتیجہ ہوتا ہے جو انسان کو اپنے مقصدِ حیات اور کائنات کے معانی سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ تعلق اس کے روزمرہ کے فیصلوں میں اس کی اقدار میں اور اس کی زندگی کی سمت میں نظر آتا ہے۔

یوں، شعور کا بیدار ہونا انسان کی روحانی بیداری کی ابتدا ہے جو اس کے اللہ کے ساتھ تعلق کو نہ صرف مضبوط کرتا ہے بلکہ اس میں ایک عمیق، ٹھوس اور پائیدار نوعیت پیدا کرتا ہے۔ جب انسان اپنے اندر کی حقیقت کو پہچان لیتا ہے، تو وہ اللہ کی ہدایت کو ایک روشنی کے طور پر دیکھتا ہے، جو اسے راستے کی سچائیوں سے آگاہ کرتی ہے اور اس کے روحانی سفر کی تکمیل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

زندگی کی راہوں میں جب مشکلات الجھنیں اور درد آجاتے ہیں اور انسان خود کو بے یار و مددگار محسوس کرتا ہے تب ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو اپنی حقیقت اور اس کی کمزوری کا شعور دلاتی ہے۔ ایسے میں جب ہر طرف سے مایوسی اور بے بسی کا سایہ چھا جاتا ہے اور کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تو بے ساختہ دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پکار نکلتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان کا تعلق اللہ سے ایک ٹھوس، مضبوط اور ذاتی نوعیت کا بن جاتا ہے جو صرف دعا یا عبادت کا معاملہ نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ اور مکمل تعلق بن کر ابھرتا ہے۔ جب انسان کی کمر ٹوٹنے والی ہوتی ہے اور وہ احساس کرتا ہے کہ اب کوئی ہاتھ تھامنے والا نہیں تب اللہ کی ذات پناہ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ کی مدد کی امید میں جب انسان دل سے اُمید کی ایک کرن دیکھتا ہے تو وہ تکلیفیں، مصائب اور درد بھی ایک نیا معنی اختیار کر لیتے ہیں۔ اللہ کی قربت میں وہ احساس ہوتا ہے کہ انسان جتنی بھی مشکلات کا سامنا کرے کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا تعلق ہے جو محض لفظوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں گونجتا ہے اور انسان کا پورا وجود اللہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

یقیناً اللہ سے تعلق کا یہ دروازہ اتنی شدت سے کھلتا ہے کہ انسان کی روح اور دل کی ہر گزرگاہ پر ایک سکون کا چھا جانا لازمی بن جاتا ہے۔ جب زندگی میں مشکلات، دکھ، درد اور الجھنیں اپنی انتہاؤں کو چھوتی ہیں تب اللہ کی ذات انسان کو احساس دلاتی ہے کہ وہ ہمیشہ ساتھ ہے، ہر لمحہ، ہر پل اور ہر حال میں۔ انسان کا دل اللہ کی محبت اور مدد کے یقین سے پُر ہو جاتا ہے اور وہ زندگی میں خود کو لاوارث محسوس کرنے کی بجائے

اس میں ایک مقدس مقصد دیکھتا ہے۔

یہ تعلق ایک روحانی قوت اور سکون کی مانند ہوتا ہے، جو ہر تکلیف کو ہلکا کر دیتا ہے اور انسان کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اللہ کے بغیر کوئی چیز مکمل نہیں اور اس کے بغیر انسان کا سفر غیر ممکن ہوتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اپنے درد اور الم کو اللہ کی رضا میں ڈال کر سکون کا احساس پاتا ہے اور اپنی زندگی کو لاوارثوں کی طرح نہیں بلکہ ایک تقدیر کے ہاتھوں میں سمجھتا ہے جو ہمیشہ اس کی حفاظت کرتی ہے۔

اس تعلق میں ایک عجب سکون ہوتا ہے جو انسان کے دل و دماغ میں رسوخ کر کے اُسے تسلی دیتا ہے۔ اللہ کی مدد پر یقین انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہے اس کی دعائیں ضائع نہیں جاتیں اور اس کا درد بالآخر ختم ہوگا۔ اس تعلق میں انسان کا ہر خوف ہر دکھ اور ہر غم اللہ کی رضا میں ڈھل جاتا ہے اور اس کا دل اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس تعلق کی شدت اتنی گہری ہوتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو بالکل مختلف انداز میں دیکھتا ہے۔ اس کی تکالیف میں ایک نئی معنویت آ جاتی ہے وہ زندگی کو نہ صرف بہتر طریقے سے گزارنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اللہ کی رضا کی جانب اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

جب ہم اللہ کو مدد کے لیے پکارتے ہیں تو یہ صرف ایک لفظ یا ایک دعا کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک دل سے دل تک کا تعلق بنتا ہے جس میں ہم اپنی تمام تر کمزوریوں پریشانیوں اور مشکلات کو اللہ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اللہ کی مدد سے انسان نہ صرف اپنے دکھوں کو کم کر پاتا ہے بلکہ اسے ایک نیا حوصلہ ایک نئی توانائی ملتی ہے جو اسے زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت دیتی ہے۔ اس تعلق میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ تنہا نہیں ہے، بلکہ اللہ کی ہدایت اور مدد ہمیشہ اس کے ساتھ ہے چاہے حالات جیسے بھی ہوں۔

یہ تعلق انسان کے دل کو ایک پناہ گاہ مہیا کرتا ہے جہاں وہ اپنی تمام تر بے بسی اور غم کو اللہ کے حوالے کر دیتا ہے، اور پھر وہ زندگی کے ہر چیلنج کا سامنا ایک نئے اعتماد کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی رضا میں ہی سکون ہے اور اس کا ہر درد اس کی تقدیر کے مطابق ہے۔ اس تعلق میں وہ اطمینان اور سکون حاصل کرتا ہے جو دوسروں سے نہیں مل سکتا اور وہ اپنی زندگی کو کسی بھی حال میں اللہ کے سائے میں مکمل محسوس کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات ایک منفرد اور گہرا ادبی تجربہ ہے جس میں انھوں نے خدا کی صفات اس کی عظمت اور اس کی تخلیقی طاقت کو نہ صرف شاعری کے ذریعے بیان کیا بلکہ ان میں ایک فلسفیانہ اور روحانی جہت بھی شامل کی ہے۔ دورانِ مطالعہ جب مرزا دبیرؔ کے مراثی ہماری نگاہوں کے سامنے تھے تو اُن کے کچھ مخصوص بند پڑھنے کو ملے جس میں خدا کی ذات کی گہرائیوں کو جھانکنے کا مجھے موقع ملا۔ اس حقیر و فقیر نے ان کے کلام میں خدا کی حاکمیت، جلال، رحمت، اور اس کی بے پایاں قدرت کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ مرزا دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات محض عقیدت یا مذہبی فلسفہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا ادبی منظر نامہ ہے جہاں شاعر نے خدا کی موجودگی کو ایک زندہ محسوس اور فنی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں خدا کے ساتھ انسان کا تعلق محض دعا اور عبادت تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک ذاتی، روحانی اور فکری تجربہ بن کر ابھرتا ہے جو قاری کو ایک گہرے فہم و ادراک کی جانب لے جاتا ہے۔

مرثیہ نگاری برصغیر کی شعری روایت میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور مرزا دبیرؔ اس روایت کے ایک روشن ستارے ہیں۔ ان کی

شاعری میں نہ صرف واقعۂ کربلا کی جذباتی تصویریں ملتی ہیں بلکہ ان کے کلام میں الٰہیات کے عمیق اور گہرے مضامین بھی واضح نظر آتے ہیں۔ یہ مضامین ان کے شعری وجدان، فلسفیانہ گہرائی اور عقیدے کی پختگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ مرثیے کا بند

اے جلِّ شانہٗ وہ غفور و رحیم ہے رحمان و مستعان و رؤف و حلیم ہے
ہم سب ہیں درد مند وہ کُل کا حکیم ہے اُس کے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے؟
ایماں بھی دے مراد بھی دے عزّ و جاہ بھی
روزی بھی بخشے خلد بھی بخشے گناہ بھی

مرثیے کے مذکورہ بند میں مرزا دبیرؔ نے خدا کی صفات اور اس کی وحدانیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے دل میں خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ''غفور ورحیم'' اور ''کُل کا حکیم'' جیسی تعبیرات سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر خدا کی صفتِ مغفرت اور اس کی حکمتِ کاملہ کو اپنے شعری اظہار کا محور بناتا ہے۔ ان الفاظ میں ایک طرف محبت اور بخشش کا ذکر ہے تو دوسری طرف خدا کی ہمہ گیریت اور قادرِ مطلق ہونے کی گواہی دی گئی ہے۔

مرزا دبیرؔ کے اس بند میں خدا کی صفات کا بیان نہایت شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں ہوا ہے۔ ''رحمان ومستعان ورؤف وحلیم'' جیسی صفات کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ محض رسمی ذکر نہیں لگتا، بلکہ اس میں شاعر کے دلی جذبات اور عقیدے کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ انداز نہ صرف مرثیہ نگاری کو ایک بلند فکری مقام عطا کرتا ہے بلکہ دبیرؔ کے ذوقِ الٰہیات کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

شاعر نے خدا کی صفتِ کریم کا ذکر کرتے ہوئے سوالیہ انداز اپنایا ہے ''اُس کے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے؟'' یہ اسلوب قاری کو خود احتسابی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس سوال کے ذریعے شاعر نے نہ صرف خدا کی عظمت کا اعتراف کیا ہے بلکہ انسان کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ اپنی محدودیت کا ادراک کرے اور اپنی امیدیں صرف خدا سے وابستہ رکھے۔

مرزا دبیرؔ کی شاعری میں الٰہیات کے مضامین کا یہ پہلو ان کے شعری ذوق کی وسعت اور گہرائی کا مظہر ہے۔ وہ نہ صرف خدا کی صفات کو بیان کرتے ہیں بلکہ انھیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کا دل روحانی سکون اور خدا کی محبت سے بھر جاتا ہے۔ اس بند کا آخری مصرع اس بات کی بہترین مثال ہے

ایماں بھی دے ، مراد بھی دے ، عزّ و جاہ بھی روزی بھی بخشے ، خلد بھی بخشے ، گناہ بھی

یہاں خدا کی بخشش، مہربانی اور فراخی کا ایسا جامع تصور پیش کیا گیا ہے جو دبیرؔ کے عقیدے کی گہرائی اور ان کی شعری مہارت کا آئینہ دار ہے۔ شاعر نے خدا کو وہ ذات قرار دیا ہے جو نہ صرف انسان کی جسمانی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے بلکہ گناہوں کو بھی معاف کرتی ہے۔

مرزا دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات ان کے مرثیے کی فکری جہت کو مزید گہرا اور بلند کرتا ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف جذباتی تاثر دیتی ہے بلکہ عقلی اور روحانی طور پر بھی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج بھی فکری اور جذباتی سطح پر اتنا ہی اہم اور قابلِ قدر ہے جتنا کہ ان کے دور میں تھا۔

مرزا دبیرؔ کی شاعری کو محض مرثیہ نگاری کے پیرائے میں محدود کرنا ان کے شعری فن اور فکری وسعت کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کا کلام محض سانحۂ کربلا کے بیان تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسانیت، فلسفہ، اخلاقیات، اور الٰہیات کے گہرے مضامین پوشیدہ ہیں۔ خاص طور پر خدا کی صفات اور اس کی الوہیت کا بیان ان کے کلام کو روحانی بلندی عطا کرتا ہے۔

مرثیے کے جس بند کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، وہ دبیرؔ کے ذوقِ الٰہیات کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ بند نہ صرف ایک جذباتی تاثر پیدا کرتا ہے بلکہ ایک فکری عمق بھی رکھتا ہے۔ خدا کی صفات کو شعری انداز میں پیش کرنا نہایت مشکل کام ہے، کیونکہ یہ موضوع نہایت حساس اور فکری گہرائی کا متقاضی ہوتا ہے۔ مرزا دبیرؔ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ خدا کی صفات جیسے ''غفور''، ''رحیم''، ''کریم''، اور ''حلیم'' کو اپنے مرثیے کا حصہ بنایا ہے، جو ان کے فکری افق کی وسعت اور شعری ہنر کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔

دبیرؔ کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ فلسفیانہ خیالات کو عام فہم زبان اور دلنشین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ خدا کی صفتِ ''حکمت'' کو بیان کرتے وقت ''کُل کا حکیم'' کہنا اس بات کا مظہر ہے کہ وہ خدا کو انسان کی تمام تر علمی اور فکری محدودیت سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ یہ اصطلاح نہ صرف خدا کے حکیم مطلق ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ انسان کو اپنی محدودیت کا احساس دلانے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

دبیرؔ کے شعری ذوق کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نہایت جامع انداز میں خدا کی صفات کو پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر

''ایماں بھی دے ، مراد بھی دے ، عزّ و جاہ بھی روزی بھی بخشے ، خلد بھی بخشے ، گناہ بھی''

یہ اشعار خدا کی ذات کو انسان کے لیے ایک مکمل اور بے عیب سہارا قرار دیتے ہیں۔ یہاں شاعر نے انسان کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے خواہ وہ روحانی سکون ہو یا دنیاوی کامیابی۔ اس اندازِ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ دبیرؔ کا عقیدہ ایک متوازن نقطۂ نظر کا حامل ہے جہاں دنیا اور آخرت دونوں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

مرزا دبیرؔ کے اِلٰہی ذوق کو سمجھنے کے لیے اُن کے اسلوب کی باریکیوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ ان کے کلام میں خدا کی صفات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسان کی عاجزی اور محدودیت کا تصور بھی موجود ہے۔ خدا کی تعریف میں جہاں وہ ''غفور و رحیم'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں وہیں انسان کے لیے بخشش اور رہنمائی کی ضرورت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات محض عقیدے کی سطح پر نہیں بلکہ ایک عملی شعور کا حامل ہے۔

دبیرؔ کا یہ وصف کہ وہ روحانی مضامین کو شعری قالب میں ڈھالنے کا ہنر رکھتے ہیں ان کے مرثیے کو ایک بلند ادبی مقام عطا کرتا ہے۔ ان کے کلام میں خدا کی صفات کو بیان کرتے ہوئے جذبات اور عقل کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار قاری کو نہ صرف کربلا کی یادوں میں غمزدہ کرتے ہیں بلکہ خدا کی عظمت کا احساس بھی دلانے لگتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ ان کا شعری وجدان، ان کا فکری شعور، اور ان کا عقیدہ، سب مل کر ان کی شاعری کو ادب میں ایک خاص مقام عطا کرتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دبیرؔ کی شاعری خدا کی محبت، عظمت، اور حکمت کا ایک زندہ شاہکار ہے جو آنے والے زمانوں کے لیے بھی عرفانِ اِلٰہی کا

ذریعہ رہے گی۔

مرزا دبیرؔ کے کلام کو گہرائی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الٰہی ذوق میں محض مذہبی عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ ایک مکمل فلسفیانہ نظام ہے جو انسان، خدا اور کائنات کے تعلق کو نکھارتا ہے۔ دبیر کے ہاں الٰہی صفات کے بیان میں تین اہم جہات نمایاں نظر آتی ہیں: انسانی فطرت کا تجزیہ، خدا کی قدرت کا اعتراف اور کائنات کے نظام میں خدا کی موجودگی کا شعری اظہار۔ یہ تمام پہلو نہایت دلکش اور مربوط انداز میں ان کی شاعری میں جھلکتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کی شاعری میں انسان اور خدا کے درمیان رشتہ نہایت گہری بصیرت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں خدا کو نہ صرف ایک حاکم کے طور پر پیش کیا گیا ہے بلکہ ایک محبت کرنے والے، معاف کرنے والے اور سرپرست کے طور پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

''ایماں بھی دے، مراد بھی دے، عزّ و جاہ بھی روزی بھی بخشے، خلد بھی بخشے، گناہ بھی''

یہ اشعار اس بات کا مظہر ہیں کہ دبیرؔ کے نزدیک خدا انسان کے تمام پہلوؤں خواہ وہ مادی ہوں یا روحانی، کا کفیل ہے۔ یہاں خدا کو صرف نعمتیں دینے والا ہی نہیں بلکہ گناہوں کو معاف کرنے والا بھی کہا گیا ہے۔ یہ تصور دبیرؔ کے ہاں انسان کی کمزوریوں کا اعتراف اور خدا کی رحمت پر بھروسے کی عکاسی کرتا ہے۔

دبیرؔ کے ہاں الٰہی صفات کا بیان محض عقیدے یا فلسفے کی بات نہیں بلکہ ایک جمالیاتی تجربہ بھی ہے۔ وہ خدا کی صفات کو شعری حسن اور تخلیقی نفاست کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہاں دبیرؔ خدا کی صفات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ قاری کو ایک روحانی مسرت اور جمالیاتی لطف فراہم کرتا ہے۔ ''غفور'' اور ''رحیم'' جیسی صفات خدا کی مہربانی اور محبت کی جانب اشارہ کرتی ہیں جبکہ ''کُل کا حکیم'' خدا کی ہمہ گیریت اور قادرِ مطلق ہونے کا اقرار ہے۔ دبیرؔ کا یہ انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ ان کے کلام میں نہایت متوازن طریقے سے خدا کی محبت، قدرت، اور حکمت کو پیش کیا گیا ہے۔

مرزا دبیرؔ کی شاعری میں الٰہیات کا ایک اہم مقصد قاری کی روحانی تربیت ہے۔ وہ خدا کی صفات کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ قاری کو اپنے اعمال پر غور کرنے اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرنے کی تحریک ملتی ہے۔

اُس کے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے؟

یہ سوال صرف خدا کی تعریف کا اظہار نہیں بلکہ انسان کو یہ یاد دلانے کی کوشش ہے کہ دنیا کی تمام مدد اور راحت خدا کی ذات سے وابستہ ہے۔ یہ انداز دبیرؔ کے شعری کمال اور فکری گہرائی کو ظاہر کرتا ہے، جہاں ان کی شاعری محض تفریح یا جذباتی تاثر کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک گہرے روحانی مقصد کی حامل ہوتی ہے۔

مرزا دبیرؔ کے کلام میں خدا کی وحدت اور کائناتی نظام کے ذکر کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ وہ خدا کو نہ صرف انسانوں بلکہ تمام مخلوقات کا مالک اور محافظ قرار دیتے ہیں۔ یہ تصور ان کی شاعری کو محض انسانی جذبات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے کائنات کے وسیع تر تناظر میں پیش کرتا ہے۔

''رحمان و مستعان و رؤف و حلیم ہے''

یہ مصرع اس بات کا اظہار ہے کہ خدا کی صفات صرف انسانوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ پوری کائنات پر محیط ہیں۔ دبیرؔ کے اس بیان سے ان کے وسیع فکری دائرے کا اندازہ ہوتا ہے، جہاں وہ خدا کی وحدانیت اور کائناتی تنظیم کو ایک ساتھ بیان کرتے ہیں۔

دبیرؔ کے مرثیے میں الٰہیات کا ایک اور نمایاں پہلو اخلاقی تربیت ہے۔ ان کے ہاں خدا کی صفات کو بیان کرتے ہوئے انسان کو عاجزی، شکرگزاری، اور محبت کا درس دیا جاتا ہے۔ دبیرؔ کے کلام میں خدا کی رحمت اور انسان کی خطاؤں کا ذکر قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ انسان کی اصل عظمت خدا کے سامنے جھکنے اور اس کی رحمت طلب کرنے میں ہے۔

مرزا دبیرؔ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الٰہی صفات کو انتہائی سادہ مگر دلنشین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار قاری کے دل کو چھوتے ہیں اور اسے خدا کی محبت اور عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کا کلام ایک شاعر کی روحانی واردات اور عقیدے کا آئینہ دار ہے جہاں الفاظ کے ذریعے خدا کی صفات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ بحث بند میں دبیرؔ نے خدا کی الوہیت، قدرتِ کاملہ، اور انسان کی عاجزی کو شاعرانہ چاشنی کے ساتھ بیان کیا ہے، جو ان کے ذوقِ الٰہیات کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔

طغرہ نویسِ کن فیکوں ذوالجلال ہے — فرمانِ حق میں سلطنتِ بے زوال ہے
بندے سے ہو خدا کی ثنا یہ مجال ہے — اس جا زبان طُوطیِ سدرہ کی لال ہے
عالَم کو اپنے زور کا عالم دکھا دیا — ظلمت کو نور خاک کو آدمؑ بنا دیا

۱۔ ''طغرہ نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے''

یہ مصرع خدا کی تخلیقی قوت اور اس کی قدرت کو بیان کرتا ہے۔ ''کن فیکوں'' کا ذکر قرآن مجید کی ایک آیت سے ماخوذ ہے جہاں خدا کا صرف یہ فرمانا کہ ''ہوجا'' اور وہ شے وجود میں آجاتی ہے، اس کی قدرتِ کاملہ کا مظہر ہے۔ دبیرؔ نے اس قرآنی تصور کو نہایت شاعرانہ انداز میں ''طغرہ نویس'' کے استعارے سے جوڑا ہے، جہاں خدا کی تخلیقی قوت کو ایک شاہانہ فرمان کی حیثیت دی گئی ہے۔ ''ذوالجلال'' کا اضافہ خدا کی عظمت اور جلال کو مزید نمایاں کرتا ہے۔

۲۔ ''فرمانِ حق میں سلطنتِ بے زوال ہے''

دبیرؔ خدا کی حکمرانی کو ''سلطنتِ بے زوال'' کے طور پر بیان کرتے ہیں، جو نہایت جامع اور بلیغ انداز ہے۔ اس مصرع میں خدا کی بادشاہی کے ابدی اور غیر متزلزل ہونے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دبیرؔ کے اس بیان میں خدا کے زمان و مکان سے ماورا ہونے کا تصور موجود ہے، جو ایک طرف خدا کی لامحدود طاقت کو بیان کرتا ہے اور دوسری طرف انسان کی فانی اور محدود حیثیت کو اجاگر کرتا ہے۔

''بندے سے ہو خدا کی ثنا یہ مجال ہے — اس جا زبان طوطیِ سدرہ کی لال ہے''

یہاں دبیر نے خدا کی مدح کو ایک انتہائی لطیف اور فلسفیانہ پہلو کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان، جو کہ

ایک محدود اور فانی مخلوق ہے خدا کی لامحدود عظمت اور صفات کو پوری طرح بیان کرنے سے قاصر ہے۔ ''طوطیِ سدرہ کی لال'' کا استعارہ نہایت حسین ہے جو فرشتوں یا مقرب ارواح کی خدا کی حمد وثنا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ تصور انسان کی محدودیت اور خدا کی لامحدودیت کے درمیان موجود فرق کو واضح کرتا ہے اور یہی مرزا دبیرؔ کے ذوقِ الٰہیات کی گہرائی کی نشان دہی کرتا ہے۔

''عالم کو اپنے زور کا عالم دکھا دیا ظلمت کو نور خاک کو آدم بنا دیا''

دبیرؔ کے اس بیان میں خدا کی تخلیقی قوت کی وسعت اور کائناتی تنظیم کی طرف اشارہ ہے۔ ''ظلمت کو نور'' کا ذکر خدا کے نورانی اور ہدایت دینے والے پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو کہ کائنات کے آغاز اور اس کی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ ''خاک کو آدم بنا دیا'' ایک عظیم تخلیقی معجزہ ہے جہاں دبیرؔ نے انسان کی تخلیق کو خدا کی بے پایاں قدرت اور رحمت کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ یہ مصرع انسان کے وجود کے معجزے اور اس کی کمزوری کو خدا کی قدرت کے ساتھ جوڑ کر ایک گہرا فکری تاثر پیدا کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کے اس بند میں الٰہیات کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، وہ نہ صرف فکری طور پر گہرا ہے بلکہ جمالیاتی طور پر بھی دلکش ہے۔ ''طغرہ نویس''، ''ذوالجلال''، اور ''طوطیِ سدرہ کی لال'' جیسے استعارے دبیر کے تخلیقی اسلوب اور ان کے شاعرانہ حسن کا مظہر ہیں۔ ان کے الفاظ نہایت جامع اور بلیغ ہیں جو خدا کی صفات اور قدرت کو ایک وسیع تناظر میں پیش کرتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کے ذوقِ الٰہیات کی خاص بات یہ ہے کہ ان کا کلام صرف عقیدے کی بات نہیں کرتا بلکہ قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ ان کی شاعری انسان کو اس کی عاجزی، خدا کی عظمت اور کائنات کے پیچیدہ نظام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے ہاں الٰہی صفات کا بیان محض خدا کی تعریف نہیں بلکہ ایک ایسا راستہ ہے جو قاری کو روحانی بالیدگی اور فکری گہرائی کی طرف لے جاتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات اردو شاعری میں ایک ایسا باب ہے جو خدا کی معرفت، اس کی قدرت، اور اس کی صفات کو ایک منفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان کے کلام میں خدا کی الوہیت اور انسان کی عاجزی کے درمیان ایک حسین توازن نظر آتا ہے۔ دبیرؔ کے ہاں خدا کی تعریف محض عقیدت ہی نہیں بلکہ قاری کو یہ دعوت بھی دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی اعمال، اور مقصد پر غور کرے اور خدا کی عظمت کا اعتراف کرے۔ مرزا دبیرؔ کا کلام خدا کی عظمت اور صفات کا ایک زندہ آئینہ ہے جہاں ان کی شاعری میں فلسفۂ الٰہیات اور تخلیقی قوت کا مظہر نظر آتا ہے۔ دبیرؔ کی شاعری میں ''کن فیکوں'' اور ''طغرہ نویس'' جیسے استعارے خدا کی لامحدود تخلیقی طاقت کو نہایت بلیغ اور شاعرانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں خدا کی حکمرانی کو ''سلطنتِ بے زوال'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو ابدی، غیر متزلزل اور تمام کائنات پر محیط ہے۔ دبیر نے ''بندے سے ہو خدا کی ثنا یہ مجال ہے'' کے ذریعے انسان کی عاجزی اور محدودیت کو نہ صرف ایک فکری حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے بلکہ اس کے ذریعے قاری کو خدا کی عظمت کا حقیقی ادراک بھی عطا کیا ہے۔ ''طوطیِ سدرہ کی لال'' کا استعارہ دبیر کی تخلیقی قوت کی بلندی کو ظاہر کرتا ہے جس میں خدا کی حمد کے اظہار کے لیے انسان کی زبان کی ناکامی کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے اشعار میں ظلمت کو نور'' اور ''خاک کو آدم بنا دیا'' جیسے جملے تخلیقِ کائنات اور انسان کی معجزاتی تخلیق کو ایک گہرا اور معنوی رنگ دیتے ہیں۔ دبیر کی شاعری نہ صرف خدا کی صفات کا بیان کرتی ہے بلکہ انسان کو اپنی کمزوری اور عاجزی کا احساس بھی دلاتی ہے، جو ان کے ذوقِ الٰہیات کی بلند سوچ اور فلسفیانہ نقطہ نظر کو نمایاں کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کی شاعری میں خدا کی صفات اور الٰہیات کا بیان نہ صرف ایک روحانی تجربہ ہے بلکہ ایک گہری فکری تلاش کا بھی مظہر ہے۔ ان

کے مرثیے میں خدا کی تخلیقی قوت، اس کے جلال اور اس کی حکمرانی کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ نہایت بلاغت اور فنی مہارت سے لبریز ہے۔ ''طغرہ نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے'' میں دبیرؔ نے خدا کی تخلیقی طاقت کو ''کن فیکوں'' کے قرآنی تصور کے ذریعے بیان کیا ہے، جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ خدا کا حکم ہی کائنات کی تخلیق کا سبب ہے۔ ''طغرہ نویس'' کا استعارہ خدا کے حکم کو ایک شاہی فرمان کے طور پر پیش کرتا ہے، جو نہ صرف قوت کا اظہار ہے بلکہ ایک عظیم سلطنت کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ اسی طرح ''فرمانِ حق میں سلطنتِ بے زوال ہے'' میں دبیرؔ خدا کی حکمرانی کی ابدیت کو واضح کرتے ہیں، جس میں نہ صرف خدا کی حاکمیت کا اقتدار شامل ہے بلکہ اس کی سلطنت کی استحکام اور دوام کا بھی تصور ہے۔ یہ تصور صرف ایک مذہبی حقیقت نہیں ہے بلکہ دبیر کا ایک گہرا فلسفہ ہے، جو انسان کی عارضیت اور خدا کی لامحدودیت کے بیچ فرق کو واضح کرتا ہے۔

دبیرؔ کی شاعری میں خدا کی عظمت کو نہایت عاجزی اور شعور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جیسے ''بندے سے ہو خدا کی ثنا یہ مجال ہے'' میں انسان کی عاجزی کا اظہار کیا گیا ہے۔ دبیرؔ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان، جو محدود اور فانی ہے، خدا کی حقیقت اور اس کی صفات کی مکمل تعریف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ مصرع ایک عارفانہ سوچ کو ظاہر کرتا ہے، جو انسان کو اپنی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ ''اس جا زبان طوطیِ سدرہ کی لال ہے'' کا استعارہ خدا کی ثنا کرنے والوں کی صفات کو بیان کرتا ہے، جنہیں سدرہ المنتہیٰ کے قریب، خدا کے مقرب فرشتے سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح دبیر نے نہ صرف خدا کی لامحدودیت کو اجاگر کیا ہے بلکہ انسان کی کمزوری اور عاجزی کا شعور بھی قاری کو دیا ہے۔

مزید برآں، دبیرؔ کا ''ظلمت کو نور'' اور ''خاک کو آدم بنا دیا'' جیسے اشعار تخلیقِ کائنات اور انسان کی معجزاتی پیدائش کو ایک نیا معانی دیتے ہیں۔ ''ظلمت کو نور'' میں دبیر نے خدا کے حکم سے روشنی کی تخلیق کو بیان کیا ہے، جو کہ ایک روشن مستقبل اور روحانی تجلی کی علامت ہے۔ ''خاک کو آدم بنا دیا'' میں خدا کی قدرت کو ایک اور معجزہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جہاں بے جان مٹی سے انسان کی تخلیق کو خدا کی عظمت اور قدرت کا آئینہ دار قرار دیا گیا ہے۔ یہ مصرع انسان کے وجود کو خدا کی فنی مہارت اور بے پایاں قدرت کی نشاندہی کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کے اس کلام میں صرف مذہبی یا عقیدتی حقیقتوں کا بیان نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں ایک فلسفیانہ اور معنوی پہلو بھی ہے۔ دبیرؔ نے خدا کی صفات کو نہ صرف عقیدت کے نظر سے بلکہ فکری اور شعری گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے، جس میں قاری کو نہ صرف روحانی سکون ملتا ہے بلکہ ایک فکری طور پر ان کے نظریات کی گہرائی میں غوطہ لگانے کا موقع ملتا ہے۔ اس کلام میں ہر لفظ، ہر استعارہ اور ہر تشبیہ ایک نئی حقیقت کی جانب رہنمائی کرتا ہے جو دبیرؔ کے ذوقِ الٰہیات کی عکاسی کرتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کا اِلٰہی ذوق ہمیں ایک ایسے عارفانہ سفر پر لے جاتا ہے جہاں شاعری محض الفاظ کا ہنر نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں اور روح کی پرواز کا اظہار بن جاتی ہے۔ ان کے کلام میں خدا کی صفات کا ذکر ایک شعری عبادت کی مانند ہے جس میں عقیدت، فکر اور فن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دبیرؔ کی رثائی تخلیق میں توحید کا پختہ عقیدہ خدا کی لامحدودیت اور انسان کی محدودیت کے درمیان پل کا کام کرتا محسوس ہوتا ہے جہاں وہ خدا کی عظمت کو بلند ترین شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں اور قاری کو خدا کے قُرب کے احساس سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روحانیت اور فکری گہرائی کا یہ امتزاج نہ صرف ان کے فن کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو بھی نمایاں کرتا ہے جس نے خدا کے ساتھ تعلق کو ان کے شعری بیانیے کا مرکزی حصہ بنا دیا۔ اس لیے دبیرؔ کا ذوقِ الٰہیات ایک ایسا باب ہے جو ادب کی دنیا میں روحانیت اور جمالیات کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے اور قاری کو خدا کی معرفت کے راستے پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

❁❁❁❁

تیرا جواب ہے نہ عرب میں نہ ہند میں

(مرزا دبیرؔ کے ایک مرثیے کی جمالیات)

سیّد حسن عباس

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ ہم عہد اور ہم عصر ہونے کے ساتھ مرثیہ نگاری بالخصوص اور اردو شاعری میں بالعموم اپنی اہمیت منوا چکے ہیں۔ اُن کے قدوقامت کا تعین کرنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر بھی ان کی شاعرانہ قدرومنزلت پر کچھ نہ کچھ اظہارِ خیال ہوتا ہی رہتا ہے۔ میر انیسؔ کو ان کی سہلِ ممتنع زبان کے سبب عام پسند اور مرزا دبیرؔ کو ان کی عالمانہ، فاضلانہ یا مشکل پسند زبان کے سبب کو خاص خواص پسند قرار دیا جا چکا ہے جس کا حقیقت سے کچھ خاص ربط نہیں۔ کیونکہ دونوں حضرات نے دونوں میدانوں میں اپنا اپنا اشہبِ قلم دوڑایا اور اپنی اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میر انیسؔ کا کلام عوام پسند ہونے کی وجہ سے زیادہ موردِ توجہ رہا ہے لیکن مرزا صاحب بھی سہل اور سادہ زبان استعمال کرنے میں قادر تھے۔

اگر میر انیسؔ اک پھول کے مضمون کو سو طرح سے باندھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور اس کا دعوا بھی کرتے ہیں تو مرزا دبیرؔ خود کے بارے میں دیکھیے کیا کہتے ہیں:

خاقانِ سخن ہوں میں دبیرِ جگر افگار — سکّہ ہے تخلّص مرا اور نظم درم ہے
ہم نے میزانِ نظر میں جو کیا وزنِ دبیرؔ — دُر شہوار بھی کم میرے سخن سے نکلے

اسے ہم شاعرانہ تعلّی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

آج کی اس بزمِ سخن میں جہاں مرثیہ جیسی اشک آلود صنفِ سخن کی جمالیات کا تذکرہ ہو رہا ہے، یقیناً اس صنفِ سخن کی تہ در تہ دیگر خصوصیات میں جمالیاتی عناصر کی تلاش ہوگی اور یہ کام بہتوں نے کیا بھی ہے۔ مرزا دبیرؔ کا ایک مرثیہ ہے:

اے دبدۂ نظم دو عالم کو ہلا دے

۱۹۷ بند کے اس مرثیے کے چہرے میں مرزا صاحب نے اپنی شاعرانہ قدرت کا شاعرانہ اظہار جس جمالیاتی پیرائے میں کیا ہے، اُس کا تجزیہ بے سود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اصل بند آپ کو سناؤں اور آپ خود اپنی جمالیاتی حس سے کام لیتے ہوئے، مرزا صاحب کے اس مرثیے کی جمالیات کا بھرپور احساس کریں۔ یہ مرثیہ دفترِ ماتم، جلد اوّل میں موجود ہے۔

اے دبدبۂ نظم ، دو عالم کو ہلا دے (۱) اے طنطنۂ طبع ، جز و کل کو ملا دے
اے معجزۂ فکر ، فصاحت کو جلا دے — اے زمزمۂ نطق ، بلاغت کا صلا دے
اے بابِ بیاں ، معنیِ تسخیر کو حل کر — اے سینِ سخن ، قاف سے تا قاف عمل کر
بولا علمِ خامہ فلک پر میں گڑوں گا (۲) — سکّے نے ندا دی زرِ انجم پہ پڑوں گا

معنی نے کہا بیت میں آئینہ جڑوں گا مضمون پکارا میں کسی سے نہ لڑوں گا
بندش یہ کھلی دم میں فصاحت کا بھروں گی چلّائی طبیعت کہ میں اصلاح کروں گی

(۳) میں کون ہوں صاحب علمِ کلک جہانگیر نوبت زنِ نہُ بامِ عروجِ فلکِ پیر
تاج سرِ لفظ و سخن و معنی و تحریر خاکِ قدمِ محتشم و مقبل شبیرؑ
منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے انصاف تو کہتا ہے خداوند یونہیں ہے

(۴) مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ کہتا ہے سخن حضرتِ استاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیرِ خداداد ہمیشہ بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ
بے لطفِ خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

(۵) میں بلبلِ خوش لہجۂ بُستانِ سخن ہوں میں معرکہ میں رستمِ دستانِ سخن ہوں
میں وارث اورنگِ سلیمانِ سخن ہوں ایمانِ سخن ، دینِ سخن ، جانِ سخن ہوں
عاجز ہوں کہ بندہ ہوں پر اعجاز بیاں ہوں سر تا بہ قدم ہیچ ہوں لیکن ہمہ داں ہوں

(۶) سحبان مرا طفلِ دبستانِ سخن ہے ثابت ہے کہ حسّان ثنا خوانِ سخن ہے
آئندہ جسے کچھ سر و سامانِ سخن ہے آئے یہی گو ہے ، یہی میدانِ سخن ہے
کس طرز کی رونق ہو اس انداز کے آگے جادو کہیں چل سکتا ہے اعجاز کے آگے

(۷) مضمونِ تر و تازہ ہے چستی میں یگانا ملبوس قلم کار ، نہ دوں ہے نہ پرانا
اس دھیان کے آنے سے کرم شاہؑ کا جانا خدّامِ ولا بولے کہ ہاں ہاتھ بڑھانا
نے ، ہدیۂ تائیدِ قدیرِ ازلی ہے لے ، خلعتِ تحسینِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

(۸) حامی جو سلیمانؑ دو عالم نظر آئے مضمون جو عنقا تھے ، وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤسِ تصور کی طرح دل میں در آئے شیشہ میں پری زادِ معانی اتر آئے
یاقوت بدخشاں سے ، در آتے ہیں عدن سے لعل اگلوں گا میں طوطیِ سدرہ کے دہن سے

(۹) کب شعلۂ خس ، نور کی قندیل کو پہنچے اڑ کر نہ مگس، طنطنۂ فیل کو پہنچے
پشّہ کا نہ غل ، صورِ سرافیل کو پہنچے بلبل ، نہ لب و لہجۂ جبریلؑ کو پہنچے
اربابِ سخن ، پر جو سخنور ہے ہمارا القابِ سخن سنج سخنور ہے ہمارا

(۱۰) سرکار ہے ہر مجلسِ شبیرؑ ہماری مضموں کی طرح بیت ہے جاگیر ہماری
آئینہ سکندر پہ ہے تسخیر ہماری ہے مہر سلیمانؑ کی تحریر ہماری
تنہا مہ و ماہی پہ نہیں سکّہ پڑا ہے سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے

قابل میں سخن کے ہوں، سخن ہے مرے قابل (۱۱) لیکن سخنِ شہرہ فگن ہے مرے قابل
رضوان کو جنت ، یہ چمن ہے مرے قابل موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل
شہرہ ہے یہ تائیدِ شہِ جنّ و ملک سے مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے
ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی (۱۲) ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر بحر میں ہے ، بحرِ طبیعت کی روانی ہے زورِ سخن ، شور پر موجوں کی زبانی
قطرے سے مگر بحث میں میں صرف نہیں ہوں دریا ہوں سخن کا ، میں تنک ظرف نہیں ہوں
خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے (۱۳) جھک کر شرفا اور نجبا ملتے ہیں سب سے
نخوت کے معانی ہیں الگ لفظوں کے لب سے جس طرح سے بد اصل ، جدا نیک نسب سے
دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو مانندِ غبار اٹھتے ہیں تعظیمِ ہوا کو
خلّاقِ معانی مجھے حضرت نے کیا ہے (۱۴) عباسؑ نے مجھ کو علمِ خامہ دیا ہے
شیریں سخنی کا ہنر اکبرؑ سے لیا ہے اس ذرہ میں ، سب مہرِ حسینؑ کی ضیا ہے
بے مہریِ افلاک سے گو خاک بسر ہوں ہاں ، عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہلِ ہنر ہوں
آؤ میری امداد کو اے کل کے مددگار (۱۵) بے قدر ہے سنجیدگیٔ گوہرِ شہوار
جیسے کہ ترازو کا ہنر قحط میں بیکار نے جنسِ عدالت ، نہ خریدار ، نہ بازار
انصاف ، کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے

یہ پندرہ بند ہیں جو ایک مرثیہ کا چہرہ ہے، جمالیات کے کن کن پہلوؤں پر گفتگو کن کن انداز میں کی ہے وہ اہل علم و ہنر سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا تجزیہ کرنا مشکل ہے۔ اپنی گفتگو کے آخر میں مرزا صاحب کے ایک مرثیے کا مقطع پیش خدمت ہے:

بس اے دبیرؔ حوصلۂ مدح پست ہے ہر بند مرثیے میں عجب بند و بست ہے
انگشتریِ نظم رسا زیبِ دست ہے برحق نگینِ قافیہ کی کیا نشست ہے
بے مثل مرثیے کہے احوالِ ہند میں تیرا جواب ہے نہ عرب میں نہ ہند میں

❁❁❁❁

مجتہد نظم مرزا دبیرؔ اور علم الاعداد

زین رضا

محترم قارئین

میرے مطالعہ میں آج کل مرزا دبیرؔ کے مراثی اور رباعیات ہیں جس کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے اس بات کو درک کیا کہ مرزا صاحب نے جہاں ہر صنعت کا بے بہا استعمال کیا ہے وہیں انہوں نے اپنے مراثی اور رباعیات میں علم الاعداد جیسی انتہائی مشکل صنف کو نہایت ہی آسانی سے اور فراوانی سے استعمال کیا ہے جو کہ اُن کی قادرالکلامی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

جب ہم مرزا صاحب کی رباعیات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کے ان کی ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اہم علمی یا تاریخی نکتہ نہاں ہے اور یہ رباعی کسی نہ کسی صنعت کی حامل ہے۔۔۔

مگر آج میں آپ قارئین کی توجہ مرزا صاحب کی ان رباعیات کی طرف دلاؤں گا جن میں انہوں نے علم الاعداد کی صنعت استعمال کی ہے میں اُن کی رباعیات میں سے علم الاعداد کی مثالیں پیش کروں گا۔

اس رباعی میں مرزا صاحب نے اسمِ جناب رسولِ خدا یعنی لفظ محمدؐ اور اسمِ جنابِ شیرِ خدا یعنی لفظِ علی کے مجموعی اعداد کو جمع کر کے اک منفرد موضوع کو تخلیق کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔۔۔۔

کہنے سے اذاں کے دین سب ملتا ہے — پر نامِ علی نہ لو تو کب ملتا ہے
اعدادِ محمّد و علی کو گن لو — یہ دونوں جو باہم ہوں تو رب ملتا ہے

علی(۱۱۰) +محمّد(۹۲)= رب(۲۰۲)

زیرِنظر رباعی میں مرزا صاحب نے حجتِ دوراں یعنی اسمِ امامِ مہدی عج کے عدد اور دہن کے عدد کی طرف متوجہ کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔۔

مہدیؑ پہ فدا ، کُل کے شہنشاہ یہ ہیں — فرماں دہِ کائنات واللہ یہ ہیں
اعداد ہیں مہدیؑ و دہن کے یکساں — گویا دہنِ قدرت اللہ یہ ہیں

دہن=۵۹=مہدی

ایک جگہ امامِ حسینؑ کی شہادت کی تاریخ نہایت ہی منفرد انداز سے یوں نکالی ہے

ح نام میں ہے حق کی حمایت کے لیے — اور سین ہے سائل سے سخاوت کے لیے
ہیں نامِ حسینؑ میں بھی کیا خوب حروف — یا نون ہے تاریخِ شہادت کے لیے

ی=۱۰،ن=۵۰

جس کو جمع کیا جائے تو مجموعی اعداد ۶۰ بنتے ہیں اور اذہان کو متوجہ کرتے ہیں کہ دراصل۔تاریخ۔شہادت ۶۰ ہجری جو کہ تحقیق کے نئے

باب کھولتی ہے یہاں مرزا صاحب نے اسمِ امامِ علی کے حرف لام ''ل'' کے عدد اور قرآن کے سہ پارے یعنی تیس کو بطور مستعار لیا اور رباعی میں بہترین انداز سے نظم کیا ہے۔۔

کیا لامِ علیؑ سے معرفت حاصل ہے — یہ لام دلِ بادشہِ عادل ہے
قرآن کے سی پارے ہیں اور لام کے تیس — قرآن بلا فرق علیؑ کا دل ہے

مرزا صاحب کی یہ رباعی عمیق نظری مانگتی ہے۔۔۔ پہلے مصرعے میں واحد دوسرے میں چودہ تیسرے میں پھر چودہ ''یہ+د'' کے عدد کا ذکر کیا اور آخری مصرعے میں دونوں کی وضاحت کر دی اور نتیجہ دے دیا۔۔۔

کیوں حبِ یداللہ میں نہ قیوم ملے — چودہ طبق اس نام کے محکوم ملے
دس یا کے ہیں اور دالِ یداللہ کے چار — اللہ کے ساتھ چودہ معصوم ملے

ی=۱۰، د=۴

اور اس رباعی میں وہ اپنے فن کے اوج پہ ہیں مرزا دبیرؔ کی یہ رباعی ایک تو غیر منقوط اور اوپر سے اس رباعی میں علم الاعداد کا اس طرح استعمال کسی معجزے سے کم نہیں۔۔۔

سر گرمِ ولا دل رہا حرؑ سرد ہوا — معصوم کا وہ ہمدم و ہمدرد ہوا
درد و الم امامِؑ طالع کو ملا — سو حرؑ کا علم ہم عددِ درد ہوا

حر=۲۰۸، درد=۲۰۸

اس رباعی میں میم کے عدد کو امامِؑ مظلوم کے چہلم سے نسبت دی ہے

دو میم جو اک لفظ محرّم میں ہیں — پیوند انھیں حرفوں کی ماتم میں ہیں
ہر میم کے چالیس عدد سے یہ کھلا — ماتم کے چہل روز دو عالم میں ہیں

م=۴۰

اسی طرح انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے فارسی رباعی میں اپنے عینک پہننے کی تاریخ نکالی ہے

امدادِ علی گاہ خفی گاہ جلی است — بر من ز ازل عینِ عنایات ولی است
چوں مادہ دفع شد بگفتم تاریخ — چشمِ بددور عین اعجاز علی است

چوتھے مصرع کے اعداد ۱۳۴۱ ہیں جس میں سے مادہ ۵۰ کے اعداد کو منہا کر کے ۱۲۹۱ ہجری نکالی ہے

ان رباعیات کو پڑھنے کے بعد قدرتِ کلام کا جو عروج مرزا صاحب کے یاں نظر آتا ہے وہ اپنے آپ میں ایک معجزہ ہے۔ ان کے ہاں ایسی بھی رباعیات ہیں جو غیر منقوط ہیں اور اس میں علم الاعداد کو اس خوبصورتی سے نبھانا کمالِ فن کی معراج ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کمالاتِ دبیرؔ ابھی قدردانوں کی۔ نگاہوں سے اوجھل ہیں اور جیسے جیسے مرزا دبیرؔ پر کام ہو رہا ہے ویسے ویسے مرزا صاحب کے کمالاتِ سخن ظاہر ہو رہے ہیں۔۔

مرثیۂ مرزا دبیرؔ اور امام محمد تقیؑ کے بچپن کا واقعہ

زائر حسین ثالثی

مرثیہ ایک بیانیہ شاعری ہے اور بیانیہ شاعری کی بنیاد کسی بات یا واقعات پر ہوتی ہے اور واقعات کو ظہور میں آنے کے لیے کچھ تاریخی اور سماجی اسباب ہوتے ہیں لیکن جو چیز اس کو وجود بخشتی ہے وہ کردار اور ان کے مکالمے ہوتے ہیں۔ اردو کی جن اصناف شاعری میں واقعہ نگاری ملتی ہیں وہ مثنوی، مرثیہ اور نظم ہیں۔ مولانا شبلیؔ کو شکایت ہے کہ اردو شاعری میں جس چیز کی بڑی کمی رہی ہے وہ واقعہ نگاری ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ مرثیہ کی واقعہ نگاری نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کیا ہے۔ مولانا شبلی نے واقعہ نگاری کی دو قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ واقعہ نگار کسی تاریخی واقعے کو بے کم و کاست نظم کر دے اس کے لیے صرف زبان پر قدرت درکار ہے شاعری کی چنداں ضرورت نہیں۔

۲۔ واقعہ اجمالاً معلوم ہے لیکن واقعہ نگار واقعے کی تمام جزیات اور حالات اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کی واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے وہ بالکل بیان واقعی ہو۔ اس قسم کی واقعہ نگاری کے لئے زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ ساتھ شاعر کو فطرت کا نکتہ داں ہونا ضروری ہے۔ مراثیِ دبیرؔ میں دونوں قسم کی واقعہ نگاری ملتی ہے انھوں نے ایسے واقعات بھی نظم کئے ہیں جس کی بنیاد حقیقت واقعہ پر ہے اور ایسے واقعات بھی نظم کیے جو مخصوص عقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔

شیریں کا واقعہ مرثیہ نگاروں کا خاص موضوع ہے اسی طرح زوجۂ یزید ''ہند'' کا قید خانۂ شام میں آنے کا واقعہ ہو یا جنابِ مختار ثقفی کا واقعہ بھی دبیرؔ کے مرثیوں میں نظم ہوا ہے۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھ کر دبیرؔ نے جو شاعری کی ہے اس میں کہیں کہیں بیحد کامیاب تو کہیں کہیں ناکام بھی ہیں۔

مرزا دبیرؔ اپنے مرثیے ''جب زہر سے شہید جنابِ رضاؑ ہوئے'' میں حضرت امام محمد تقیؑ کے بچپن کا مچھلی والا واقعہ بھی بہت خوبصورت انداز میں قلمبند کرتے ہیں۔ یہ مرثیہ خزینۂ دبیر: جلد اوّل (ترتیب و تدوین سید ارتضیٰ عباس نقوی کراچی پاکستان) میں شامل ہے۔ جس کا ماخذ: دفتر ماتم، جلد ۱۱، مطبوعہ مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ ص ۱ تا ۴ ہے۔

مرثیہ امام رضاؑ کی شہادت سے شروع ہوتا ہے؛

جب زہر سے شہید جنابِ رضاؑ ہوئے — اور ماتمِ پدر میں تقیؑ مبتلا ہوئے
مغموم شیعیانِ رسولِؐ خدا ہوئے — کہتے تھے حیف ہم شہِؑ دیں سے جدا ہوئے
دل زہر سے ہو ٹکڑے شہِؑ کائنات کا — ہے تلخ ہم غلاموں کو شربت حیات کا

حضرت امام رضاؑ کو مامون زہر سے شہید کرا دیتا ہے۔ اس کے بعد حضرت امام محمد تقیؑ کی امامت کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت امام محمد تقیؑ پیغمبرؐ

اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ کے نویں جانشین ہمارے نویں امام اور سلسلۂ عصمت کی گیارہوں کڑی تھے۔آپ کے والد ماجد حضرت امام علی رضاؑ اور والدہ کا نام جناب خیزران عرف سکینہ تھا۔

امام محمد تقیؑ اپنے آباواجداد کی طرح امام منصوص، معصوم، اعلم زمانہ اور افضل کائنات تھے۔آپ جملہ صفاتِ حسنہ میں یگانۂ روزگار اور ممتاز تھے۔علاّمہ بن طلحہ شافعی لکھتے ہیں ''امام علیہ السلام اگرچہ تمام معصومینؑ میں سب سے کمسن اور چھوٹے تھے۔لیکن آپ کی قدرومنزلت آپ کے اجداد کی طرح نہایت ہی عظیم تھی۔آپ کی ولادت بتاریخ ۱۰ رجب المرجب ۱۹۵ھ بمطابق ۸۱۱ء یوم جمعہ بمقام مدینہ منورہ ہوئی۔

امام محمد تقیؑ جن کی عمر اس وقت تقریباً ۹ رسال کی تھی، ایک دن بغداد کے کسی گزرگاہ میں کھڑے ہوئے تھے اور چند لڑکے وہاں کھیل رہے تھے کہ ناگہاں خلیفہ مامون کی سواری دکھائی دی، سب لڑکے دوڑ کر بھاگ گئے مگر حضرت امام محمد تقیؑ اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔جب مامون کی سواری وہاں پہنچی تو اس نے حضرت امام محمد تقیؑ سے مخاطب ہوکر کہا کہ صاحبزادے جب سب لڑکے بھاگ گئے تو تم کیوں نہیں بھاگے۔انھوں نے بے ساختہ بلاتامل جواب دیا کہ میرے کھڑے رہنے سے راستہ تنگ نہ تھا، جو ہٹ جانے سے وسیع ہوجاتا اور میں نے کوئی جرم نہیں کیا کہ ڈرتا۔اس واقعہ کو مرزا دبیرؔ یوں نظم کرتے ہیں کہ ؎

لکھا ہے درمیان جلاء العیوں یہ حال — ماموں رشید کو بھی نہایت تھا انفعال
آیا سوئے مدینۂ طیب وہ بدخصال — تھے جمع ایک جا کئی اطفالِ خورد و سال
اور ان میں ایستادہ یتیمِ امامؑ تھا — جلوہ نما نجوم میں ماہِ تمام تھا

جاہ و حشم سواریٔ ماموں کا دیکھ کر — اطفال جو بہم تھے وہ بھاگے اِدھر اُدھر
لیکن کھڑا رہا شہِؑ ابرار کا پسر — مامون نے جمالِ تقیؑ پر جو کی نظر
کہنے لگا کہ تم تم کو مرا کچھ خطر نہیں — واقف تو میرے جاہ و حشم سے مگر نہیں

شہؑ نے کہا ہمیں ہے فقط خوفِ کبریا — اے بے شعور بندے کو بندے سے خوف کیا
حیران ہو کے شہؑ نے خلیفہ سے پھر کہا — نام اپنا اور باپ کا اپنے مجھے بتا
فرمایا شاہِ دین نے نقیؑ میرا نام ہے — بابا مرا رضاؑ شہِؑ عالی مقام ہے

تو نے جسے شہید کیا ہے مرا پدر — میں بیکس و یتیم اسی شہؑ کا ہوں پسر
یہ سن کے منفعل ہوا ماموں زیادہ تر — واں سے چلا بسوئے بیاباں وہ بد گہر
درّاج اک نظر پڑا اس حیلہ ساز کو — بہر شکار چھوڑ دیا اس نے باز کو

اس کے بعد مامون وہاں سے آگے بڑھا اس کے ساتھ شکاری باز بھی تھے۔جب آبادی سے باہر نکل گیا تو اس نے ایک باز کو ایک چکور

پر چھوڑا۔ باز نظروں سے اوجھل ہو گیا اور جب واپس آیا تو اس کی چونچ میں ایک چھوٹی سی زندہ مچھلی تھی جس کو دیکھ کر مامون کو بہت تعجب ہوا۔ تھوڑی دیر میں جب وہ اسی طرف لوٹا تو اس نے حضرت امام محمد تقیؑ کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ وہیں دیکھا جہاں وہ پہلے تھے۔ لڑکے مامون کی سواری دیکھ کر پھر بھاگے۔ لیکن حضرت امام محمد تقیؑ بدستور سابق وہیں کھڑے رہے۔ جب مامون ان کے قریب آیا تو مٹھی بند کر کے کہنے لگا کہ؛ صاحبزادے بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے انھوں نے فرمایا اللہ تعالی نے اپنے دریائے قدرت میں چھوٹی مچھلیاں پیدا کی ہیں اور سلاطین اپنے باز سے ان مچھلیوں کا شکار کر کے اہلبیتِ رسالتؐ کے علم کا امتحان لیتے ہیں۔ یہ سن کر مامون بولا! بے شک تم علیؑ بن موسیٰ رضاؑ کے فرزند ہو، پھر امامؑ کو اپنے ساتھ سوار کیا اور اپنے محل میں لے آیا۔ اور کچھ دنوں بعد اس نے اپنی بیٹی سے آپ کا عقد کر دیا۔ مرزا دبیر لکھتے ہیں کہ

تھا باز گشت باز کا خواہاں مگر وہ باز — جنگل میں سوئے باز تھی ماموں کی چشم باز
لیکن پھرا وہ باز پس از مدّتِ دراز — منقار میں تھا ماہیِ زندہ لیے وہ باز
ماہی کو اس شقی نے لیا اپنے ہاتھ میں — اور آیا خدمتِ شہؑ عالی صفات میں

دیکھا کھڑا ہوا ہے وہیں نائبِ رضاؑ — اور ان کے گرد و پیش ہیں اطفالِ مہ لقا
بولا کہ اے تقیؑ مجھے بتلاؤ تو بھلا — پوشیدہ اس گھڑی یہ مرے ہاتھ میں ہے کیا
معلوم حال غیب کا لاریب ہے تمھیں — لاریب روز و شب خبر غیب ہے تمھیں

حضرتؑ نے مسکرا کے یہ اس سے کیا مقال — ماہیت ایک مچھلی کی کہنا ہے کیا مجال
میں جانتا ہوں ماہ سے ماہی تلک کا حال — پیدا کیے ہیں حق نے کئی بحر بے مثال
بالا جو ابر ہوتا ہے دریائے آب سے — ہوتی ہے مچھلیوں کو بلندی سحاب سے

اس ابر پر بلند جو ہوتی ہیں مچھلیاں — شہباز آکے کرتے ہیں صید اُن کو ناگہاں
اور بادشاہ کر کے انھیں ہاتھ میں نہاں — آلِ نبیؐ سے پوچھتے ہیں بہرِ امتحاں
مفتاحِ بابِ علم ہماری زبان ہے — مچھلی ہے تیرے ہاتھ میں پر نیم جان ہے

ماموں کو اس بیاں سے تعجب ہوا کمال — بولا بربِّ کعبہ کہ تو ہے رضاؑ کا لال
ہمراہ شاہؑ کو لیا با حشمت و جلال — داخل ہوا جو شہر میں اپنے وہ بد خصال
ظاہر میں تھا عقیدہ شہؑ نیک نام سے — دختر کا اپنی عقد کیا اس امامؑ سے

درج ذیل مرثیے میں باز اور مچھلی کے واقعے کے علاوہ مرزا دبیر ایک اور واقعہ نظم کرتے ہیں کہ مامون رشید کے دربار میں ایک چور کو لایا جاتا ہے۔ بادشاہ اس کی سزا کے لیے قاضی شرع سے مسئلہ پوچھتا ہے تو قاضی شرع اسے کے دونوں ہاتھ کلائی سے کاٹنے کی بات کرتا

ہے۔دربار میں ایک اور قاضی موجود ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ ہاتھ کلائی سے کاٹنے کے بجائے کہنیوں سے کاٹے جائیں۔اب مامون رشید کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔بادشاہ امام محمد تقیؑ کی طرف رجوع کرتا ہے تو امامؑ کیا خوبصورت جواب دیتے ہیں ملاحظہ ہوں

راوی نے ایک دن کی لکھی ہے یہ داستاں — اک دُزد آیا ہو کے گرفتار ناگہاں
ماموں کے پاس بیٹھے تھے سب عالمِ زماں — پوچھا سزائے دزد مفصّل کرو بیاں
قاضی شرع بولا یہ فہم و قیاس سے — ہاتھ اس کے دونوں کاٹو کلائی کے پاس سے

اک بولا کہنیوں سے کرو ہاتھ کو جدا — فتوائے مختلف غرض ایک ایک نے دیا
ابنِ رضاؑ سے پوچھا تمہاری رضا ہے کیا — شہؑ بولے ہے زبان مری حکمِ کبریا
گو پوچھتا ہے تو تو عمل اس پہ کیجیو — جو کچھ کہ میں کہوں وہی تعذیر دیجیو

بولا خلیفہ ہوگا وہی اے شہِؑ زماں — گویا زبانِ حکمِ خدا ہے تری زباں
شہؑ نے کہا کہ قطع کرو چار انگلیاں — دزدی کا پھر کرے گا ارادہ نہ یہ جواں
تعذیر وہ نہ ہو کہ دل اس کا قلق کرے — ہاتھ اس کے چھوڑ دو کہ یہ طاعاتِ حق کرے

امامؑ کے حکم کے مطابق مامون رشید چور کو سزا کا حکم دے دیتا ہے۔یہ منظر دیکھ کر دربار کے جو قاضی اور علماء تھے وہ تو پہلے سے ہی امامؑ سے دشمنی رکھتے تھے اس واقعہ کے بعد وہ بغض وحسد میں اور جلنے لگے۔مامون رشید کی موت کے بعد اس کا بھائی معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے بلوا کر بغداد میں قید کر دیتا ہے۔

یہ مسئلہ جو شاہِؑ امم نے بیاں کیا — حاکم نے بھی موافق ارشاد دی سزا
بغض و حسد مگر علماء کو ہوا سوا — رخصت ہوئے مدینے کو سلطانِ اتقیا
حاکم کو اقربا کو تو شہؑ سے عناد تھا — پر دخترِ خلیفہ کو کینہ زیاد تھا

لکّھی ہے یوں شہادتِ سلطانِ بحر و بر — ماموں رشید جب کہ ہوا داخلِ سقر
تھا اس کا بھائی معتصمِ نحس بد گہر — بغداد کا خلیفہ ہوا پھر وہ کینہ ور
نامہ لکھا عدو نے شہؑ نیک نام کو — بغداد میں طلب کیا اس نے امام کو

امام محمد تقیؑ ایک سال تک قید کی سخت سختیاں گزارتے ہیں۔بعض علماء کا کہنا ہے کہ آپ پر اس قدر سختیاں تھیں اور اتنی کڑی نگرانی اور نظر بندی تھی کہ آپ اکثر اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے تھے۔بہر حال وہ وقت بھی آ گیا کہ آپ صرف ۲۵ رسال ۳ رماہ ۱۲ ریوم کی عمر میں قید خانہ کے اندر ۲۹ رذی قعدہ ۲۲۰ ہجری یوم سہ شنبہ معتصم کے زہر سے شہید ہو گئے۔کہا جاتا ہے کہ آپ کو آپ کی بیوی ام الفضل نے اپنے

باپ مامون رشید کے حکم کے مطابق (معتصم کی مدد سے) زہر سے شہید کیا۔

خاطر کی معتصم نے بھتیجی کی بیش تر — اور بولا زہر دے کے تقیؑ کو ہلاک کر
یہ کہہ کے لا دیا اسے پھر زہرِ با اثر — آئی وہاں سے خدمتِ شہؑ میں وہ بد گہر
کوشش کہ اس نے قتلِ جناب امامؑ میں — زہرِ دغا کھلایا ملا کر طعام میں

اس طرح مرثیہ کا اختتام دعا پر ہوتا ہے۔

بس اے دبیرؔ خستہ نہیں طاقتِ کلام — کر تو دعا خدا سے دعا کا ہے یہ مقام
اے کردگارِ جنّ و بشر ربِّ خاص و عام — جو جو جنابِ حیدرِؑ صفدر کے ہیں غلام
بہرِ علیؑ و فاطمہؑ آباد رکھ انھیں — باغِ جہاں میں خرّم و دل شاد رکھ انھیں

دبیرؔ کو برصغیر کے شعراء میں بڑا مقام حاصل تھا۔ چہاردہ معصومینؑ کی مدح وثنا میں آپ کے مرثیوں کی تعداد بھی بہت ہے۔ مرزا دبیرؔ عالم متبحر تھے۔ اگر ایک طرف ان کی نظر تاریخ، احادیث، روایات وواقعات پر تھی تو دوسری طرف فارسی شعروادب سے وہ کما حقہ واقف تھے۔ اساتذہ فارسی کے دواوین کا غور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ بھی اس بات کے کوشاں تھے کہ اردو شاعری خصوصاً اردو مرثیہ اپنے اندر وہ تمام خوبیاں پیدا کرے جو فارسی شاعری کا خاصہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ تھا۔ زبانوں کے مزاج سے واقف تھے۔ روزمرہ پر عبور تھا۔ جہاں جیسا موقع ہوا وہاں انھوں نے ویسی زبان استعمال کی، مطابق یا حال الفاظ انتخاب کیے جہاں مبالغہ سے کام لینا تھا لیا اور جہاں حقیقت نگاری ان کے مقصد کو فائدہ پہنچا سکتی تھی وہاں ایسا ہی کیا۔

مرزا دبیرؔ کے مراثی کا موضوع کربلا کا عظیم المیہ ہے جس کا ثانی تاریخ عالم میں نہیں ملتا انھوں نے اپنے خلاق ذہن کی مدد سے اس میں اتنی وسعت پیدا کی کہ اس سلسلے کے سینکڑوں موضوعات ہاتھ آ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے واقعات میں ترمیم واضافہ کی گنجائش نہیں تھی پھر بھی شاعر کی فکرِ رسا نے بعض نئے پہلو پیدا کر دیئے ہیں۔

❁❁❁❁

دبیرؔ کے مرثیے

جلد ۱ تا ۶

شائع ہوگئی ہے

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

دبیرؔ کے مرثیے

جلد ۷ تا ۹

زیرِ طبع

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں اجزائے ترکیبی

الماس آفرین

مرثیہ عربی لفظ ''رثا'' سے مشتق ہے جس کے اصطلاحی معنی بین و بکا یا اظہار افسوس کے ہیں۔ اس بین و بکا میں مرنے والے کے ذاتی صفات بیان کیے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ کا نام آتے ہی واقعات کربلا کا پورا منظر نامہ ہماری نظروں کے سامنے رونما ہونے لگتا ہے۔ جیسے انھیں ہم پڑھ ہی نہیں رہے ہیں، دیکھ بھی رہے ہیں۔ مولانا حالیؔ مرثیہ کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ؛ ''مرثیہ کا اطلاق ہمارے یہاں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاص کر سیّد الشہداء کے مرثیے پر ہوتا ہے۔''

مسعود حسن رضوی ادیب کی رائے بھی ملاحظہ ہوں؛

''مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اس کی موت پر افسوس کیا جائے اور بالخصوص مرثیے کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں امام حسینؑ کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرائے میں بیان کا جائے یعنی مرثیے کا ایک مفہوم عام ہے اور دوسرا خاص۔ لفظ مرثیہ جب بغیر کسی تخصیص کے استعمال ہوتا ہے تو اس سے اکثر یہی خاص مفہوم مراد ہوتا ہے ''مرثیہ گو'' اور ''مرثیہ خوان'' کی ترکیبوں میں بھی خاص مفہوم مقصود ہوتا ہے۔ (بحوالہ: مرزا سلامت علی دبیرؔ حیات اور کارنامے؛ مرزا محمد زماں آزردہ)

مرثیے کی مذکورہ بالا تعریف کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر آسانی سے پہنچتے ہیں کہ دورِ حاضر میں لفظ ''مرثیہ'' سنتے ہی ذہن خود بخود واقعہ کربلا یا شہدائے کربلا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کا اعتراف حالیؔ جیسے معتبر اور مستند تنقید نگار نے بھی کیا ہے۔

موجودہ عہد میں ناقدین فن و ادب کی آرا کے مطابق اردو میں بحیثیت صنف ''مرثیہ'' صرف وہی نظم ہے جو مسدس کی ہیئت میں ہو اور جس جس میں واقعات کربلا اور مصائبِ اہلبیتؑ اطہار و اصحاب و انصار اور ان کی شہادت کا بیان ہو۔ مسدس کی شکل میں دوسری رثائی نظمیں جو اپنے کسی عزیز یا دوست کی موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہوں اور جن میں تمہید، گریز اور مصائب کا التزام نہ ہو ''شخصی مرثیہ'' کہلاتی ہیں اور مرثیہ کا ان نظموں پر اطلاق نہیں ہوتا۔

اگر سوال کیا جائے کہ مرثیہ کی ابتدا کہاں سے ہوئی تو کہا جا سکتا ہے کہ جہاں سے زندگی کا آغاز ہوا وہیں سے مرثیہ بھی شروع ہو گیا۔

ابتدا میں مرثیے کی نہ کوئی شکل معیّن نہ تھی اور نہ ہی اس کے اجزائے ترکیبی۔ میر ضمیرؔ نے اس کی شکل معیّن کر دی اور اسے آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ لیکن انیسؔ و دبیرؔ نے جس خوش اسلوبی سے ان اجزاء کو نبھایا ہے اس نے انیسؔ و دبیر کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

مرثیے کا پہلا جزو تو ''چہرہ'' ہے لیکن بعض مرثیے دعا سے بھی شروع ہوتے ہیں۔ تمہید کے بعد سراپا بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد واقعاتِ جنگ میں مرثیہ گو پورا زور بیان صرف کر دیتا ہے۔ جنگ کی تیاری، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، رجز خوانی، جنگ کا منظر اسطرح بیان کیا جاتا ہے

کہ دردناک پس منظر کے ساتھ پورا سماں بندھ جاتا ہے۔ بیان شہادت کے بعد بین و بکا کے متعلق چند بند ہوتے ہیں اور مرثیہ ختم ہوجاتا ہے۔

میں نے مرثیے کے اجزائے ترکیبی ''چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین'' کو مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں تلاش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ مرثیے کے اجزائے ترکیبی مع مثال اس طرح ہیں:

چہرہ:۔ تمہید کو مرثیہ میں چہرہ بھی کہتے ہیں۔ اس میں شاعر مختلف قسم کے مضامین پیش کرتا ہے۔ مثلاً صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے سے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت و منقبت اور مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر بیان کیئے جاتے ہیں۔

صبح کا منظر

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب — خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب — تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے — شب نے زرہ ستاروں کی رکھی اتار کے

رات کا سماں

مغرب سے نمایاں ہوئی جس دم شبِ عاشور — کچھ صبحِ قیامت سے نہ تھی کم شبِ عاشور
دل خلق کا کرنے لگی برہم شبِ عاشور — زینبؑ کو ہوئی جامۂ ماتم شبِ عاشور
ظلمت کی ردا اس لیے ہر سمت پڑی تھی — سر کھولے ہوئے فاطمہؑ مقتل میں کھڑی تھی

گرمی کا سماں

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامؑ فلک جناب — گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
ہر آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کتاب — خطِّ غبار سے ہے یہی ابری سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں — خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

سراپا:۔ اس میں ہیرو کے قدوقامت خدوخال اور لباس وغیرہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ مرزا دبیرؔ حضرت عباسؑ کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قد طولانیٔ عباسؑ کا تھا یہ انداز — فی المثل تھا وہ یداللہ کا دست اعجاز
قامت پاک سے معنیٔ اقامت آغاز — تھا وہ قد حیدرؑ کرار کی امید دراز
قد بالا سے عجب رتبہ تھا سب میں اس کو — سر بلندی تھی شجاعانِ عرب میں اس کو

پست تھی قد کی بلندی سے بلندیِ فلک — اس لیے حق نے بلند اس کو بنایا بے شک
لے زمیں بوسۂ پا زندہ رہے وہ جب تلک — اور نزدیک سے نظارہ کریں حور و ملک
سایۂ عرش تو تھا چرخِ بریں کے اوپر — سایہ افگن تھا یہ قد روئے زمیں کے اوپر

رُخصت:۔ یہ مرثیے کا وہ حصّہ ہے جس میں ہیرو (جری) امام حسینؑ سے جنگ کی اجازت لیتا ہے اور میدانِ جنگ میں جانے کے لیے عزیزوں سے رخصت ہوتا ہے۔ جب امام حسینؑ اپنی چار برس کی بیٹی سکینہ'' جسے وہ بہت پیار کرتے تھے، اپنے سینے پر سلاتے تھے، اپنے ساتھ کھلاتے تھے اور بہت عزیز رکھتے تھے'' سے رخصت ہونے کے لئے آتے ہیں تو مرزا دبیرؔ اس طرح سے اس واقعے کو نظم کرتے ہیں

چلّاتے ہیں حسینؑ کہ لاؤ سکینہؑ کو روٹھی ہے وہ کہ اب نہ بلاؤ سکینہؑ کو
جاؤ بس اب گلے نہ لگاؤ سکینہؑ کو کیا قصد ہے وہیں سے سناؤ سکینہؑ کو
میں تم سے بولتی نہیں مرنے کو جاتے ہو کہنے کو الوداع ہمیں واں بلاتے ہو

حضرت علی اکبرؑ کی رخصت اور ماں باپ کی حالت کو اس طرح نظم کیا ہے۔

اکبرؑ نے کیا عزم جو میدانِ ستم کا تغیر ہوا حال شہنشاہِ امم کا
رو کر کہا مجھ کو ہے بھروسہ ترے دم کا عباسؑ موئے میں بھی ہوں مہماں کوئی دم کا
کس منھ سے کہوں مرنے کو جاؤ علی اکبرؑ بانوؑ کی کمائی کو لٹاؤ علی اکبرؑ

آمد:۔ اس میں ہیرو (جری) کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ میدانِ جنگ میں جانے کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ آمد کے سلسلے میں گھوڑے کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ باب الحوائج حضرت عباسؑ کی آمد کا منظر۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے سب ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر کہتے ہیں اناالعبد لرز کر صنمِ دیر
جاں غیر ہے تن غیر مکیں غیر مکاں غیر نے چرخ کا ہے دور نہ سیّاروں کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف سے مانند زمیں ہے جز بختِ یزید اب کوئی گردش میں نہیں ہے

رجز:۔ اس میں ہیرو (جری) اپنے آبا و اجداد کی بے مثال شجاعت کا ذکر کرتا ہے اور ان کی تعریف کرتا ہے اور فن جنگ میں اپنی مہارت کا اظہار کرتا ہے اور دشمن کو للکارتا ہے جس کا مقصد حریف کو مشتعل کرنا اور اسے مرعوب کرنا ہے۔

عربوں میں دستور تھا کہ جنگجو جب جنگ کے لیے مقابل ہوتے تو اپنے اور اپنے بزرگوں کے کارنامے دھرا کر دشمن کو للکارتے تھے مدعا یہ کہ طبیعت جوش پر آجائے۔ اس فخریہ بیان کو رجز کہتے ہیں۔

میں ہوں مکینِ دوشِ نبیؐ ہر مکاں کا فخر شیرِ خدا کا لال ہوں نوشیرواں کا فخر
کوثر کی آبرو ہوں اور اہلِ جناں کا فخر کعبہ کا نور ، عرش کا اوج ، آسماں کا فخر

نام و نسب سے قدر عرب اور عجم کی ہے رونق ہماری ذات سے نام و نسب کی ہے

روشن پدر کا زور ہے دنیا پہ دین پر ششدر تھے جبرئیلؑ کٹے جبکہ تین پر
چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زین پر گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پر
ہم نو بہار گلشن صبر وثبات ہیں ہم شہسوار توسن والعادیات ہیں

جنگ :- ہیرو (جری) کا کسی نامی پہلوان سے یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑنا، جنگ کے ضمن میں ہیرو (جری) کے گھوڑے اور تلوار اور دوسرے ہتھیاروں کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ جب شمر حضرت عونؑ و محمدؑ کو بہکانے کے لئے انھیں یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ علم آپ کا حق تھا اور حضرت عباسؑ کو ملا اور دو علم بھیج کر حضرت امام حسینؑ سے الگ ہونے کی ترغیب دیتا ہے تو وہ ٹھکرا کر جواب دیتے ہیں۔

نعرہ کیا علیؑ کے نواسوں نے یک بیک بس بس زیادہ منھ سے نہ واہیات بک
چپ نابکار چپ سرک او بے ادب سرک تیرے فریب و مکر سے اب کانپ اٹھے فلک
بہکا انھیں خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں ظالم یہ ان سے کہہ جو تجھے جانتے نہ ہوں

منھ دیکھ کر محمدؑ عالی مقام کا بولے یہ عونؑ معرکہ ہے دھوم دھام کا
کی عرض اس نے شکر خدائے انام کا وہ آپ کا شکار ہے اور یہ غلام کا
لو ہاشمی و پنجتنی رن پہ چڑھتے ہیں دو نیمچے غرور کی گردن پہ چڑھتے ہیں

شہادت :- مرثیہ میں جنگ کے حالات بتانے کے بعد شاعر شہادت کے واقعات بہت ہی غم وافسوس کے الفاظ میں بیان کرتا ہے اس حصے میں جری کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ جب عونؑ و محمدؑ شہید ہو جاتے ہیں تو امام حسینؑ لاشے پہ تشریف لاتے ہیں مرزا دبیرؔ لکھتے ہیں کہ۔

یہ سن کے مطمئن ہوئے وہ غازی و غنی منکا ڈھلا نہ اشک بہے وقت جانکنی
لو کان کی مڑی نہ پھری منھ پہ مردنی پتھرانا کیسا آنکھ میں دونی تھی روشنی
مرتے ہوئے غضب کی دلیری دکھاتے تھے رگ رگ سے دم نکلتا تھا اور مسکراتے تھے

پیٹے عمامہ چھینک کے لاشوں پہ شاہؑ دیں بیویوں کے لوٹنے سے لرزنے لگی زمیں
اکبرؑ نے در پہ خیمہ کے ٹکرائی یوں جبیں دوڑے سروں کو کھول کے اصحابِ خوش یقیں
اکبرؑ پکارے عونؑ و محمدؑ گزر گئے ہمشیر زادے قبلہ و کعبہ کے مر گئے

بین:۔ مرثیہ کا آخری حصہ بین ہوتا ہے اور اس میں رونے رلانے کی تمام کاوشیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔ اس حصے میں ہیرو (جری) کی لاش پر اس کے عزیزوں، بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت سکینہؑ جب زندان میں قضا کرتی ہیں تو اس کی میّت پر بانوؑ یوں بین کرتی ہے۔ ؎

جب خانۂ زنداں میں سکینہؑ نے قضا کی — دیکھا سرِ شبیرؑ کو اور جان فدا کی
روکر کہا بانوؑ نے کہ فریاد خدا کی — کیا خوب مرے درد کی قسمت نے دوا کی
مقتل میں تو اکبرؑ سے اور اصغرؑ سے چھٹے ہیں — زندان میں اس لاڈلی دختر سے چھٹے ہیں

اب کون کرے گا شہِؑ مظلوم کا ماتم — اب کون سکینہ کی طرح روئے گا ہر دم
سر پیٹتی تھی چھوٹے سے ہاتھوں سے یہ پیہم — تازہ تھا اسی سے پسرِ فاطمہؑ کا غم
گو شمر ڈراتا تھا نہ ڈرتی تھی سکینہؑ — کیا نوحہ پدر کے لیے کرتی تھی سکینہؑ

مرزا دبیرؔ کی زبان پر شکوہ اور انداز بیان باوقار ہے۔ خیالات پرزور ہیں سوز و گداز کے اظہار کا خاص پیرایہ ہے مضمون آفرینی اور جدت طرازی کے سبب سے ان کے بیان کیے ہوئے استعارات و تشبیہات کو سمجھنے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔

مرزا دبیرؔ کے پڑھنے کا انداز بھی ان کے کلام کی طرح منفرد تھا۔ لوگ جہاں ان کے کلام پر جان چھڑکتے تھے وہاں ان کے طرز ادا پر بھی فدا تھے۔ ثابتؔ لکھنوی لکھتے ہیں:

''جوشؔ معرفت میں سینے کے زور سے پڑھتے تھے اور مجلس میں جب کبھی پڑھنے کو جاتے تھے وضو کر کے جاتے تھے۔ اکثر باوضو مرثیہ پڑھتے تھے۔ آواز بھاری اور پاٹ دار تھی۔ فطرتی طور پر کہیں خود بخود ہاتھ اٹھ جاتا تو اٹھ جاتا ورنہ منبر پر بیٹھ کر بتلانے کو وہ عیب یا گناہ جانتے تھے۔ آنکھ اور ابرو کا اشارہ بھی اسی قدر تھا جتنا باتوں میں ہوتا تھا۔''

افضل حسین ثابتؔ ہی ایک اور جگہ وضاحت کرتے ہیں:

''مرزا صاحب کے پڑھنے میں عجب وقار تھا اس کے ساتھ دو ایک نثر کے فقرے سونے میں سہاگہ ہو جاتے تھے۔ بین تو وہ اس طرز سے پڑھتے تھے کہ مجلس میں روتے روتے اکثر آدمی بے ہوش ہو جاتے تھے، کیونکہ بین کے موقع پر بہت بتانے سے اکثر رقّت سلب ہو جاتی ہے۔''

مرزا دبیرؔ کچھ بھی کہہ رہے ہوں مگر مرثیہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ جا بجا غم انگیز اشارے کرنے کے علاوہ بین میں ایسی جذباتی زبان اور جذباتی انداز سے کام لیتے ہیں کہ سخت سے سخت دل رکھنے والوں کے بھی آنسو نکل پڑتے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کی طبیعت بقول محمد حسین آزادؔ؛ اس فن کی مناسبت کے لحاظ سے بہت ہی گداز تھی اور جا بجا غم انگیز اشاروں اور دل گداز کنایوں سے کام لے کر مرثیہ کو بہت ہی مبکی بناتے تھے۔ امداد امام اثرؔ کی رائے میں بھی آلِ مرثیہ بکا ہے اور مرزا دبیرؔ اس خصوصیت کی وجہ سے ان کی نظر میں سلطان الذاکرین ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے مرثیے کو ایسے مضامین دیے جن سے نہ صرف اردو مرثیہ بلکہ اردو زبان مالا مال ہو گئی۔

❁❁❁

مرزا دبیرؔ کے مرثیوں میں جنّات کا تذکرہ

ذیشان زیدی

قرآن میں بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورہ اعراف، آیت ۳۷۔ ہود، ۱۱۹۔ حٰم السجدہ، آیات ۲۵، ۲۹۔ الاحقاف، ۱۸۔ الذّاریات، ۵۶۔ الناس، ۶۔ اور سورہ رحمٰن تو پوری کی پوری اس پر صریح شہادت دیتی ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک بااختیار مخلوق ہے اور اُس کو طاعت و معصیت اور کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ اِس پر ابلیس کا قصہ اور سورہ اَحقاف اور سورہ جن میں بعض جِنوں کے ایمان لانے کا واقعہ صریح دلالت کرتا ہے۔

علامہ نسیمؔ امروہوی کے ایک مرثیے کا مطلع ہے

قرآن میں جِنوں کی عبادت کا ذکر ہے — انساں کے ذکر و فکر میں شرکت کا ذکر ہے
دینِ محمدیؐ کی اطاعت کا ذکر ہے — آتش پہ خاکیوں کی حکومت کا ذکر ہے
ثابت ہے جس سے نار پہ قابو تراب کا — بیرالاَلَم میں ہے وہ عَلَم بوترابؑ کا

حصہ اول: جنگِ بیرالالم

مرزا دبیرؔ نے اپنے مرثیے ''ممکن نجومِ ہفت فلک کا شمار ہے'' میں جنگِ بیرالالم کو بڑی تفصیل سے پرشکوہ انداز میں بیان کیا ہے۔ پہلے حوالے کے ساتھ کچھ پس منظر پیشِ خدمت ہے۔

علامہ سیّد نجم الحسن کراروی اپنی مشہور کتاب چودہ ستارے صفحہ ۴۲۴ پر مناقب ابن شہر آشوب جلد ۲ صفحہ ۹۰، کنزالواعظین ملا صالح برغانی میں بحوالہ امام المحققین الحاج محمد تقی القردینی تحریر فرمانے ہیں کہ امام حسنؑ عسکری کے توسط سے ابوسعید خدری و حزیفہ یمانی مرقوم ہے کہ جناب رسولؐ خدا جنگ سکارسک سے واپسی میں ایک اُجاڑ وادی سے گزرے۔

یہ معجزہ رسالے میں راوی نے ہے لکھا — اک جنگ فتح کرکے پھری فوجِ مصطفاؐ
ناگاہ اک زمیں پہ گزر فوج کا ہوا — بے آب و بے گیاہ تھا وہ دشتِ پُربلا
آب و گیاہ کا نہ کسی جا نشان تھا — وحشت کا وہ مکان تھا ہو کا مکان تھا

نہریں تھی خشک دیدۂ جلّاد کی مثال — اور جن و غول و دیو کا غُل ہر طرف کمال
رنگِ زمیں سیاہ گزر دھوپ کا محال — گم کردہ آشیاں ہو جہاں طائرِ خیال

واں آکے زندہ کوئی مسافر نہیں رہا وارد جو اس زمیں پہ ہوا بس وہیں رہا

آپؑ نے پوچھا یہ کون سا مقام ہے۔عمر بن امیہ نے کہا اسے وادی کثیب ارزق کہتے ہیں۔اس جگہ ایک کنواں ہے جس میں وہ جن رہتے ہیں جن پر جناب سلیمانؑ کو بھی قابو نہیں حاصل ہو سکا۔ادھر سے تبع یمانی گزر رہا تھا اس کے دس ہزار سپاہی اُنہی جنوں نے مار ڈالے تھے

آخر نبیؐ سے پیاس کا سب نے کیا گلا حضرتؐ نے تب مہاجر و انصار سے کہا
واقف ہے تم میں کوئی کہ یہ سرزمیں ہے کیا ابن امیہ بولے کہ بندہ ہے آشنا
معروف ہے یہ وادئ ارزق جہان میں عفریت و دیو جن ہیں فقط اس مکان میں

پھر سیدؐ البشر نے کہا کوئی ہے بشر صحرا میں چاہ و چشمہ سے رکھتا ہو جو خبر
ابن امیہ بولے کہ اے شاہِؐ بحر و بر گرمی سے چاہ خشک ہیں پر اک کنواں ہے تر
شیریں رطب سے ، برف سے سرد اس کا آب ہے نام اس کا بیر ذاتِ الم اے جناب ہے

پر کیا مجال واں سے کوئی لاسکے جو آب ہیں اس کنویں میں جنّ و عفاریت بے حساب
جرأت سے جن کی فوجِ سلیمانؑ نہ لائی تاب ہر دم ہوئے شرارہِ آتش سے یاں کباب
بہرام کا نشان واں بے نشاں ہوا سعد ابن بورق آکے کفِ خاک یاں ہوا

آپؑ نے فرمایا کہ اچھا اگر ایسا ہے تو پھر یہیں ٹھہر جاو۔قافلہ ٹھہرا۔آپ نے فرمایا: کہ دس آدمی جا کر جنوں کے کنویں سے پانی لائیں تو ان کو جنت کی بشارت دوں گا۔

حیراں ہوئے یہ سن کے رسولِؐ فلک مآب اور آیۂ اُفَوِّضُ امرِی پڑھا شتاب

نوٹ: وَأُفَوِّضُ أَمْرِيٓ إِلَى ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ بَصِيرُۢ بِٱلْعِبَادِ

میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، یقیناً اللہ تعالیٰ بندوں کا نگراں ہے۔سورہ غافر آیت ۴۴

پھر غازیوں سے بولے یہ پیغمبرؐ اِلٰہ کوثر کی جس کو چاہ ہو لائے وہ آبِ چاہ
میں ضامنِ بہشت ہوں اس کا خدا گواہ کہنے لگا یہ آکے ابوالعاص پیشِ شاہؐ
میں جاؤں گا میں جاؤں گا مولا میں جاؤں گا قیمت میں دے کے آبِ حیات آب لاؤں گا

جب یہ لوگ کنوئیں کے قریب پہنچے تو ایک زبردست عفریت برآمد ہوا اور اُس نے ایک زبردست آواز دی سارا جنگل آگ کا بنا دیا۔

کہتے خدا خدا جو وہ پہنچے قریبِ چاہ اک تودہ ریگ کا تھا ہوئے جمع واں پہ ماہ
مشکیں لیے جب آئے لبِ چاہ پر وہ آہ اک جن ہوا نمود کہ اللہ کی پناہ
قد تھا بہت دراز کہ انساں دہلتے تھے چشم و دہن سے شعلۂ آتش نکلتے تھے

سب صحابی بھاگ نکلے لیکن ابوالعاصؓ صحابی پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھے:

اس جن نے مثلِ رعد کیا نعرہ ایک بار — کانپی زمین ہلنے لگا چرخِ بے مدار
ابنِ امیہ بولے کہ اب ہوجیے قرار — کہنے لگا اس سے ابوالعاصؓ زینہار
گو ہم سے آسمان و زمیں یک قلم پھریں — حاشا کہ حکمِ احمدؐ مرسل سے ہم پھریں

جن قہقہہ لگاتا ہے تو جناب ابوالعاصؓ اس کو للکار کر رسولؐ اللہ اور حیدرؑ کرار سے خبردار کرتے ہیں

انگشت ہے وہ تیغ رواں اس جناب کی — دو ٹکڑے ایک دن کی سپر ماہتاب کی
بالفرض ہم پہ آج تمہیں فتح پاوگے — حیدرؑ جو آئیں گے تو کہاں چھپ کے جاوگے

حضرت ابوالعاص جامِ شہادت نوش کرتے ہیں:

لکّھا ہے جب یہ حرف ابوالعاصؓ نے کہا — وہ جن ہوا یہ گرم کہ بس آگ ہوگیا
اور آکے مثل برق ابوالعاصؓ پر گرا — ہمراہیوں کو دی یہ ابوالعاصؓ نے صدا
لو الوداع جاتا ہوں دارالسلام کو — کہنا میرا سلام نبیؐ و امامؑ کو

باقی صحابیوں کے ہوش اڑ گئے:

بھاگا ہر ایک دل نہ رہا اختیار میں — وردِ زباں تھا سورۂ جن اضطرار میں

اتنے میں جبرئیلؑ نازل ہوئے اور انہوں نے سرورِ کائناتؐ سے کہا کہ کسی اور کو بھیجنے کے بجائے آپ علم دے کر علیؑ ابن ابی طالب کو بھیجیے۔

تھی لشکرِ رسولؐ کو تشویش بے حساب — جبریلؑ لے کے وحی یہ آئے بصد شتاب
تم پر سلامِ حق ہو خدا کا درود ہو — نادِ علیؑ پڑھو کہ علیؑ کا ورود ہو

مشغولِ وردِ نادِ علیؑ ہوگئے جواں — گزرا تھا ایک دم کا نہ عرصہ کہ ناگہاں
حیدرؑ مثالِ آیۂ نصرت ہوئے عیاں — فرمایا مصطفاؐ نے وہ آیا قرارِ جاں
رویا خدا کا شیر ابوالعاصؓ کے لیے — رونے کا حکم عام ہوا خاص کے لیے

حضرت علیؑ علیہ السلام روانہ ہوئے۔ رسولؐ اکرم نے دستِ دعا بلند کیا۔

یاں التجا رسولؐ نے یہ کی اٹھا کے ہات — حیدرؑ ترے حوالے ہے اے ربِّ پاک ذات
ماں اس کا ہاتھ دے کے موئی میرے ہات میں — میں نے علیؑ کا ہات دیا تیرے ہات میں

جناب مولا علیؑ مرتضیٰ کنویں پر پہنچے تو عفریت برآمد ہوا اور بڑے غصے میں رجز پڑھنے لگا۔ آپ نے فرمایا میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہوں۔ میرا شیوہ، میرا عمل سرکشوں کی سرکوبی ہے۔ یہ سن کر اس نے آپ پر حملہ کیا۔

ابنِ امیہ کہتا ہے سن سن کے یہ صدا مثلِ بلا کنویں سے وہی جن عیاں ہوا
اور یہ خطاب حیدرؑ کرار سے کیا کیوں تم ہمارے شہر پہ آئے ہو بے رضا
ہم جن ہیں تم بشر ہو ، مبادا ہلاک ہو آتش کا سامنا نہ کرو تم کہ خاک ہو

للکار کر علیؑ نے کہا بس زباں کو تھام شمشیر قہرِ حق کی ہے برش میری حسام
یاں خاک و باد و آتش و آب ایک کا ہے نام وہ جن مثالِ شعلہ بنا غصے سے تمام
گرنے کا قصد حیدرؑ صفدر پہ جو کیا روکا علیؑ نے تیغ پہ اور صاف دو کیا

القصہ جناب امیرؑ اس جن کو واصل جہنم کر کے مشکیزہ سے پانی بھرنے لگے لیکن تین بار ایسا مگر جنوں نے رسی توڑ ڈالی۔ تین بار ایسا ہوا تو دبیرؔ کہتے ہیں

جب تین دلو آب رہے قصرِ چاہ میں طاقت نہ رہی ضبط کی شیرِ الٰہ میں

بس پھر کیا تھا مولائے کائنات نے رسی خود اپنی کمر میں باندھ لی اور اصحاب سے کہا کہ:

کوشش ہے فرض ساقیٔ کوثر کے واسطے بنتا ہوں ظرف آبِ پیمبرؐ کے واسطے

آخر سرا رسن کا رفیقوں کو سونپ کر اترا میانِ چاہ شہنشاہِ بحر و بر

رونق فزائے چاہ وہ دریائے جود تھا گویا کہ ایک کوزے میں دریا نمود تھا

ایک وقت ایسا آیا کہ مولائے کائنات اصحاب پیمبرؐ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور رسی ٹوٹ گئی:

رو کر پکارے شہؑ کو وہ الفت سے چاہ سے لیکن صدا علیؑ کی نہ کچھ آئی چاہ سے

جب اس کا علم سرکار رسالتمآبؐ کو ہوا تو بہت پریشان ہوئے اور جنابِ احدی سے اپنے بھائی علیؑ کے لیے دعائیں کرنے لگے:

جس چاہ میں کہ یوسفِؑ یعقوبؑ تھا گرا یوسفؑ کو اس کنویں نے نہ ایذا دی مطلقا
اے چاہ تجھ میں آیا ہے یوسفؑ رسولؐ کا مشکل کشا ، امیرِ عرب ، شاہِؑ لافتا
راحت دی یا کہ موردِ رنج و بلا کیا
اے چاہ تو نے شوہرِ زہراؑ سے کیا کیا

ناگاہ اس کنویں میں ہوا نعرہِ عظیم جس نعرے سے کہ رعدِ فلک کو ہو خوف و بیم
گویا زمیں پہ چرخ گرا اور ہوا دو نیم آئی ندا کہ جس کا منادی تھا خود کریم
میں نے کہا یہ غلغلہ ہے کس دلیر کا
آئی ندا یہ نعرہ ہے خالق کے شیر کا

اس کے بعد رسی ڈالی گئی اور امیر المومنین علیہ السلام بیس ہزار جنوں کو قتل کر کے چوبیس ہزار قبائل کو مسلمان بنا کر کنوئیں سے برآمد ہوئے۔ اصحاب نے مسرت کا اظہار کیا اور سب کے سب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور اکرمؐ نے امام علیؑ کو سینے سے لگایا۔ فتح کا کیا منظر پیش کیا ہے دبیرؔ نے:

پھر نکلا بُرجِ چاہ سے وہ آفتابِ دیں مثلِ شعاعِ مہر تھے سب جن قریں قریں
لپٹے نبیؐ وصی سے گلے کہہ کے آفریں پھر پوچھا ریسماں سے کمر تو چھلی نہیں
ظاہر نشاں رسن کے کمر سے جو ہوتے تھے
بوسہ رسولؐ دیتے تھے واں اور روتے تھے

اس جنگ پر تحریر ختم کرتے ہوئے مجھے دبیرؔ کے ایک دوسرے مرثیے کا بند یاد آیا جو مجھے بہت پسند ہے:

ہے قصہِ بیرالالم اس طرح تحریر حیدرؑ نے کیا لشکرِ جن کو تہہ شمشیر
لڑتا تھا عجب شان سے وہ صاحبِ توقیر ہر وار پہ تسبیح تھی ہر ضرب پہ تکبیر
اصحابِ نبیؐ تو بسرِ چاہ کھڑے تھے
اور شیرِ خدا تیغ بکف کود پڑے تھے

حصہ دوم: میدانِ کربلا میں جنات کا ورود، کربلا میں جنات کی آمد کا قصہ ہم تک کئی حوالوں سے پہنچتا ہے جیسے تاریخ روضہ الشہدا ملا حسین واعظ کاشفی، اسرار الشہادت آقائے دربندی، منہج الشہادت اخوند ملا جعفر استابادی، سوانح زعفر جن سید آغا مہدی لکھنوی میں بھی یہ قصہ تفصیل سے مذکور ہے۔

جنات کا تذکرہ دوسرے مرثیہ گو شعرا نے بھی نظم کیا ہے۔ جو دوسرے شعرا راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں ان میں مرزا جعفر علی فصیح، میر انیسؔ، میرزا عشقؔ، میرزا تعشقؔ، شاگردِ دبیرؔ صغیرؔ سونوی، فرزدقِ ہند شمیمؔ امروہوی، آغا شاعرؔ قزلباش، عروجؔ بھرت پوری اور علامہ نسیمؔ امروہوی بھی شامل ہیں۔ مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم و مغفور نے ان سب سے زیادہ یعنی ۹ مرثیے نظم کیے جن میں جنات کا تذکرہ ہے۔ ایک مرثیہ جو پہلے حصہ میں آپ نے پڑھا باقی مرثیے درج ذیل ہیں:

؎ اے دبدبہِ نظم دو عالم کو ہلا دے ؎ ثابت غمِ شبیرؑ ہے قرآنِ خدا سے
؎ اے مومنو سب خلق پہ احساں ہے علیؑ کا ؎ خاصانِ خدا کو جو محبت ہے خدا سے
؎ اے مومنو شبیرؑ پہ کیا رنج و بلا ہے ؎ جب آئی خزاں باغِ رسولِ دو سرا پر
؎ تسبیح امامت جو گری خاک شفا پر ؎ اے مومنو شبیرؑ دو عالم کے شرف ہیں

واقعۂ کربلا سے جنوں کا خاص ربط ہے۔ بعض عزاخانوں میں بھی جناتوں کا نوحہ و ماتم سنا جاتا ہے اور ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جو جنوں سے اپنی ملاقات کا حال بتاتے تھے۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب فضائل الصحابۃ میں ایک روایت نقل کی ہے جو اس طرح ہے:

حدثنا عبداللہ قال حدثنی أبی نا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ مَهْدِيٍّ، قَالَ: نا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ عَمَّارٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أُمَّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: "سَمِعْتُ الْجِنَّ يَبْكِينَ عَلَى حُسَيْنٍ، قَالَ: وَقَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: سَمِعْتُ الْجِنَّ تَنُوحُ عَلَى الْحُسَيْنِ رَضِيَ

اللہُ عَنْہُ

اُم المؤمنین اُم سلمہؓ نے فرمایا: میں نے جنوں کو حسینؑ پر روتے اور نوحہ کرتے ہوئے سنا ہے۔

جیسے مرزا دبیرؔ ایک مرثیے میں ایک عاشقِ حسینؑ، حافظ و ناظرِ قرآن سے ایک جن کی ملاقات لکھتے ہیں

کہتے ہیں کہ اک روز وہ ذی مرتبہ و ذی جاہ — قرآں کی تلاوت میں تھا مصروف بصد بُکا
اک سمت سے ناگاہ سنا نالۂ جانکاہ — حیراں ہوا یہ عاشقِ فرزندِ یداللہ
کی عرض کہ بر لا تو تمنا مرے جی کی — آ پاس قسم تجھ کو حسینؑ ابن علیؑ کی

بس نامِ حسینؑ اس کی زباں پر جونہی آیا — پہلے سے بھی دو چند سنا شور بُکا کا
حیراں ہوا وہ عاشقِ شاہنشہِ والا — اس عرصے میں اک شخص ہوا سامنے پیدا
فریاد زباں پر تھی غمِ شاہِؑ عرب سے — اور پاوں نہ اٹھتے تھے ضعیفی کے سبب سے

اس حافظ قرآنِ خدا نے کہا ناگاہ — تم اپنے ذرا نام و نسب سے کرو آگاہ
بولا وہ عزادار یہ با نالۂ جانکاہ — میں قومِ اجنّہ سے ہوں اے بندہِ اللہ
ہر شے سے مبرا ہوں نہیں کام کسی سے — ہے عشق مجھے نامِ حسینؑ ابن علیؑ سے

روایت کے مطابق ایک دن زعفرِ جن اپنے دربار میں جشن منا رہا تھا کہ اسے خبر ملی کہ کربلا میں جنگ ہو رہی ہے اور امام حسینؑ دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ زعفر غمگین ہو کر ان جنوں سے کہتا ہے

دم غم سے الجھتا ہے یہ کھلتا نہیں ہم پر — پانی بھی ہوا بند شہنشاہِؑ اُمم پر
تم لوگوں کا پہرہ تھا اسی بیرِ الم پر — آئے جو علیؑ گر پڑے سر کٹ کے قدم پر
پتّھر تھے کناروں پہ مگر ہوگئے پانی — یوں لے گئے پانی کہ جگر ہوگئے پانی

زعفرِ جن جشن کو موقوف کر کے جناتوں کا لشکر لیے ہوئے کربلا کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف میدان کربلا میں امام کے اقربا و اصحاب کی شہادت ہو چکی ہے اور دبیرؔ منظر کشی کرتے ہیں

تسبیحِ امامت جو گری خاکِ شفا پر — غلطاں ہوا ہر دانہ جُدا نامِ خدا پر
پھر آئی بلا قبلۂ اربابِ بلا پر — اجماع ہوا قتلِ امامؑ دو سَرا پر
دانوں کی طرح سب رفقا گرد پڑے تھے — حیران امامؑ اپنی جماعت میں کھڑے تھے

تنہا تھا امامؑ ایک نمازی نہ تھا ہمراہ — اشکوں کو جماعت تھی بس اور پیشِ نماز آہ

تہلیل تھی گو پیاس سے روحِ شہِؑ ذیجاہ پر لب پہ تھی تسبیح تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہ
ہے خاکِ شفا سجی میں تصریح کی خاطر شبیرؑ ہوئے خاک اسی تسبیح کی خاطر

فوج یزید کے سپاہی امام حسینؑ کو طعنہ دیتے ہیں:

برتر ہے سلیماں سے تیری قدر کا پایا مشہور ہے جنات نے تخت ان کا اٹھایا
زینبؑ نے نکل کر تمھیں گھوڑے پہ بٹھایا اک جن نہ رکابِ شہؑ دیں تھامنے آیا
اب بھی نہیں آتے کہ قلق حد سے سوا ہیں ہم بھی تو بھلا دیکھیں کہ جن کون ہیں کیا ہے

امام حسینؑ آسمان کے طرف سر اٹھا کر کہتے ہیں:

یہ درجہ تیرے بندۂ مظلوم کا ہے اب صادق کو یہ کاذب کہے جاتے ہیں ہے غضب

لشکرِ جنات کی میدان کربلا میں آمد ہوتی ہے اور وہ ماتم کرتے نظر آتے ہیں:

رُخ جانبِ گردوں کیے یہ کہتے تھے مولا جو رن میں غبار ایک طرف سے ہوا پیدا
گھوڑوں کی تگ و پو کا غل اور بیرقیں صدہا اس گرد سے آتی تھی صدا ہائے حسینؑ
اے بے وطن و بے سر و ساماں تو کدھر ہے اے خنجرِ بے آب کے مہماں تو کدھر ہے

مظلوموں کے مظلوم تجھے کس نے ستایا معصوموں کے معصوم ترس تجھ پہ نہ کھایا
اے سیّدِ سادات تو کیوں کعبے سے آیا کونین کو ویراں کیا جنگل کو بسایا
جو آئی بلا گردنِ تسلیم جھکا دی! صابر نے غلاموں کو بھی اپنے نہ صدا دی!

ناگہ وہ غبار اڑتا ہوا نہر پر آیا گھاٹوں پہ نہ پھر ایک نگہباں نظر آیا
میدان کی بھی فوجوں کا منھ کو جگر آیا ہر غول حضورِ شہؑ دیں ننگے سر آیا
ہاتھوں پہ تو دستاریں تھیں اور لب پہ یہ نالے اے نوحِ علیؑ کشتیٔ اُمّت کو بچا لے

تو تیری کرامات میں شک لائے وہ کافر اے قدرتِ حق صاف ہے قدرت تیری ظاہر
لے بخش دے اُمّت کے گنہ ناناؐ کی خاطر ہم عاصی و خاطی ہیں تو ہے طیّب و طاہر
مظلومی سے تم نے ابھی دیکھا تھا فلک کو سو غیب سے فوج آئی ہے حضرتؑ کی کمک کو

حضرت زینبؑ اسے دشمنوں کی کوئی نئی فوج سمجھ کر گھبرا جاتی ہیں مگر امام حسینؑ ان کو تسلی دیتے ہیں:

شہؑ نے کہا گھبراؤ نہ اے خواہرِ غم خوار ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ہو لشکرِ کفار

ہر ایک کا نعرہ ہے کہ یا حیدرؑ کرار
اغلب ہے کہ یہ لوگ ہوں سب مومن و دیندار
شان ان کی نہیں ملتی ہے طرزِ بشری سے
کیا اس کا عجب ہوئیں جو یہ جنّ و پری سے

اس فوجِ ظفر موج کی شوکت کو جو دیکھا
لشکر میں لعینوں کے تلاطم ہوا برپا
سردار عجب شکل سے اس فوج کا نکلا
سر ننگے ، گریبان دریدہ کیے اپنا
رونے میں یہ آواز تھی اس اہلِ وفا کی
زندہ ہیں کہ رحلت ہوئی شاہِؑ شہدا کی

زعفر جن امامؑ کے قدموں پر گرتا ہے اور امامؑ کو بتاتا ہے کہ:

مل کر قدم آنکھوں سے وہ غازی یہ پکارا
زعفر ہوں میں اک بندۂ ناچیز تمہارا
اس وقت سنا حال جو حضرت کا قضارا
امداد کو حاضر ہوا لشکر لیے سارا
یاں آکے جو دیکھا تو عجب حال ہوا ہے
سارا چمنِ فاطمہؑ پامال ہوا ہے

گر دیر میں آتا تو تمہیں کاہے کو پاتا
کس کے قدمِ پاک میں آنکھوں سے لگاتا
حضرت نے کہا اس سے بھی پہلے اگر آتا
بھائی مری تقدیر کا لکھا نہ مٹاتا
سب مر گئے جینے سے دل اب سیر ہے زعفر
مرنے میں ہمارے نہیں کچھ دیر ہے زعفر

جنات کا حضرت عباسؑ پر گریہ و ماتم کرنا

ہاتھوں کو کٹائے جہاں عباسؑ پڑے ہیں
واں غول کے غول اس گھڑی یا شاہؑ کھڑے ہیں
شکلیں ہیں مہیب اور قد و قامت بھی بڑے ہیں
غُل ہے انھیں مارو کہ جو سیّد سے لڑے ہیں
سب کرتے ہیں ماتم تنِ صد پاش کے اوپر
سردار کو غش آگیا ہے لاش کے اوپر

وہ بولا لبِ نہر ہے یہ کون دلاور
میں سمجھا تھا پھر قتل ہوئے حیدرؑ صفدر
چلائے کمر تھام کے شہؑ ہائے برادر
عباسؑ ! تمہیں پوچھتا ہے بھائی سے زعفر
محسن کہوں ، عاشق کہوں ، سقا کہوں بھائی
یہ سب ہیں لقب تیرے بتا کیا کہوں بھائی

ایک جن فریاد کرتا ہے امامؑ اس کو جواب دیتے ہیں:

اک بولا کہ آقا میرے بچے ہیں ذرا سے
مر جائیں گے وہ بعد مرے قحطِ غذا سے
شہؑ نے کہا میرے بھی تو بچے موئے پیاسے
اپنا سا ہی دل سمجھو ڈرو قہر خدا سے
بابا پہ سکینہؑ کے جو تلوار چلے گی
بتلاؤ تمہیں کس کے وہ سائے میں پلے گی؟

شرماؤ ذرا ہاتھ دھرو دل پہ ہمارے آرام سے بچے گھروں میں ہوں گے تمہارے
پردیس میں فاقے سے ہیں بچے میرے سارے کچھ مرگئے کچھ مرتے ہیں پیاس کے مارے
دیکھو وہ کھڑی دیوڑھی پہ روتی ہے سکینہؑ اس عمر میں بن باپ کے ہوتی ہے سکینہؑ

زعفر جن امام حسینؑ کو اپنے باپ کے ایمان لانے کا واقعہ بتاتا ہے:

حیدرؑ نے مرے باپ کو جب شیعہ کیا تھا مولا نے نشاں بارہ اماموں کا دیا تھا
روئے تھے بہت آپ کا جب نام لیا تھا دے کر یہ خبر خونِ جگر اپنا پیا تھا
میّت کوئی رہتی نہیں محتاج کفن کی شبّیر کفن پائے گا نہ خاک وطن کی

اس دشت میں جب ذبح وہ ہوگا تہِ خنجر ہوجائے گی وہ خاک لہو شیشے کے اندر
اس خاک کا سن کر یہ خواص اے شہِؑ صفدر بابا بھی مرا لے گیا اک شیشے میں بھر کر

کیا عمدہ بیت ہے

تھی دل میں جو ابنِ شہؑ لولاکؐ کی الفت پیدا ہوا تھا آگ سے تھی خاک کی الفت

امام حسینؑ زعفر جن سے اپنے پیاروں کا ذکر کرتے ہیں

وہ شیر سا سوتا ہے لبِ نہر جو صفدر انتیس برس کا ہے برابر کا برادر
سات آٹھ برس کے ہیں وہ ہمشیر کے دلبر پامال وہ گھوڑوں سے ہے لختِ دلِ شبرؑ
وہ رشک قمر جس کے کلیجے میں سناں ہے اٹھارہ برس کا مرا فرزندِ جواں ہے

شہؑ نے کہا جب سے علیؑ اصغر گئے مارے جاتی رہی پانی کی ہوس دل سے ہمارے

زعفر جن امام سے کہتا ہے کہ ابھی حکم دیجیے تو ان کافروں کو نیست و نابود کر دیں:

اس نے کہا ہم بن کے بشر جنگ کریں گے وہ شکل بنائیں گے کہ انساں نہ ڈریں گے
ان ناریوں سے قعرِ جہنم کو بھریں گے ہم فدیۂ شاہِؑ شہدا ہو کے مریں گے
سر دے کے شریکِ شہدا ہوئیں گے مولا ہم پائے مبارک پہ فدا ہوئیں گے مولا

امامؑ زعفر کو جنگ کرنے سے روکتے ہیں:

دریائے کریمی نے پھر اک جوش جو مارا فرمایا نہ گھبراؤ مجھے سر نہیں پیارا
یہ زعفر جن آیا ہے غمخوار ہمارا لشکر بھی اسی کا یہ ترائی میں ہے سارا
سر دوں گا پہ احسان کبھی سر پہ نہ لوں گا اکبرؑ کی قسم حکمِ جہاد اس کو نہ دوں گا

زعفر جن کہتا ہے کہ گروہِ جنات آپ کی رزم دیکھنے کا مشتاق ہے:

یہ سنتے ہی زعفر کو شہؑ دیں نے پکارا — لے دیکھ لے اب بڑھتا ہے اب پیاس کا مارا
یہ کہہ کے جو مہمیز کیا رخش قضارا — اس طرح اڑا آگ پہ جس طرح سے پارا
قبضے پہ پڑا ہاتھ ولی ابنِ ولی کا — جبریلؑ سبق پڑھنے لگے نادِ علیؑ کا

ہاتفِ غیبی سے آواز آتی ہے میرے بچے کب تک جنگ کرے گا:

بس بس مرے پیارے مرے بیکس مرے تنہا — ہے نانا کی امت پہ ترحم تمہیں زیبا

یہ سنتے ہی شبیرؑ نے تلوار کو روکا — فرمایا یہ زعفر سے کہ لڑنا مرا دیکھا
زعفر نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ آقا — اعجاز ہے اعجاز یہ حملہ نہیں حاشا
فاقے میں یہ ہمت یہ لڑائی نہیں دیکھی — یہ تیغ یہ بُرش یہ صفائی نہیں دیکھی

زعفر کو اپنی جنگ دکھانے کے بعد امامؑ کہتے ہیں:

حضرتؑ نے کہا بس مرے مطلب مرے سارے — پھر میان میں کی تیغ اور اعدا کو پکارے
لو ظالمو ! اب بھیج دو قاتل کو ہمارے — زعفر سے بھی مڑ کے کیے رخصت کیے اشارے
وہ بولا کہ سونپوں میں کسے شاہِؑ ہدا کو — حضرتؑ نے کہا تیروں کو تیغوں کو قضا کو

سر پیٹ کے زعفر نے تو لی راہ وطن کی — یاں ضعف سے بند آنکھیں ہوئیں شاہِؑ زمن کی

مایوس ہوا زعفرِ جن اور ہوا رخصت — یہاں شاہؑ ہوئے زیب دہِ دشتِ شہادت
ہر سمت سے حضرتؑ پہ جھکے اہلِ شقاوت — زخموں سے عجب تھی شہؑ مظلوم کی حالت
پالا تھا جسے سینے پہ محبوبؐ خدا نے — غربال کیا اس کا جگر اہلِ جفا نے

مرزا دبیرؔ کے کلام کی خصوصیات اور محاسن نظم پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ مختصر یہ کہ جذبات نگاری، واقعہ نگاری، کردار نگاری اور مکالمے، رزمیہ عناصر کا بیان کرنا، صنائعِ لفظی وصنائعِ مضمون کا استعمال، جدت طرازی، قدرت کلام، زود گوئی، مصائب اور بین کا نظم کرنا کمالِ عروج پر تھا۔ اس مختصر مضمون کو دبیرؔ کے اس مقطع پر ختم کر رہا ہوں

اب آگے تو ہے لاش کی پامالی کا ساماں — خاموش دبیرؔ اب کہ بیاں کا نہیں امکاں
یہ مجلسِ شبیرؑ ہے کر نالہ و افغاں — حاضر ہے یہاں فاطمہؑ با موئے پریشاں
کہہ شہؑ سے تمہیں واسطہ اللہُ احد کا — میرے لیے عباسؑ کو دو حکم مدد کا

❁❁❁❁

قوتِ احساس اور متخیلہ کا شاعر۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ

محمد ارشد رضوی

اُردو مرثیہ گوئی اور مرثیہ نگار شعرا کی تاریخ مرتب کرنے والے ہر محققین اور تبصرہ نگار نے صراحت کے ساتھ یہ تحریر کیا ہے کہ دبیرؔ کے والد نے دبیرؔ کا رجحان شاعری کی جانب دیکھ کر محض ۱۱ سال کی عمر میں اُنھیں میر ضمیرؔ کی شاگردی میں سونپا جو اس وقت لکھنؤ میں ایک مسلم الثبوت استاد کی حیثیت رکھتے تھے اور خصوصاً مرثیہ نگاری میں نام پیدا کر چکے تھے۔

جب میر ضمیرؔ نے پوچھا صاحب زادے کچھ کہا ہے تو مرزا دبیرؔ نے یہ قطعہ پیش کیا۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے　　کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر　　کسی کا کُوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

مندرجہ بالا قطعہ پر نظر ڈالنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی پختہ مشق صاحبِ فکر و فن شاعر جسے لفظ و معنی پر قدرت حاصل ہو کی شعری کاوش ہے ایک گیارہ سال کے بچے کے شعور شعر میں یہ پختگی بھی آسکتی ہے جب اس کے رجحان کے ساتھ ساتھ اس نے اس وقت کے رائج معلوم وزبان پر دست رس حاصل کر لی ہو اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دہلی سے لکھنؤ کے منتقلی کے بعد دبیرؔ کے اب وجد نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اس دور کے مستند اساتذہ کو مقرر کیا جن سے انھوں نے عربی، فارسی علم تفسیر علم کلام اور علم بیان کا درس حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دبیرؔ شاعر کے علاوہ اپنے دور کے عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ بحیثیت شاعر ان کے کلام میں ان علوم و فنون کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جنہیں دبیرؔ نے اپنی قوتِ احساس اور قوتِ متخیلہ سے فن کے بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ اگر شاعری احساس کا نام ہے تو دبیرؔ احساس کے بادشاہ ہیں اور اگر پرواز تخیئل شاعری کا حسن ہے تو دبیرؔ متخیلہ کے شہنشاہ ہیں مرثیے میں ابتدا عام طور پر صبح کے منظر سے ہوتی ہے لیکن دبیرؔ کے یہاں صبح میں بھی احساس کی وہ کارفرمائی ملتی ہے کہ رثائیت کے ایسے پہلو صبح سے نمودار ہوتے ہیں کہ سورج بھی چہرۂ صبح پہ داغ نظر آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

تھی صبح یا فلک کا وہ جیبِ دریدہ تھا　　یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا　　یا فاطمہؑ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہیے نہ مہر صبح کے چہرے پہ داغ تھا
اُمیدِ اہلِّ بیت کا گھر بے چراغ تھا

اس کے علاوہ سفر اسیریٔ قید خانۂ شام کے تاریخی واقعات کو دبیرؔ نے حسیّت سے پُر اور دلخراش انداز میں پیش کیا ہے کہ غم واندوہ کا طوفان اُٹھتا ہے ان کا یہ دل گداز اور غم انگیز انداعزاداری کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہے اور شاعری کے اعلیٰ مدارج بھی قائم کرتا ہے۔

دبیرؔ جب روز عاشور کی گرمی نظم کرتے ہیں تو قوت احساس وقوت متخیلہ دونوں کے جوہر سامنے ہوتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہوں۔

تنہا کھڑے ہیں دن میں امامِ فلک جناب　　گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب

بے آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب خطِّ غبار سے ہے بسی ابرئی سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی رنگت ہے برجِ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی حدّت ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

مندرجہ بالا بند میں پہلا مصرعہ امام حسینؑ کا تنہا کھڑے ہونا خود اپنے آپ میں پورا مرثیہ ہے جس میں بے کسی اور مظلومی کا احساس اُجاگر ہے۔ اگر میر انیسؔ کے مرثیے ''آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے'' کو اپنے آپ میں مرثیہ کہا جاسکتا ہے تو دبیرؔ کا یہ مصرعہ بھی اپنے آپ میں احساس سے پُر پورا مرثیہ ہے۔ مندرجہ بالا بندوں میں مشاہدہ اور آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں چھالے نما ہونا جب ہلکی دھند جیسے بادل ہوں تو بیان حقیقت کے قریب ہوتا ہے اور شاعر کا مشاہدہ اور نازک خیالی تخیل کی پرواز سب یکجا ہوجاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ فوارے کو کل نہ پڑتا اور پانی کی زبان باہر نکلنا سب گرمی کے استعارے ہیں اور نازک خیالی زبان و بیان کی جادوگری مشاہدہ ہے کی کارفرمائی شاعری کو عروج بخش دیتی ہے۔ یہ تمام باتیں دبیرؔ کے کلام کا خاصہ ہے۔

مرزا دبیرؔ کا شعری سفر میر ضمیرؔ کی شاگردی میں عہدِ غازی الدین حیدر سے شروع ہوکر عہدِ واجد علی شاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ جس بچے نے ۱۱ سال کی عمر میں پختہ انداز بیان فکر کی گہرائی اور زبان و بیان کے ساتھ مذکورہ قطعہ کہا ہو اپنے عہدِ شباب میں کس انداز کی شعری کرے گا دبیرؔ کا کلام اس کی دلیل ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میر انیسؔ تو عہدِ واجد علی شاہ میں لکھنؤ آئے اس دور تک دبیرؔ نے اپنی زبان و بیان معنوی آفرینی موضوعات کے تنوع اور قوتِ متخیلہ اور قوتِ احساس کا لوہا منوالیا تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دبیرؔ اپنے دور کے مرثیہ نگاروں ضمیرؔ و خلیقؔ کے مقابلے بہت آگے نکل چکے تھے۔ ہاں میر انیسؔ کے آنے کے بعد پہلی بار دبیرؔ کو اپنی شاعری کے مقابل زبان و بیان پر قدرت رکھنے والا اور دریا سی روانی کے اسلوب کا علمبردار شاعر میر انیسؔ کی شکل میں ملا جس نے اُن کی شاعری پر مزید صیقل کا کام کیا اور دبیرؔ کی شاعری مزید نکھر کے سامنے آئی۔ دبیرؔ نے نیچر کے خاکوں میں اپنی پروازِ تخئیل اور نازک خیالی سے ایسے رنگ بھر دیے ہیں کہ نگاہ میں زبان و بیان کی اس جادوگری میں محوِ حیرت رہتی ہیں ان کا کمال یہ ہے کہ ایسے مضامین میں بھی مرثیت پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ احساس میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

مولانا شبلیؔ نے موازنہ لکھتے وقت دبیرؔ کے کلام کا کلی طور پر مطالعہ نہیں کیا اور انیسؔ کے سہلِ ممتنع اور دریا کے بہاؤ لفظوں پر قدرت اور جادو بیانی میں کھوکر انیسؔ ہی کے مداح بن گئے اور دبیرؔ پر صحت مند تنقید کے بجائے تنقیص کے دائرے میں داخل ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ دبیرؔ کا کلام انیسؔ کے مقابلے کہیں سے بھی ہلکا نہیں ہے صرف اسلوب کا فرق ہے انیسؔ کا اسلوب عام بول چال کی لفظیات اور سلاست زبان پر مبنی ہے تو دبیرؔ کا اسلوب اُن کے تبحرِ علمی کے سبب فارسی تراکیب سے مملو مضمون آفرینی کے ساتھ ہے لیکن سلاست اور روانی کا عنصر غائب نہیں ہوتا اور یہ بات انیسؔ کے مقابلے اُن کی علمی استعداد کے وزن کے سبب ہے۔ شبلیؔ نے مثال دی ہے کہ انیسؔ نے کہا کہ ''سنتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے'' اور دبیرؔ کہتے ہیں کہ ''زیرِ قدم والدہ فردوسِ بریں ہے'' دونوں مصرعے اپنے اپنے اسلوب کے اعتبار سے سلیس ہیں اور فصیح اور فصیح و طبع بھی

اس میں ایک دوسرے کی فوقیت ظاہر نہیں ہوتی۔ ہاں شبلی کے موازنہ سے دبیرؔ کو جو سب سے زیادہ فائدہ ہوا وہ یہ کہ دبیرؔ پر تحقیق وتنقید کا باب وا ہوگیا اور ''حیاتِ دبیرؔ'' ''المیزان'' اور ''ردالموازنہ'' جیسی کتابیں معرضِ وجود میں آگئیں جس سے دبیرؔ دنیائے ادب میں بے مثل شاعر کے طور پر شناخت قائم حاصل کرگئے ورنہ دبیرؔ کے مرثیے کی کچھ جلدیں شائع ہوئی تھیں اور دفتر ماتم میں ان کے مراثی شائع ہوتے رہے تھے۔ لیکن جس شدّومد سے دبیرؔ کے کلام پر تحقیق وتنقید اور محاسن پر قلم فرمائی ہوئی اس میں موازنے کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ہاں دبیرؔ کو کچھ مقامات ایسے ہیں جن میں انیسؔ پر فوقیت حاصل ہے اور وہ ہیں موضوعات میں تنوع اور توسیع اور دوسری یہ کہ شاعری کا فن انیسؔ کو ورثے میں ملا تھا لیکن دبیرؔ نے اپنی جانفشانی اور علمی وادبی کاوش سے کسب کرتے ہوئے بے مثل شاعری کا نمونہ پیش کیا دبیرؔ کو ورثے میں کچھ نہیں ملا تھا۔ انیسؔ کی شاعری میں خلیقؔ کی صاف ستھری کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی زباں اور میر حسنؔ کی سادگی میں پرکاری اور مثنوی سحرالبیان جیسی سلاست ورثے میں میں ملی تھی جس پر مزید صیقل کرکے انیسؔ زبانِ اردو کے انیسؔ بنے تو دبیرؔ نے اپنی کاوش سے اپنی دبیریت کا لوہا منوایا۔ دبیرؔ میر ضمیرؔ اور خلیقؔ کے ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ آتشؔ و ناسخؔ کے بھی ہم عصر تھے ان سبھی نے عہدِ غازی الدین حیدر میں اپنے فن کا لوہا منوایا۔ ناسخؔ کے نام اردو زبان کی اصلاح کا تحفہ ضرور ہے اور زبان کی تصفیہ کی مہم نے ناسخؔ کو زندۂ جاوید بنایا لیکن ان کے کارنامے فقط غزل تک ہیں لیکن مرزا دبیرؔ کے ناسخؔ کی مہم کے تحت زبان پر توتوجہ دی ہی ساتھ ہی مرثیے جیسی صنف کے ذریعہ تفسیرِ حدیث فقہ، کلام، اخلاقیات، رزم وبزم کے لیے اردو زبان وارد وشاعری کو روشناس کرایا جب یہ زبان فارسی کی رہینِ منت ہوکر داستانِ عشق ومحبت اور تصوف کی تبلیغ وترویج تک محدود تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری سے یہ ثابت کردیا کہ شعری اظہار کے لیے فقط غزل یا قصیدہ یا مثنوی میں الجھنے کے بجائے ایک ایسی صنفِ سخن کو زبان و بیان اور موضوعات ومضامین سے آراستہ کیا جائے جس میں رزم وبزم، واقعہ، مکالمہ نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری، جس میں جنگل وصحرا کی تصویریں بھی ہوں دین اور اخلاق کی باتیں بھی ہوں حدیث وقرآن کی سربلندیاں بھی ہوں تاریخ وروایات کی سرگوشیاں بھی ہوں گویا ہر قسم کے مضامین کو جو دامن میں سمیٹ نے جس پر فارسی کے مرہون منت ہونے کا ٹھپہ بھی نہ ہوتو انھوں نے مرثیہ کو ان تمام صفات سے اپنی بے پناہ قوتِ احساس اور متخیلہ سے اس کی مثال بنادیا حقیقت تو یہ ہے کہ دبیرؔ نے یہ کام تب کیا جب اُردو شاعری میں دہلی سے لے کر لکھنؤ تک کے شعرا غزل سرائی ہی کو شعروادب کا مرکز بنائے ہوئے تھے یہاں بھی دبیرؔ منفرد ہیں۔ بے شک انیسؔ کا کارنامہ بھی اسی نہج کا ہے لیکن انیسؔ عہدِ امجد علی شاہ میں جب لکھنؤ آئے تو دبیرؔ اردوزبان وادب اور شعری فضا کو اُن مضامین سے پُر چکے تھے۔

مبالغہ جب حدِ امکان میں ہو تو شاعری کا حسن ہوتا ہے محال اور ناممکنات میں ہو تو غلو بن کر اپنی حقیقت کھو دیتا ہے۔ دبیرؔ نے مبالغے کو شاعری کا حسن بنا کے پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

یہ بند جب وہ حضرت عباسؑ کے آمد نظم کرتے ہیں۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے — سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو — جبرئیلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نُہ قلعۂ افلاک کے در بند — جلاّدِ فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند

وا ہے کمرِ چرخ سے جوزہ کا کمر بند سیّارے ہیں غلطاں صنعتِ طائرِ پر بند
انگشتِ عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

بظاہر مندرجہ بالا بند مبالغہ کی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن روایات اور احادیث کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو ہر بات حدِ امکان میں کیونکر حضرت عباسؑ کی شجاعت اور دلیری خداداتھی حضرت عباسؑ کو خالق نے شجاعت اور ہمت و ہیبت و دلیری کے لیے خلق کیا تھا۔ مندرجہ بالا بند میں جن تلمیحات و استعارات و تمثیلات سے کام لیا گیا ہے وہ عین حقیقت ہیں۔ کیونکر ''جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوتے پر کو'' کی تلمیح حضرت علیؑ کی سرِ مرحب پر چلنے والی وہ ضرب ہے جسے جبرئیلؑ نے اپنے پروں پر روکا تھا یا یوں کہیے کہ جبرئیلؑ کے پر کو دیکھ کر ضرب کو کم کیا تھا ورنہ زمین کا طبق کٹ جانے کا خطرہ تھا ایسا رجز کی ضربت کے لیے روایات ہیں اور اسی شان کے اس شمشیر کو پسرِ حیدرؑ کرار کے ہاتھ میں دیکھ کر جبرئیلؑ کا لرزنا حقیقت بن جاتا ہے۔ دبیرؔ حضرتِ عباسؑ کی ہیبت و دلیری کو سراپا میں بھی قائم اسی انداز میں رکھتے ہیں اور سراپا میں اپنی اس بات کی دلیل پیش کرتے ہیں۔

سورج کو چھپاتا ہے گہن آئینے کو رنگ داغی ہے قمر سوختہ دل لالۂ خوش رنگ
کیا اصل در و لعل کی وہ پانی ہے یہ سنگ دیکھو گل و غنچہ وہ پریشاں ہے یہ دل تنگ
اس چہرے کو داور نے ہی لاریب بنایا بے عیب تھا خود نقش بھی بے عیب بنایا

آئینہ کہا رُخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک پہ صیقل ، یہاں قدرت نے جلا کی طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینے میں چہرۂ انساں نظر آیا اس رخ میں جمالِ شہِؑ مرداں نظر آیا

مضمون آفرینی سے معنی خیزی، تخئیل کی پرواز دبیرؔ کی شاعری کا ایسا حسن ہے جس کی مثال کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ دبیرؔ نے مرثیے میں قصیدے کے شوکت الفاظ جوش و خروش اور طنطنے کو اور مثنوی کے بیانیہ اور سلاست اور روانی کو اور مضمون بزم میں غزل کی نازک روی کو یکجا کر کے بتا دیا کہ دیگر شعرا قصیدہ اور مثنوی نیز غزل میں انفرادیت رکھتے ہوئے اپنی شناخت رکھتے ہیں مگر میرے اشہبِ تخیل اور فکر کی پرواز نے صنفِ مرثیہ میں ہی ہر صنفِ سخن کے صنعات کو یکجا کر دیا ہے۔ اور لفظوں کے حسنِ استعمال اور حکومت سے میر اشعورِ شعر جس بلندی پر ہے وہاں پہنچنے کے لیے بہت ریاضت اور علمی و فکری اور تخئیل استعداد کی ضرورت ہے۔ مرثیے میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف کو لازم کے ذیل میں شاعر اپنی تمام تر شعری صلاحیت اور پروازِ تخیل کو بروئے کار لا کر جادو بیانی کے جوہر دکھتا ہے دبیرؔ یہاں بھی بے مثل مضمون آفرینی، سلاست و روانی، تشبیہات و استعارات و تلمیحات سے اپنا لوہا منواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دبیرؔ متخیلہ کے ذریعہ لفظوں کی جادوگری اور جودتِ طبع کے ایسے جوہر دکھاتے ہیں کہ ان کا کلام شاعری کی معراج بن جاتا ہے۔ گھوڑے کی تعریف میں یہ دو بند ملاحظہ ہوں۔

وہ رخش تھا کہ ابلق ایام کا اقبال نک سک سے درست اور جواں بخت و جواں سال
جادو کی فقط آنکھ نری معجزے کی چال خورشید کے سم برق کی دم سنبلہ کی یال
قوت کی طبیعت تھی دلیری کا جگر تھا سرعت کا بدن فہم کا دل عقل کا سر تھا

جناب عون ومحمدؑ کے گھوڑوں کی تعریف کرتے ہیں تو انداز کچھ یوں ہے۔

شبدیز ِ ملک سامنے ان کے کمری ہے نبض ان کی شرر سانس نسیم سحری ہے
آنکھوں میں وہ شوخی ہے کہ شیشوں میں پری ہے سایہ ہے ہما نقشِ قدم کبکِ دری ہے
چلنے میں اگر نرم روی مدِّ نظر ہو
آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو

جن تشبیہات واستعارات کو بروئے کار لاکر دبیرؔ متخیلہ کے جوہر دکھلاتے ہیں وہ تبھی ممکن ہے کہ جب شاعر کا مشاہدہ عمیق اور لفظوں پر اسے دسترس ہی نہیں بلکہ حکومت حاصل ہو۔ مذکورہ بالا بند میں غزل کی نازکی، قصیدے کی شوکت، مشاہدے کی دولت، دریا کی سبک وتند روانی کا احساس دبیرؔ کے شعری نظام کو جادو بیانی کا خلعت عطا کرتی ہے۔ اس طرح تلوار کی تعریف میں بھی تشبیہ واستعارہ سلاست وروانی کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ بند۔

چھل بل تھی چھلاوہ تھی طلسمات تھی اسرار چالاک ، سبکبار ، طرحدار ، نمودار
نیزہ کہیں خنجر تھی کہیں اور کہیں تلوار بجلی تھی کہیں جادو کہیں نور کہیں نار
سیماب تھی ، سیلاب تھی ، طوفان تھی ، ہوا تھی شعلہ تھی ، شرارہ تھی ، قیامت تھی ، بلا تھی

دبیرؔ نے تلوار کو تمثیلی خوبیوں سے بھی مزّین کیا ہے۔ جو نازک اندام بھی ہے اور شعری جمالیات کا جوہر بھی ساتھ ہی ساتھ خود کلامی کے عنصر سے بھی آشنا ہے اور جیتی جاگتی تصویر بھی پیش کرتی ہے۔ ان کی تلوار غضب ناک بھی ہے اور حیرت ناک بھی جس میں حس بھی پائی جاتی ہے جو دبیرؔ کی قوتِ متخیلہ کا استعارہ بھی ہے۔ یہ بند پیش ہیں۔

شاخ نیام سے ہوا جس طرح پھل جدا پیروں کے قد سے جیسے جوانی کا بل جدا
ہستی جدا زمین پہ تڑپی اجل جدا خنجر جدا فلک پہ گرا اور زحل جدا
غل تھا کہ اب مصالحتِ جسم و جاں نہیں لو تیغِ برق دم کا قدم درمیاں نہیں

کاٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو پاؤں میں کج روی کو سروں میں غرور کو
سینے میں بغض و کینے کو دل میں فتور کو نیّت میں معصیت کو طبیعت میں زور کو
ذات اک طرف مٹا دیا بالکل صفات کو کیسی زبان ، زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو

نیزے تنے تو اس نے کہا دیکھے بھالے ہیں بچتی نہ خنجروں سے کہ گودی کے پالے ہیں
برسے جو تیر سمجھا کمانوں کے نالے ہیں چمکے جو گرز بولی یہ منھ کے نوالے ہیں
ننگ اپنا جان کر نہ کسی سے بگڑتی تھی ہر پھر کہ آپ اپنی طبیعت سے لڑتی تھی

گویا دبیرؔ تلوار کو ہی زبان نہیں عطا کر رہے تھے بلکہ اردو شعر وادب کو بھی زبان عطا کر رہے ہیں۔ مرثیوں کو زندگی کے مظاہرے سے بھر دینے کا ہنر دبیرؔ کو آتا تھا۔ چونکہ کربلا رزمیہ میں جنگ وجدل کے موضوعات پر مبنی ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی اس لیے مرثیہ نگار نے تلوار

سے صرف جنگ کا کام نہیں لیا ہے دبیرؔ کی تلوار اصلاح اور اخلاق کا بھی درس دیتی ہے اور حق و باطل کے درمیان حدِ فاصل بھی قائم کرتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب شاعر اخلاقی اعتبار سے خود بلند مدارج پر فائز ہو اور اپنے شعری نظام کو لفظوں کی حدود سے شعور و فن کی بلند منزلوں تک لے جانے کے ہنر سے بھی آشنا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا دبیرؔ نے اردو زبان کو ناسخؔ کے بعد بھی نئے قالب میں ڈھال کے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ دبیرؔ کے مراثی کا ایک پہلو المیہ کا بیان ہے جس میں دبیرؔ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں وہ مکالموں کے ذریعہ نفسیاتِ انسانی کو مہمیز کر کے جذبات کو مبکی بیان سے اس طرح ابھارتے ہیں کہ ہر لفظ نشتر کا اثر رکھتا ہے۔ اور بے اختیار سننے والوں کی آنکھیں رونے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

شہادتِ امام حسینؑ کے بعد جب ذوالجناح امامؑ کی شہادت کی خبر خیمہ گاہ میں لاتا ہے تو اہلِ حرم میں ایک کہرام برپا ہو جاتا ہے سب اہلِ حرم نالہ وشیوں میں مشغول ہو جاتی ہیں اس وقت دبیرؔ نے امام حسینؑ کی چار سال کی بچی سکینہؑ کے ذریعے بین کے جو کلمات ادا کرائے ہیں وہ نفسیاتِ انسانی پر نشتر بن کر اثر انداز ہوتے ہیں۔ صرف ایک بند پیش ہے جبکہ دبیرؔ کے یہاں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔

اب دمبدم گلے سے لگائے گا ہائے کون — بچپن کے میرے ناز اُٹھائے گا ہائے کون
کہہ کے سکینہؑ جان بُلائے گا ہائے کون — روٹھوں گی کس سے ، اور منائے گا ہائے کون
غربت میں جان دی میرے بابا امامؑ نے — میں غم نصیب مر نہ گئی ان کے سامنے

دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کا ایک اور پہلو ایسا ہے جو دوسرے مرثیہ نگاروں سے دبیرؔ کو الگ کرتا ہے اور وہ ہے مرثیہ نگاری میں خاندانِ بنی ہاشم کے علاوہ دوسرے شہدا کا مرثیہ پیش کرنا ہے کیونکہ دبیرؔ سے پہلے ان کے استاد ضمیرؔ کے علاوہ اس جناب کسی دوسرے مرثیہ نگار نے توجہ نہیں دی ہے لیکن دبیرؔ نے جنابِ حرؔ جناب حبیبؑ ابنِ مظاہر اور جناب زہیرؑ بن قین کے حال کے مرثیے بھی تصنیف کیئے ہیں۔ دبیرؔ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مرثیوں کے بیچ میں بھی مطلع نظم کر دیتے ہیں جس سے جو مرثیہ جب چاہے وہاں روک دے یا بیچ سے ابتدا کرنا ہو تو کر لے۔

دبیرؔ نے ہی جناب وہبؑ کلبی کے حال کا مرثیہ بھی نظم کیا ہے۔ تحقیقی کتابوں میں ان کے چھ ہزار مرثیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے لیکن اتنے مرثیہ فقط ایک قیاس ہیں اور اگر حقیقت میں اتنے مرثیے نظم کیے تھے تو یا تو بہت کچھ تلف ہو گئے یا سامنے نہیں آئے لیکن ان کے پوتے محمد طاہر رفیعؔ صاحب یا دفترِ ماتم میں شائع اُن کے مراثی اور لکھنؤ میں مرثیوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں منہمک جناب محمد رشید صاحب یا امیر علی جونپوری کے پاس محفوظ بھی مراثی کو یکجا کیا جائے تو تقریباً ایک ہزار مراثی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ صحیح تعداد اُن کے مراثی کی معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ انھوں نے ایک مثنوی ''احسن القصص'' کے عنوان سے بھی لکھی تھی اس کے علاوہ نثر میں ''معجزاتِ امیر المومنینؑ'' اور ''ابواب المصائب'' کے عنوان سے بھی کتاب کا ذکر ملتا ہے۔ بہر حال دبیرؔ پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ اردو شعر و سخن کا یہ مثل شاعر حقیقی معنوں میں پہچانا جائے اور شعر و ادب کے فروغ میں ان کی خدمات کا اعتراف صاحبانِ ذوق کا کے سامنے آ سکے۔ مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اُن کے مرثیے زبان و بیان اور فن کے اعتبار سے ہمیشہ صف اوّل کی شاعری میں شمار کیئے جائیں گے۔

❁❁❁❁

دبیرؔ کے مرثیوں کے بعض نمایاں پہلو

پروین زاہد

الفاظ کسی فنکار کے لئے ویسے ہی اہمیت رکھتے ہیں جیسے کمہار کے لئے ''مٹی'' جیسے وہ کسی بھی سانچے میں ڈھال سکتا ہے، ویسے ہی ایک فنکار الفاظ کو اپنے تخیل کی فضا میں استعمال کر کے ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو فطرت کے کافی قریب معلوم ہو، اندازِ بیاں جتنا زیادہ موثر ہوگا یہ تصویر اتنی زیادہ خوبصورت بن کر تیار ہوگی۔ اندازِ بیان کی یہی تاثیر جب حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو وہ کمال پر پہنچ جاتی ہے اور اپنے بیان کرنے والے کو ایک عظیم شاعر بنا دیتی ہے۔ آج ہم اس مضمون میں ایک ایسے ہی قادرالکلام شاعر دبیرؔ کے مرثیوں کے بعض اپنے پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے جو تاریک پڑے ہوئے ہیں۔

دبیرؔ کی زبان اور ان کا اندازِ بیان پرشکوہ اور باوقار ہے ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ اس اندازِ بیان کا حامل ہے اس کی وجہ اس وقت کی ادبی اور تہذیبی فضا ہے جس میں وہ شاعری کر رہے تھے اس کے متعلق ''اردو مرثیے کا ارتقاء'' میں خود ڈاکٹر مسیح الزماں رقم طراز ہیں:

''مشکل پسندی اور اظہارِ کمال کی کوشش نے لفظی مرصع کاوشوں اور معنوی پیچیدگیوں کی طرف شعراء کو راغب کیا تھا جس کی وجہ سے علم بدیع کی ترتیب ہوئی تھی دبیرؔ بھی چونکہ اس عالمانہ رنگ میں اپنے کو ممتاز کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے مرثیوں میں اسی صنعت گریوں سے کام لیا ہے جس سے ان کے قدرتِ کلام کا قائل ہونا پڑتا ہے''۔ (ص ۳۹۱)

جہاں تک دبیرؔ کے مرثیوں میں حُسنِ کلام کا تعلق ہے یہ بات قابل غور ہے کہ مضمون آفرینی اور خیال آفرینی ان کے مرثیوں کی جان ہے اس کے علاوہ نازک خیالی، صنائع لفظی و معنوی کے استعمال پر ان کی قدرت ان کے مرثیوں کا خاص وصف ہے۔ وہ اپنے مرثیوں میں لفظی و معنوی صنعتوں سے اس طرح کام لیتے ہیں کہ ان کی علمیت اور نکتہ رسی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بند ملاحظہ ہو:

ایمان کی سند ہے محبت حسینؑ کی — مثلِ نماز فرض ہے طاعت حسینؑ کی
ہفتادہ حج ہیں ایک زیارت حسینؑ کی — واجب ہے کائنات میں بیعت حسینؑ کی
دنیا و دین کا بیعتِ مولا سے چین ہے — ایمان زیبِ دستِ جنابِ حسینؑ ہے

مندرجہ بالا بند میں صنعتِ مرعاۃ النظیر بھی ہے اور صنعتِ تکرار بھی ہے اور مرزا دبیرؔ نے ان دونوں صنعتوں کو بڑے عالمانہ درس اور ماہرانہ فنکاری سے نبھایا ہے لفظ ''حسین'' شروع کے چاروں مصرعوں میں آیا ہے اور ہر بار ایک انوکھی شان کے ساتھ آیا ہے۔ چوتھے اور پانچویں مصرعے میں لفظ ''بیعت'' بھی دو بار آیا ہے اس کے علاوہ محبت، طاعت، زیارت اور بیعت جو نہ صرف قافیہ کے طور پر اس بند میں استعمال ہوئے ہیں بلکہ ایک خاص فضا بھی تعمیر کرتے ہیں۔ مرعاۃ النظیر میں لفظ ''ایمان، محبت، حسینؑ، نماز، طاعت، حسینؑ، ہفتاد حج،

زیارت، واجب، بیعت یہ سبھی الفاظ ایمان اور پھر حضرت امام حسینؑ کی مناسبت سے ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھتے ہیں۔ان الفاظ کا ماخوذ امام حسینؑ کی ذات پاک ہے۔اتنی صفائی، شفافیت کے ساتھ الفاظ کا انتخاب ہمیں دبیرؔ کے مرثیوں میں خوب نظر آتا ہے۔ بند ملاحظہ ہو:

دستِ خدا کا قوتِ بازو حسینؑ ہے — بے شک حسنؑ کا زینتِ پہلو حسینؑ ہے
خیرُ الورا کا یوسفِؑ خوش رو حسینؑ ہے — باغِ جناں کے پھولوں کی خوشبو حسینؑ ہے
ایمان اس کی جان یہ ایماں کی جان ہے — قرآن دہن ہے اور یہ گویا زبان ہے

امام حسینؑ کی عظمت کو سمجھانے کے لیے انہوں نے الفاظ کو بدل بدل کر کئی بندوں میں اسی مضمون کو ہر بار نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین ان کی مضمون آفرینی کے متعلق فرماتے ہیں:

''ان کا کلام علمی زبان اور مضمون آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہے چنانچہ مضمون آفرینی اس پہلے بند سے ہی ملاحظہ کی جاسکتی ہے وہ لفظی و معنوی صنعتوں سے ایک پر کیف فضا تیار کرتے ہیں وہ یہ بھی دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک مضمون کو کتنی علمیت اور نکتہ رس سے ادا کیا جاسکتا ہے''۔

مثال ملاحظہ ہو:

جب ماہ نے نوافلِ شب کو ادا کیا — سر قبلہ رو جھکا دیا ذکرِ خدا کیا
بڑھ کر صفِ نجوم نے بھی اقتدا کیا — سجدے میں شکرِ خالقِ ارض و سما کیا
در کھل گئے عبادتِ ربِّ غفور کے — خورشید نے وضو کیا چشمے سے نور کے

نوافل، شب کے بالکل آخری حصے میں ادا کی جاتی ہے جو صبح کے ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ چاند کا ذکر حق کے سر قبلہ رو جھکانا عبادت کے اس ماحول کو ظاہر کرت اہے جو سورج کے نمودار ہونے کے پہلے پیدا ہوتا ہے۔اس میں ایک رعایت یہ ہے کہ قبلہ مغرب میں ہے اور چاند کا مغرب کی طرف جھکنا اس کے غروب ہونے اور صبح کے نمودار ہونے کا اشارہ ہے۔ دبیرؔ اس بند کے دوسرے مصرعوں میں نماز کے دیگر لوازمات کا ذکر کرتے ہیں۔نماز جب جماعت میں ادا ہوتی ہے تو اس میں ایک امام کا ہونا لازمی ہے۔ چونکہ اس نماز کا امام چاند ہے تو صفِ نجوم نے بھی اقتدا کیا اور سب مل کر خالقِ ارض وسما کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔نماز کے لوازمات میں سب سے لازمی جز وضو ہے۔ وضو کے لیے انہوں نے بیت کا اہتمام کیا ہے سب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نماز کے لیے وضو ضروری ہے جتنا اہم مرثیے کے لیے ہیئت کا شعر ہے:

در کھل گئے عبادت ربِّ غفور کے
خورشید نے وضو کیا چشمے سے نور کے

دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔

بڑھ کر نقیبِ نو پکارا سحر سحر — کی آسمان سے بارشِ رحمت شجر شجر
لوٹا سحر نے ماتمِ شبنم گہر گہر — ذرّوں میں نورِ مہر بھر آیا قمر قمر

برقع جو اٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا پردہ تھا صاف صبح ملمع نقاب کا

اس بند میں صبح پوری طرح نمودار ہو چکی ہے لیکن یہ صبح دھیرے دھیرے جس طرح نمودار ہوتی ہے اس کو دبیرؔ نے نہایت کمال کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کس طرح سورج کی روشنی درختوں تک آتی ہے پھر رات بھر گرنے والی ''شبنم'' کو خشک کرتی ہے۔ اس کے بعد ذرّے چمکنے لگتے ہیں۔ اس طرح ''صبح ملمع نقاب کا پردہ'' چاک ہوتا ہے۔ اوپر کے چاروں مصرعوں میں ''ز'' کی تکرار سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے ''نقیبِ نور'' اور ''صبح ملمع نقاب'' جیسی خوش آہنگ ترکیبوں نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ۲۰ بار ''ز'' کی تکرار سے پورے بند میں ایک صوتی آہنگ پیدا ہو گیا۔ دونوں ہی بند فصاحت و بلاغت کی بہترین مثال ہیں:

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب خورشید کے نشان نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب تانی نہ پھر شعاعِ قمر زسنانِ شب
آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے شب نے سپر ستاروں کی رکھ دی اتار کے

صبح کے نمودار ہونے کا یہ انداز جو دبیرؔ نے مندرجہ بالا مرثیے میں بیان کیا ہے اسی انفرادیت کا حامل ہے۔ صبح کے مضمون کو دبیرؔ نے یہاں ایک نئے رخ سے بیان کیا ہے۔ وہ جب کسی مضمون کو بیان کرتے ہیں تو ہر بار نئے استعارت، نئی تراکیب کے ساتھ بیان میں وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اس سے متعلق تلازمات مہیا کرتے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں ''نشان'' لفظ دو بار آیا ہے ایک بار سورج کے لیے اور دوسری بار شب کے لیے یعنی نشانِ خورشید نے نشانِ شب کو مٹا دیا ہے۔ اس بند کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں دبیرؔ نے صبح کے منظر کو بیان کرنے کے لئے جنگ کے تلازمات کا استعمال کیا ہے۔ علم، نشان، تیر، کمان، سنان، سپر، زیورِ جنگی جیسی رعایتوں کا استعمال ہمیں اس بند میں دیکھنے کو ملتا، قدرتی طور پر دبیرؔ کے مرثیوں میں ہمیں لکھنؤ کا خاص رنگ جس میں تشبیہات اور استعارات کی فراوانی، صنائع و بدائع کا اہتمام اور ادبی روایات کا تحفظ نظر آتا ہے۔ ان کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے ناسخؔ، آتشؔ اور غالبؔ جیسے بڑے شاعروں نے بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ بقول افضل حسین ثابتؔ:

''مرزا دبیرؔ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے کلام سخن کے سہارے مرثیہ گو کو اول درجے کا شاعر اور مرثیہ گوئی کو ادب عالیہ کا جزو تسلیم کر لیا۔ آتشؔ ناسخؔ اور غالبؔ کے سے اساتذہ نے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے''۔

اقتباس سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ دبیرؔ کے نزدیک شاعری کا ایک بڑا مقصد زبان اور علم و فن کا مظاہرہ کرنا ہے۔ لفظی و معنوی صنعتوں کو وہ اپنے بیان میں اس طرح پرو دیتے ہیں جیسے تسبیح میں موتی کے دانے ہوتے ہیں وہ جب کسی مضمون کو بیان کرتے ہیں تو اصلیت محض ایک بنیاد کا کام کرتی ان کے کلام کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مضمون کو کتنی علمیت اور نکتہ رسی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے، اور اس میں کتنی تشبیہیں اور صنعتیں کام میں لائی جا سکتی ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے بعض عربی و فارسی اور اردو شعراء کے مضامین کو بھی انہوں نے اپنے مرثیوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

شاعری میں الفاظ کی بڑی اہمیت ہے الفاظ کا ہمارے خیال کو دوسروں تک ہی نہیں پہنچاتے بلکہ ہمارے احساسات کو بھی دوسروں تک

پہنچانے کا کام آتے ہیں۔ دبیرؔ ان چند شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہیں زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ وہ موقع و محل کے مغلق زبان و بیان کے استعمال کا ہنر جانتے تھے۔ انہوں نے خود اس بارے میں کہا ہے:

ہے رزم سراپا تو زبان اور ہی ہے — اور بین کے مابین بیان اور ہی ہے
کس درجہ بلند ہے تیرے فکر دبیرؔ — کتنی ہے زمیں آسماں اور ہی ہے

دبیرؔ نے اپنے مخصوص زبان بیان کے ذریعہ اردو مرثیے کو وسعت بخشی ساتھ ہی زبان کے ذخیرۂ الفاظ اور سرمایہ ادب میں بھی اضافہ کیا۔ طرز ادا کی سب سے اہم کڑی فصاحت و بلاغت ہے جس کے متعلق شبلیؔ نعمانی رقم طراز ہیں:

''مرزا دبیرؔ کے کلام کو فصاحت چھو بھی نہیں گئی اور ان کا کلام بلاغت سے عاری ہے یا مرزا صاحب بلاغت کی راہوں سے کس قدر ناآشنا ہیں''۔

شبلیؔ کے اس دعوے کے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ دبیرؔ کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ شرط یہ ہے کہ توجہ کے ساتھ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور غیر جانب داری کے ساتھ فیصلہ کیا جائے۔ دبیرؔ کے کلام سے فصاحت و بلاغت کی کچھ مثالیں ہم یہاں پیش کریں گے۔ ملاحظہ ہو:

فوج اس کے پاس بھی ہے پہ فوجِ خدا کہاں — صاحب علم ہزار پہ عباسؑ سا کہاں
بیٹے بہت پہ اکبرِؑ گل گوں قبا کہاں — لاکھوں میں ایک ثانیٔ خیرؑ الورا کہاں
بھائی یزید کا کوئی مثلِ حسنؑ بھی ہے — زینبؑ سی عابدہ کوئی اس کی بہن بھی ہے

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِؑ مصطفیٰؐ — لے تو چلا ہوں فوجِ شمر سے کہوں گا کیا
نے مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا — منّت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو میری — پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو میری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کور ائے ہیں — اصغرؑ تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر — رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر — سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے — تھرّا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

مندرجہ بالا چاروں بند دبیرؔ کے بیان میں فصاحت و بلاغت کی بہترین مثالیں ہیں جو ایک طرف تو شاعری فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں

اور دوسری طرف ایک والد کی محبت اور غیرت کا فطری نقشہ بھی کھینچ دیتے ہیں۔ امام حسینؑ کے کردار میں دبیرؔ نے یہاں دو طرح کے جذبات کو بیان کیا ہے ایک تو بادشاہ دین ہیں جس نے ہمیشہ دوسروں کی حاجت روائی کی ہو وہ امام حسینؑ پہلی بار کسی سے کچھ طلب کرنے جا رہے ہیں اس کی وجہ ان کی اپنے بیٹے سے محبت ہے۔ وہ بادشاہ دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک والد بھی ہیں ان دونوں جذبوں باہمی کش مکش کو دبیرؔ نے کس قدر خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ بہترین مثال ممکن ہی نہیں

نے مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا پھیری زباں لبوں پہ جو اس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

اس منظر کو پُر درد اور تاثیر آمیز بنانے کے لیے دبیرؔ نے ایک والد کی کیفیت کو نہایت حقیقی پیرائے میں پیش کیا ہے کہ اس طرح ایک والد اپنے بچے کو پیاسہ دیکھ کر تھرا جاتا ہے اور سوئے آسمان دیکھتا ہے۔

زبان اور طرز ادا کی دوسری اہم کڑی صنایع و بدائع کا انتظام ہے دبیرؔ کی پوری کوشش رہتی ہے کہ وہ شعر کے حسن کو علم بدیع کے زیور سے آراستہ کر کے اس طرح پیش کریں کہ زیادہ سے زیادہ کشش پیدا ہو گئی ہے۔ دبیرؔ نے حسین کے بناؤ سنگھار میں بڑی محنت صرف کی ہے۔ ان کی اسی محنت کی وجہ سے ان کے کلام میں چار چاند لگ گئے ہیں ان کے کلام کے ایک بڑے حصے نے جو لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا ہے اس میں صنائع و بدائع کی دل فریبیوں کا بڑا دخل ہے۔ انہوں نے اس میں اپنی جدت طبع اور تخیل کی بلند پروازیوں کے ذریعہ اتنی بلندی پر پہنچا دیا جس سے آگے بڑھنا مشکل نظر آتا ہے۔ وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے خاص طور سے علم بدائع کی طرف توجہ مبذول کی اور اپنے مرثیے کے ذریعہ علم بدیع اردو میں منتقل کر دیا۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ صنائع و بدائع کو اپنے کلام میں اتنی فیاضی سے بیان کرنے کے باوجود ان کے کلام میں خشکی، آورد اور ابہام پیدا نہیں ہوتا، بلکہ مضمون کچھ دل کش اور دل نشیں ہو جاتا ہے۔ حسن تعلیل کی مثال ملاحظہ ہو:

ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام بالکل اُلٹ دیئے تھے حبابوں نے اپنے جام

مراعاۃ النظیر کی مثال دیکھئے:

کفنا چکے مَلَک شہِؑ عالی جناب کو مٹی دو آن کر خلفِ بوترابؑ کو

ایہام

ثابت ہے کہ سیارہ ہر ایک ماند ہوا ہے سیارے ہیں کیا ، شہرِ بدر چاند ہوا ہے

لفّ ونشر

نے چرخ ہے نے دشت نہ کہنا نہ قلزم وہ سکتہ ہے وہ گرد ، وہ رعشہ وہ تلاطم

دبیرؔ کا عالمانہ رنگ، لفظی مرصع کاری اور علم بدیع سے ان کی رغبت کو ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے اس کے متعلق ''المیز ان'' میں جناب نظیر الحسن فوق فرماتے ہیں:

''مرزا دبیرؔ نے صنائع و بدائع میں عجیب و غریب کمالات دکھائے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ذہن کی بلند پروازی اور خیالات کی رفعت

قابلِ تعریف سمجھی جاتی ہے۔ان کے نفیس کلام نے جونکتہ سنجان سخن کے دلوں کو تسخیر کرلیا ہے، اس میں بہت سا حصہ صنائع و بدائع کی دل فریبیوں کا ہے مگران پاکیزہ نکات کی قدر صرف اہل مذاق ہی کر سکتے ہیں''۔(المیز ان،ص ۱۶۵)

اس کے علاوہ دبیرؔ کے یہاں واقعہ نگاری کی بھی عمدہ مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ واقعہ نگاری مرثیے کا ایک لازمی جزو ہے۔ اردو مراثی میں مرثیہ نگاری کسی ایک مرثیے میں کربلا کے تمام واقعات کو پیش نہیں کرتا بلکہ ایک مرثیے میں کسی ایک واقعہ یا حالت کو ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔جس میں عام انسانی معاشرے کے بہت سے مواقع نظر آتے ہیں۔مثلاً عزیز واقربا سے جدائی، بیمار ہونا،سفر پر روانہ ہونا،شہادت یا جنگ کے واقعات، اہلِ بیتؑ کا اسیر ہونا،قید خانے میں اسیر کیا جانا وغیرہ کے واقعات تفصیل سے دبیرؔ کے یہاں ایسے مراثی اپنے تمام تر جگر خراش مناظر کے ساتھ ملتے ہیں۔خاص طور سے دبیرؔ کے یہاں ''شام'' کے حوالے سے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔واقعاتِ شام اہلِ حرم کے مسائل کا دل خراش،جگر سوز اور نہایت دردانگیز بیان ہمیں دبیرؔ کے یہاں نظر آتا ہے۔ان واقعات کو دبیرؔ نے نہایت پرتاثیر انداز میں بیان کیا ہے۔انہوں نے اہل حرم کی اسیری کے دور کے جو دل گداز اور جگر خراش واقعات بیان کیے ہیں ان کا جواب نہیں ہے۔اپنے انداز و بیان سے جو دردانگیز فضا کی تعمیر کی ہے اس سے ہر حال ہر کیفیت کی پر درد تصویر حقیقت سے بن کے آنکھوں کے سامنے آنے لگتی ہے۔یہ کردار اوران کے واقعات محض کاغذ پر ہی رہ جاتے بلکہ ان کے درد وغم کے آثار ہمارے دلوں پر بھی طاری ہونے لگتے ہیں اور ہم چشم وزند میں دبیرؔ کی بنائی ہوئی اس دنیا میں داخل ہوجاتے ہیں۔مثلاً ملاحظہ ہو:

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے — دخترِ فاطمہؑ غیرت سے موئی جاتی ہے
روح قالب میں وہ زندان میں گھبراتی ہے — بے حواسی میں ہر ایک بار یہ چلّاتی ہے
آسماں دور زمیں سخت کدھر جاؤں میں — بیبیوں مل کے دعا مانگو کہ مرجاؤں میں

قیدخانے کے علاوہ جو واقعہ مرثیہ نگاروں کے یہاں خاص موضوع رہا ہے وہ جناب باتوؔ کی کنیز شیریں کا واقعہ ہے۔

زبان و بیان اور اسلوب کوئی الگ حیثیت نہیں رکھتا موضوع اور خیال کی مناسبت سے ہی سامنے آتے ہیں لیکن ادب کی اس باریکی کو بہت کم لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں اس ناسمجھی نے ہی ایک طویل عرصے تک دبیرؔ کے ساتھ انصاف نہیں ہونے دیا لیکن جب ادبی شعور منظر عام پر آنے لگا تو ادب کی دنیا میں بھی شخصیت کی فرقہ پرسیت کے خلاف بے داری پیدا ہونے لگی اس نے ایک ایسا ادبی ماحول پیدا کر دیا جس سے دبیرؔ کی ادبی اہمیت بھی اجاگر ہونے لگے۔دبیرؔ کے مراثی میں جس طرح فصاحت و بلاغت کے متعلق کہا گیا اسی طرح روانی کے لئے اعتراض ہوا ہے ان کی روانی میں خلل آجاتا ہے۔دبیرؔ کے مرثیے سے یہ مثال ملاحظہ ہو جو ان کے کلام میں روانی کا زندہ و جاوید ثبوت فراہم کرے گا۔

نقّاش و نقش ، کاتبِ خط بانی و بنا — بود و نمود ذات صفت ہستی و فنا
آدم ملک ، زمین فلک ، گرد کیمیا — دنیا و دیں حدوس قدم بندو خدا
شاہد ہیں سب کہ صاحبِ اعجاز ہیں حسینؑ — جاں آفریں کہ عاشقِ جاں باز ہیں حسینؑ

مندرجہ بالا بند میں کئی مصرع میں بھی روانی میں کہیں خلل نہیں آتا بلکہ ہر لفظ اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔دبیرؔ کے یہاں الفاظ مرثیے کی عمارت میں اس اینٹ کی طرح پیوست ہیں کہ جس کو بیچ سے نکالنے پر پوری عمارت ڈھیر ہوسکتی ہے۔کہتے ہیں کہ بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زبان سے جو الفاظ نکل جائے وہ محاروے کی شکل اختیار کرلے مثال ملاحظہ ہو:

ہیں وقت تمہید میرے الفاظ و معانی یاں قلزم شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر گھر میں ہے بحرِ طبیعت کی روانی ہے زورِ سخن شور پہ موجوں کی زبانی
قطرے سے مگر بحث میں میں صرف بنی ہوں دریا ہوں سخن کا میں تو اب طرف بنی ہوں

''بحث میں صرف'' ہونا دبیرؔ کے استعمال کرنے سے پہلے کوئی محاورہ نہیں تھا لیکن دبیرؔ نے اپنے کلام میں استعمال کر کے اسے محاورے کی سند دلا دی ہے۔ اسی طرح دبیرؔ نے مرثیوں میں کئی اہم اضافے بھی کئے ہیں۔ جیسے بعض مقامات پر انہوں نے تلمیح سے استعارے کا کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر بند دیکھیے:

یوسفؑ دہانِ ماہیِ شب میں نہاں ہوا کنعانِ بام صبح سے یوسفؑ عیاں ہوا
لیلائے شب کے حسن کا گلشن خزاں ہوا عالم تپِ فراق سے گرمِ فغاں ہوا
مجنوں کے رنگ رخ کی طرح دھوپ زرد تھی تھی صبح تا زمانے کی اک آہ سرد تھی

اس بند میں دبیرؔ نے جناب یونسؑ کو ماہتاب اور جناب یوسف کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس بند کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ دبیرؔ نے صبح کے مضامین کو اس بند میں مکمل کر دیا ہے یعنی آفتاب اپنی آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہے دھوپ سب طرف پھیل چکی ہے دبیرؔ صبحِ کاذب سے صبحِ صادق کی طرف بڑھتے ہیں۔

دبیرؔ کے مرثیوں کا ایک بڑا حصہ بین کا ہے جو درد و اثر میں اپنی مثال خود ہے۔ اس حصے میں دبیرؔ نے بھائی بہن کی محبت، ماں بیٹے کی محبت، بھائی کی بھائی سے محبت، باپ کی بیٹے سے محبت وغیرہ ہر طرح کے جذبات کو پوری شدّت کے ساتھ حقیقت کے جامے میں ڈھالا ہے جناب علی اکبرؑ کی شہادت پر ان کی ماں جناب بانوؑ کے یہ بین ملاحظہ ہوں:

کسی کی بن کے نہ اک بار یوں بگڑ جائے بسی بسائی نہ بستی کوئی اجڑ جائے
کسی کی کوکھ پہ آفت نہ ایسی پڑ جائے غضب ہے شیر جواں بانوؑ سے بچھڑ جائے
قضا نے ہاتھ کلیجے پہ میرے ڈالا ہے کسی نے سینے سے میرا جگر نکالا ہے

اس بند کو دیکھیے ایک بیٹے کی میّت کی خبر سن کر ایک ماں کے دل پہ کیا بیتتی ہے۔ اس کی اس بند سے اچھی تصویر کشی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستانی تہذیب میں بیٹے کو ماں اپنے ''کلیجے کا ٹکڑا'' مانتی ہے۔ اولاد کی شہادت پر ''سینے سے جگر نکالنے'' کا محاورہ استعمال کیا ہے جو ایک ماں کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ دبیرؔ نے بین میں جو اندازِ بیان استعمال کرتا ہے وہ پڑھنے والوں کے نہ صرف ذہن پہ بلکہ دلوں پر بھی اپنی تاثیر چھوڑ دیتا ہے۔ بین کے حوالے سے دبیرؔ ایک ایسی فضا کی تعمیر کرتے ہیں جو غم آلود ہوتی ہے جس میں بیبیوں کی آہ و بکا اور احباب کی شہادت پر جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت غم انگیز فضا میں لے جاتا ہے جس سے پڑھنے والا بھی اپنے دل پہ اسی اثر کو محسوس کرتا ہے۔ دبیرؔ کو اپنے فن کے متعلق خود بھی علم تھا چنانچہ فرماتے ہیں:

بے مثل مرثیے کہے احوالِ ہند کے تیرا جواب ہے نہ عرب میں نہ ہند میں

ایڈیٹر کے نام خط

برادرم اصغر مہدی اشعر، سلامِ مسنون۔ ''فروغِ مرثیہ'' کے تمام شماروں کے قاری کی حیثیت سے میرا پہلا خط ہے اور اس خط کا محرک آپ کا انیسؔ نمبر ہوا ہے۔ سب سے پہلے اس کامیاب نمبر کی اشاعت آپ کو اور اردو مرثیے کے تمام عاشقوں کو بہت بہت مبارک ہو۔ انیسؔ پر آج تک جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے پیشِ نظر خیال آتا ہے کہ شاید اس موضوع پر نئے نکات نکالنا بہت مشکل ہوگا۔ اس کے باوجود اس شمارے میں بہت دلچسپ اور مفید مضامین پڑھنے کو ملے۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ علمی مضامین بھی بوجھل نہیں شگفتہ تھے۔ تقریباً سبھی مضامین خوب ہیں مگر جناب جاوید حسن، جناب تمثال مسعود، جناب شہاب کاظمی اور جناب زائر حُسین ثالثی کے مضامین بہت جاذب تھے۔ پروفیسر سید علی عرفان اور صفدرؔ ہمدانی صاحب کے مضامین بھی بے حد دلچسپ ہیں جو ایک علمی عارضے میں مبتلا خطیب کے بیان کے ردِّ عمل کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ آخر میں ''خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سُن لے'' کے مصداق ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ''فروغِ مرثیہ'' جیسے معیاری رسالے میں کتابت کی غلطیاں بہت کھلتی ہیں۔ مشورتاً عرض کرتا ہوں کہ مضامین کو کتابت کے بعد اشاعت سے پہلے ان کے متعلقہ مولفین کے پاس پروف ریڈنگ کے لیے بھیج دیا جائے۔ آپ کے خوبصورت میر انیسؔ نمبر کے بعد ''مرزا دبیرؔ نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے اور اس نمبر کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

نیاز کیش
علی عرفان

مکرمی و محترمی۔
اصغر مہدی اشعر صاحب
آداب و نیاز

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ سہ ماہی فروغ مرثیہ، کینیڈا کے ''مرزا دبیرؔ نمبر'' کے لیے ایک غیر مطبوعہ مقالہ ''دبیرؔ کے مرثیوں میں میدان جنگ کی منظر نگاری'' ارسال کر رہا ہوں۔ امید کہ شرف اشاعت سے سرفراز کر کے شکریہ کا موقع عنایت کریں گے۔

خلوص کیش
پروفیسر شبیب نجمیؔ (انڈیا)